DUE DATE

Cl. No *Acc. No.*

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

مرتبہ

وحید احمد

قسم اول

قیمت سالانہ { قسم اول للعہ فی پرچہ ۸ر
قسم دوم ہے نمونہ ۲

مقام اشاعت بدایوں

جلد ۲ اگست ۱۹۱۹ء نمبر ۱

حافظ جی

از

"جان بل"

عام طور پر حافظِ قران کو ہمارے جنت نشان ملک میں محض "حافجی" کے پیارے لقب سے یاد کیا جاتا ہے! اگر آپ محض حافظ کا خطاب استعمال کریں تو یقیناً ۹۹ فی صدی تعلیم یافتہ سامعین کا ذہن خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل ہو جائے گا :-

دیوانِ حافظ کی شہرتِ لازوال نے خواجۂ شیراز کے نام سے ایران و توران در کنار ہندوستان و فرنگستان کے ہر حلقۂ علم دوست کا تعارف پوری طرح کرادیا ہے! ہندوستان ہمیشہ سے "ناز و انداز و کرشمہ" کی بدولت دلگیری و نظر فریبی میں تمام بقیہ ممالکِ عالم کا سرتاج رہا ہے: اسکندر کو اس نے کھینچ بلایا، فاتحان عرب کو اس نے دعوت دی، فرنگیوں کو اس نے گھسیٹ لیا، مختصر یہ کہ ہر تاجدارِ عالم سے لیکر نام آوران ادب تک کوئی ہستی ایسی نہ تھی جو ہندوستان کی نادیدہ معترف نہ رہی ہو! علی حزیں - عرفی - صائب - نظیری - اور بعض روایات کے بموجب سعدی بھی، اس کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا فخر رکھتے تھے: حال میں خواجہ حافظ شیرازی

نے بھی شہر لدھیانہ "ملک پنجاب" میں جنم لیا ہے! آپ تناسخ کے قائل ہوں یا نہ ہوں لیکن بدیہیات سے انکار کرنے کی جرأت آپ کو بھی مشکل سے ہو گی: مسیح موعود، کرشن جی، مرزا غالب، امرت دھارا، آب حیات، یسوع وغیرہ سب نے پنجاب ہی کے کسی حصہ میں جنم لیا اور کوئی وجہ نہیں کہ حافظ شیرازی بھی پنجاب ہی میں سے سر نہ نکالتے! سرزمین پنجاب واقعی بڑا مردم خیز خطہ ہے: ماشاء اللہ ... سرحد ایسی ولایت سے تعلق رکھتی ہے! تھوڑا عرصہ ہوا، رسالہ مخزن میں ایک صاحب "شیر پنجاب" کے لقب سے دلی اور لکھنؤ والوں پر مسلسل فتوے دے رہے تھے! انھوں نے اپنی معلومات وسیع کی بدولت شیر بن کر ثابت کیا تھا کہ دلی اور لکھنؤ کے تمام سخن دانِ نامور براہ راست یا بالواسطہ پنجابی تھے یا کم از کم "بہرہ اندوز صحبت پنجاب" تھے! مجھے اُن مضامین کے مطالعہ کا فخر حاصل ہے اور اب اُن کے حرف بہ حرف صحیح ہونے میں مجھے اس قدر بھی تامل نہیں جس قدر عوام الناس کو شرائط صلح کے تسلیم کرنے میں ہے۔ میرے معتقدات میں اس غیر معمولی انقلاب کا وجود محض اس "دیوانِ حافظ" کے مطالعہ سے ہوا جو حال ہی میں لدھیانہ سے شائع ہوا ہے!

اس نسخۂ لاجواب کے ہاتھ میں آتے ہی سرورق کی عبارت پڑھتا ہوں: "مشرح و منظوم ترجمہ۔ دیوان حافظ شیرازی بزبان اردو۔ حصہ اوّل۔ از رشحاتِ قلم عبداللہ خاں عسکری لدھیانوی۔ الحمدللہ لسان الغیب .... کی پہلی پچاس غزلیات کا مشرح و منظوم ترجمہ نہایت عرق ریزی اور محنت سے تیار ہوا۔ اور چودھری کرم بخش مالک دار الکتب نادرہ شہر لدھیانہ (پنجاب) نے بصرفِ کثیر .... کے اسلامیہ سٹیم پریس لاہور سکے دروازہ میں باہتمام مولوی منظور الدین پرنٹر شائع کرایا ...." جس جس لفظ کے بعد میں نے ڈیش لگایا ہے وہ دوسری سطر کو ظاہر کرتا ہے۔ اور جہاں نقطے دیئے ہیں وہاں طول طویل مضمون کا حذف کر دینا مقصود ہے! اس عبارتِ سرورق کے بعد کتابت و طباعت کی خوبیوں کا مزید اطمینان حاصل نظر آتا ہے! صفحہ ۱ پر "خیر خواہ عوام الناس"

... دی کرم بخش شہر لودھیانہ، ملک پنجاب "نے حافظ شیراز اور حافظ لدھیانہ کا تعارف ناظرین سے کرایا ہے! ساتھ ہی دعویٰ کیا ہے کہ یہ بہترین و مکمل نسخہ دیوان حافظ ہے! دو ترجمے منظوم کے" تحت میں، حافظ لدھیانہ نے صفحہ ۴ پر لکھا ہے کہ عربی و فارسی" دونوں محترم زبانیں کشیر المطلب ہونے کے علاوہ ... کے منتخب اور صاحب دل لوگوں کی زبانیں ہوئیں " یہ تو با دیوان حافظ کے مقبول ہونے کی ایک معقول وجہ ہے۔ مترجم صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں "یہ اس سمندر میں غوطہ زن ہونے کی یہاں مترجم کے باعث رہی"۔ مجھے اس اوّلیت کے دعوے میں تامل کرنے کی وجہ نہیں۔ ہاں اتنا مجھے یاد آتا ہے میں نے اسکول میں پڑھا تھا کہ ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم، پانچوں دریا اندھ سے ہم آغوش ہو کر اس سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہیں جو عرب و فارس سے کنارے رات دن چومتا رہتا ہے! پنجاب کا ہر خس و خاشاک ظاہر ہے۔ بہ آسانی بحیرۂ عرب و فارس میں سیدھے راستے غوطہ زن ہو سکتا ہے! رہا اوّلیت کا دعویٰ! اس میں بھی شک کی گنجائش نہیں: میں سنتا ہوں کہ خضاب لاجواب، آب حیات، بال اڑانے کا صابون، مردمی کے نسخے، اور کیڑے، اور خدا جانے کس کس اختراع و ایجاد کی اوّلیت کا سہرا پنجاب ہی کے سر رہا ہے!

اس نسخۂ لاثانی میں ہر شعر کے بعد لفظی ترجمہ، حل نکات، حقیقی ترجمہ اور حل فال درج کیا گیا ہے۔ لیکن ان سب کو غزل زبان اردو سے کوئی نسبت نہیں، جو ہر غزل کے اختتام پر بطور ترجمۂ منظوم لکھی گئی ہے! درحقیقت یہی وہ عرق ریزی ہے جس کی نظیر ابھی تک ہندوستان شمالی سے مفقود ہے! اس کو پڑھنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ خود حافظ ہی کی روح ہے جو نئے جنم میں اردو بول رہی ہے! ترجمے کا سہل الاصول طریقہ، عام فہم بندش، اظہار مطلب، نفاست، برمحل استعمال محاورہ، رنگین بیانی خوبیاں ہیں جن کی پوری پوری تعریف محدود جگہ میں ناممکن نظر آتی ہے! مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ

ہر قسم ... سے اشعار مترجم بہ لحاظ مشتے نمونہ از خروارے پیش کش ناظرین کر دیے
جاتے ہیں۔ ... میں قطعی طور پر سمجھتا ہوں کہ انتخابِ اشعار کو اس تالیف میں مطلق دخل نہیں
... اس کا ہر شعر سننے اور ہر ترجمہ داد دینے کے قابل ہے !

(۱) ترجمہ کرنے کا سہل ترین طریقہ :-

کے دہم دست اے غرض یارب کہ بہم شوند — خاطرِ مجموعِ ما، زلفِ پریشانِ شما (حافظ شیرازی)

ہوگی حاصل کب تمنا - ایک جا ہوں یا خدا — خاطرِ مجموعِ من، مارِ پریشاں آپ کا (حافظ لدھیانوی)

"خاطرِ مجموعِ ما" کا ترجمہ "خاطرِ مجموعِ من" سہل ترین طریقۂ ترجمہ ہے - اس اصول پر ترجمہ کرنے سے الفاظ بہت تھوڑی سی تبدیلی کے رہینِ منت ہوتے ہیں اور ترجمہ لفظی اتحاد کا صحیح قرار پاتا ہے ! اردو میں "ما" کے بجائے "من" کا استعمال بہترین معلوم ہوتا ہے اول تو اس وجہ سے کہ "ما" بجائے "ماں" کے مخفف طور پر بولا جاتا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ "ما" ناگری حروفِ تہجی کا پچیسواں حرف ہے اور اردو ہندی کا اختلاف نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا ہے ! میرے ایک عنایت فرما جو متانت کے لحاظ سے آسمانِ سنجیدگی کے بدرِ کامل ہیں فرماتے ہیں کہ اس خاص شعر میں "من" کا استعمال اس لیے بھی زیادہ پر لطف ہے کہ دوسرے حصہ میں "مار پریشان" آتا ہے اور سانپ کے لیے من کا ہونا ضروری ہے "مارِ پریشاں آپ کا" کس قدر فصیح و بلیغ ترجمہ ہے - مارِ پریشاں کو لفظِ قسامِ اژدرے وہی نسبت ہے جو عوام الناس سے زیر دفعہ تعزیراتِ ہند چالان ہونیوالوں کو ہے ! مارِ پریشاں اکثر آسٹریلیا میں "کونگرو" کی تھیلی سے برآمد ہوتا ہوا بھی پایا گیا ہے !

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنارِ آبِ رکناباد و گلگشتِ مصلّے را (حافظ شیرازی)

کنارِ آبِ رکنا باد گلگشتِ مصلّے کی — ارم میں کب ملے ساقی پلا دے پرستاں کو (حافظ لدھیانوی)

پہلے مصرعہ کا ترجمہ اسی سہل ترین اصولِ ترجمہ پر مبنی ہے؛ دوسرے مصرعے کے "پرستان" نے ... سخن بنا دیا ہے ! فی الحقیقت اس شعر کا پورا ترجمہ اعجاز عجیب ہے اس قدر خوبیوں اور نکات سے معمور ہے کہ پڑھیے اور جھومیے

صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ "ارم میں کب ملے" (یعنی نہیں ملے) کیا چیز [illegible] یہ مصرعہ جواب دیتا ہے (گلگشت مصلےٰ کی) پہلے مصرعے کے پورے ترجمہ میں جو "لذت" اور گلگشت کی اضافت کے ساتھ "کی" نے دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اگر آپ کو ذوق سلیم ہے تو وجد میں آئے بغیر نہیں رہ سکتے!

(۲) ٹھیٹھ اردو اور اجتہادِ مترجم :-

ساقی بہ نورِ بادہ برافروز جامِ ما | مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما (حافظ شیراز)

معمور کر شراب سے ساقی تو جام کو | ہو ناچ ٹھیک پایا زمانہ کے کام کو (حافظ لدھیا)

دوسرے مصرعے کے ترجمہ نے ریختہ کی دیوار سر بفلک چن دی: "مطرب بگو" کا ترجمہ "ہو ناچ" کیسا ٹھیٹھ اور وقت کا راگ ہے۔ وقیانوسی زمانے میں محض مطرب گاتا تھا! موجودہ زمانہ میں ہر محفل ناچتا ہے۔ مترجم نے "ہو ناچ" لکھنے سے تہذیب حاضرہ کی واقفیت کا بے مثل ثبوت دیا ہے! "کارِ جہاں شد بکامِ ما" کا ترجمہ "ٹھیک پایا زمانہ کے کام کو" اپنی جگہ پر سہل ممتنع نظر آتا ہے البتہ مترجم نے حافظ شیراز کے شعر میں اپنے ترجمہ سے وہی رنگ دیا ہے جو کچی دیوار پر لیس کر دینے سے ہو جاتا ہے!

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است | با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا (حافظ شیراز)

دونوں جہاں کی راحت تفسیر ہے دو حرفی | دکار دشمنوں سے احباب سے ملاطفت (حافظ لدھیانہ)

"دو حرفی تفسیر" حال ہی میں ملکِ پنجاب سے شائع ہوئی ہے۔ غالباً یہ "تفسیر دو ورقی" کا نیا ایڈیشن ہوگا! "تفسیر ایں دو حرف است" کا کیسا ٹھیٹھ ترجمہ ہے؟ پڑھیئے اور پھڑک جایئے! دوسرے مصرعے کا ترجمہ چراغ لیکر "شہر لدھیانہ۔ ملک پنجاب" سے "شہر شیراز ملک ایران" تک اپنی داد کے الفاظ ڈھونڈھتا ہے اور نہیں پاتا!۔

ہمہ کارم ز خود کامی بہ بدنامی کشید آخر | نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا (حافظ شیراز)

مجھے خود کامیوں نے آپ ہی بدنام کر ڈالا | چھپیگا راز وہ کیسے جو بنتا ہو نگار محفل؟ (حافظ لدھیانہ)

"جوکہ" کی بندش ملاحظہ ہو، ممکن نہیں کہ اپنی جگہہ سے جَو برابر بھی کھسک سکے! "سنگار" کے نون کا اظہار عینِ شہ روزی پر دال ہے: "سنگار محفل" بھی نئی ایجاد ہے جو موجودہ زمانہ میں "سنگار میز" کے بجائے استعمال ہوتی ہے! قیصر جرمنی غالباً "سنگار محفل" کو روزانہ صبح کو کام میں لاتے تھے! نتیجہ ظاہر ہے!

آں تلخوش کہ صوفی ام الخبائثش خواند | اشہیٰ لنا واحلیٰ من قبلۃ العذارا (حافظ شیراز)
اماں خرابیوں کی صوفی نے مے بتائی | رخسار چومنے سے اچھا مجھے لگا ہے (حافظ لدھیانہ)

"اماں خرابیوں کی" رخسار چومنے سے مترجم صاحب کو اچھی لگی ہے! غنیمت ہے کہ رخسار چومنا سدِّ سکندری قرار پائی ورنہ خدا جانے "اماں خرابیوں کی"، خراباتِ مُغاں کو تہ وبالا کر ڈالتی یا بچے دینے پر آتی تو خرابۂ عالم کو شہد کی مکھیوں کا چھتہ بنا دیتی! "ام الخبائث" کے ٹھیٹھ ترجمہ کی داد اگر آپ دل کھول کر نہ دیں تو خرابی ہے!

شکر فروش کہ عمرش دراز باد چرا | تفقدی نہ کُند طوطیِ شکر خا را (حافظ شیراز)
بڑی ہو عمر اُس کی پر مٹھائی بیچنے والا | سمجھتا کچھ نہیں ہے طوطیانِ شہد خارا کو (حافظ لدھیانہ)

شکر فروش کے بجائے "مٹھائی بیچنے والا" کیسا عام فہم ترجمہ ہے۔ غالباً حافظ شیراز کو "شاخِ نبات" سے جس طرح وابستگی تھی اُسی طرح حافظ لدھیانہ کو کسی حلوائی بچہ سے ہو۔ ہوئی ہو، یا ہونے والی ہو! "طوطیٔ شکر خارا" کا ترجمہ "طوطیانِ شہد خارا کو" اپنی نظیر آپ ہے! "شہد خارا" آپ نہ جانتے ہوں گے۔ ایک قسم کا پتھر ہوتا ہے جو "سنگ خارہ" سے بہت ملتا جلتا دیکھا گیا ہے: حرف تو مشدّد ہوا کرتا تھا مگر اب لفظ بھی مشدّد دریافت ہوا ہے۔ مثلاً اسی شعر میں "را" مشدد ہے جو "شکر خارا" کے ساتھ ایک جملہ بنتا ہے جس کا ترجمہ "شہد خارا"، کیا گیا اور دوسرے یہ ہی "را" ہے جس کا ترجمہ "کو" بھی درج کیا گیا ہے۔ لفظِ مشدّد کو لمبس نے ہندوستان کی حدِّ فاصل کے قریب بحر اوقیانوس میں جنگ یورپ کے زمانہ میں دریافت کیا تھا! ناظرین اس کو تعجب کی نگاہ سے

ملاحظہ نہ کریں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے :۔ ع۔ بر کشم ایں دلق ازرق فام را (حافظ شیراز)
یہاں "فام" متشدد ہے چنانچہ ترجمہ کیا گیا ہے ع۔ پھینک دالوں پوستینِ رنگ نیلی فام کو :۔
"رنگ" اور "فام" پر غور کرنے سے یہ معمہ حل ہوگا !

۳۔اضافت :۔

....آبرو سے خوبی از چاہِ زنخدانِ شما (حافظ شیراز)
......رنگ کو بخشتا ہے چاہِ زنخداں آپ کا (حافظ لدھیانہ)

"آبروئے خوبی" کا ترجمہ "رنگ رخ کو بخشتا ہے" گویا اضافتِ پارس کی تشریح ہے !
"چاہِ زنخدانِ شما" کے بجائے "چاہ زنخداں آپ کا" بلا اضافت لایا گیا ہے جو تقلیع کی بدولت "چہ زنخداں" رہ جاتا ہے۔ اس میں بھی خاص خوبی ہے۔ زنخداں کی حجامت مقتضی ہے کہ وہاں "چاہ" کی بجائے چہ بچہ ہو تو زیادہ موزوں ہوگا۔

بلبل بہ نالہ در چمن آمد بہ صبح دم — از وصل گل ہمیں شود اندر خزاں جدا (شیراز)
کہنے لگی بہ آہ چمن میں یہ عندلیب — موسم خزاں میں وصل بھی بس ہوگیا جدا (لدھیانہ)

"بہ آہ" کو بصد حسرت چھوڑیے! "موسم خزاں" بلا اضافت ملاحظہ طلب ہے! فکِّ اضافت کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ اسکول کے طلبا امتحان کے لیے نوٹ کرلیں!!

.....کہ خالِ مہر و وفا نیست روئے زیبا را (حافظ شیراز)
......وفا کا خال ہے درکار لیکن گالِ زیبا کو (حافظ لدھیانہ)

"گالِ زیبا" میں جو اضافت استعمال کی گئی ہے وہ بھی "شہر لدھیانہ ملک پنجاب" کی نئی اُپج ہے !

زبانِ کلکِ تو حافظ چہ شکر آں گوید — کہ گفتۂ سخنش می برند دست بدست (شیراز)
حافظ صنم کا شکر نہیں کرسکی قلم — تحفہ صنم کے ہاتھ کا دستِ بدست ہو (لدھیانہ)

"دست بدست" کے بجائے اردو میں "دستِ بدست" ارشاد ہوا ہے! جامع القواعد کا

مولف اگر خدانخواستہ زندہ ہوتا اور مسہل لیتا جب بھی اس کو "دست بدست" کا مرتبہ اعلیٰ عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی نصیب نہ ہوتا!

(۴) تذکیر و تانیث

...... چو کہ بفروشند مستوری بہ بستان شما (حافظ شیراز)

...... مول لیگا پارسائی چشم مستان آپ کا (حافظ لدھیانہ)

"چشم مستاں آپ کا" از سرتاپا ہیولیٰ ہے، جتنا دکا اسیدھی سادھی خوبی یہ بھی ہے کہ "چشم مستاں" عین مستی میں مذکر کا جامہ پہن لیتا ہے کیونکہ انگریزی تھیٹر میں عورتیں مردوں کا پارٹ خوب کرتی ہیں! غالباً حافظ لدھیانہ فرانس کی سیر کر چکے ہیں!

چو کحل بینش ما خاکِ آستانِ شماست | کجا رویم بفرما ازیں جناب کجا (شیراز)

انجن بنایا خاک سے جب آستان کی | جاؤں کدھر میں چھوڑ کے چوکھٹ جناب کا (لدھیانہ)

اگرچہ "انجن" کا استعمال پہلے مصرعہ کو اسپیشل ٹرین کی طرح لیے اڑتا ہے، لیکن مجھے "چوکھٹ جناب کا" گرویدہ کر رہا ہے! چوکھٹ مذکر اس وجہ سے لکھا گیا ہے کہ دا سے یعنی اوپر والے حصہ سے مراد ہے! معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "ازیں جناب" کا ترجمہ "چوکھٹ جناب کا" ہے یعنی خطاب کے لحاظ سے "ازیں" کے بجائے اردو میں "جناب" آیا ہے اور فارسی کے "جناب" کا ترجمہ "چوکھٹ" ارشاد ہوا ہے! میرے خیال میں یہ ترجمہ نادر ہی نہیں، ٹھیٹھ ہونے کی وجہ سے کارآمد بھی ہے! اگر تحریر و تقریر میں فارسی کے استعمال سے گریز کرنا مقصود ہو تو "جناب" کی بجائے "چوکھٹ" استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً عرضیوں میں "جناب عالی" کے بجائے "چوکھٹ اونچی" لکھا جائے یا خطوط میں "جناب والد صاحب" کی جگہ پر "چوکھٹ اباجان" استعمال کیا جائے۔

(۵) متفرق۔

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب | کہ آمد ناگہاں دلدارم امشب (شیراز)

صد شکر ہے میں بن گیا دردار آج رات | آیا ہے میرے پاس وہ دلدار آج رات (لدھیانہ)

"تعالے اللہ" کا ترجمہ "صد شکر" اور "ناگہاں" کا حذف ایسی خوبیاں ہیں جو مترجم صاحب کی بُراق طبیعت کے لحاظ سے نہایت معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ "دولت دارم" کا ترجمہ "بن گیا زردار" واقعی قابلِ داد ہے! دلدار کا آنا اور حافظ لدھیانہ کا زردار بن جانا عجیب لطیف کنایہ ہے۔ دلدار کی ذات کسی طرح ٹکسال سے کم نہیں نظر آتی۔ اس کے علاوہ امیر تیمور کی ایک کنیز کا نام بھی "دولت" تھا جس کے آنے سے امیر تیمور زردار بن گیا تھا:

کامے طلبد حافظ ازیں چشمۂ حیواں — آرے نتواں خورد نصیبِ دگراں را (شیراز)

ہمیں ہے آرزو حافظ نکالیں کا م زمزم سے — کسی کے ساتھ قسمت کو نہیں ہم نے لڑانا ہے (لدھیانہ)

"چشمۂ حیواں" آج معلوم ہوا ہے کہ "زمزم" کو کہتے ہیں: دوسرے مصرعہ کی تعریف صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ "ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ؛ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست" اللہ اللہ ہندوستان میں اب بھی ایسے ایسے سخن ور پڑے ہیں جو "کسی کے ساتھ قسمت نہیں ہم نے لڑانا ہے" نہایت بے باکی کے ساتھ استعمال کر جاتے ہیں! یہ ترجمہ خوبیوں سے لبریز ہے۔ پڑھیے ۔؟ اور ناچیے! کیونکہ "ہو نا چ" پہلے ارشاد ہو چکا ہے!

......+ ماہِ بے مہرم چو بکشاید نقاب = (شیراز)

.....+ جس وقت ہو جمالِ جفاکش کا بے نقاب = (لدھیانہ)

"ماہِ بے مہر" کا ترجمہ "جفاکش" ملاحظہ ہو۔ معشوق جفا کرتے کرتے ردِّ عمل کے تحت میں ۱۹۱۹ء میں جفاکش ہو گئے ہیں: غالباً اسی وجہ سے پیرس میں ان کا موجودہ نرخ ایک مستند راوی نے ٹکے سیر بیان کیا تھا؟

شاہدانِ مستند رومستان بے شکیب + ... (شیراز)

پردے پڑا ہے یار تو ہیں مست بے قرار + ... (لدھیانہ)

"پردے پڑا" کی ترکیب ملاحظہ ہو! "پانوں پڑنا" اور "گلے پڑنا" دقیانوسی حرکت تھی ! اب اس کی بجائے "پردے پڑنا" استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی سے مدمقابل کی عقل پر پردہ

پڑ جاتا ہے!

"دیوانِ حافظ شیرازی بزبان اردو" سچ یہ ہے کہ دقائق و نکات کے لحاظ سے ایک بحر زخار ہے اور ناپیدا کنار ہے! جو غوطہ زن ہو کر دیکھیے، سر نکالنے پر آپ اپنے کو دوسری جون میں پائیں گے!

مجھے نہایت سچائی کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میرا مبلغ علم اس نادر روزگار ترجمۂ منظوم کی خوبیاں سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے نہایت کم ہے۔ مولوی ابوالحسن صاحب صدیقی (بدایونی) جو کلامِ حافظ کے نکتہ سنج ہیں، ممکن ہے کہ اس "دیوان حافظ شیرازی بزبان اردو" کو ملاحظہ فرما کر اس کی کما حقہٗ داد دیں!

جس طرح دعا پر ہر کلام کا ختم کرنا ضروری ہے اسی طرح آخر میں چند اشعار اور پیش کش کرتا ہوں:۔

زلف آشفتہ و خوے کردہ و خنداں لب و مست ۔۔۔ پیرہن چاک و غزل خواں و صراحی در دست
نرگسش عربدہ جو و لبش افسوس کناں ۔۔۔ نیم شب یار بہ بالین من آمد بہ نشست
سر فرا گوشِ من آوردہ بہ آواز حزیں ۔۔۔ گفت کاے عاشقِ شوریدۂ من خوابت ہست

کیسے غضب کے جادو بھرے اشعار ہیں۔ اب ترجمہ ملاحظہ ہو:

عرق سے تر مست و خنداں زلف کھولے جان کے ۔۔۔ چاک پوشش، جام لے کے گیت گاتا شان کے
چشم جس کی جنگجو افسوس لب تھے کر رہے ۔۔۔ نیم شب کو مست بر بالین بیٹھا آن کے
درد سے وہ شوخ بولا نزد میرے کان کے ۔۔۔ سو رہے ہو آج عاشق آپ لمبی تان کے

سوچتا ہوں کہ کچھ لکھوں مگر سوائے اس کے کچھ نہیں لکھ سکتا کہ "اللّٰھم زِد فزِد"

میرے ایک عنایت فرما کی رائے ہے کہ اگر اردو کا منظوم ترجمہ پہلے ملاحظہ کیا جائے اور فارسی کا شعر بعد میں تو اور زیادہ نکات آشکارا ہوتے ہیں! میری دلی دعا ہے کہ ایک اندھیری رات میں۔ ظاہر نہیں تو خواب ہی میں حافظ لدھیانہ حافظِ شیراز سے دو چار ہو جائیں اور خدا کرے گھنٹوں آنکھ نہ کھلے!!

گنج علوم کی اصلی کنجی

(مادری زبان میں تعلیم)

از

(جناب مریم احمد عارف بہام صاحبہ)

آج قلم ایک ایسے مضمون پر اٹھاتی ہوں جس کی اہمیت کو کچھ میرا ہی دل خوب جانتا ہے یا اُن کے دل خوب جانتے ہیں جو اس کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ اپنی نا قابلیت اور کم لیاقتی کی وجہ سے میں ماہرین علوموں کے سامنے اس اہم مضمون کو بے مغز الفاظ کے جامے پہنا کر پیش کرتے ہوئے شرماتی ہوں۔ میری لغزشیں معاف کی جائیں۔

زبانوں کی ترقی و تنزلی اور اس کے عروج و زوال کا افسانہ اگر قلمبند کیا جائے تو وہ تاریخ عالم کا ایک بہت بڑا باب بن سکتا ہے۔ جس سے ہم بآسانی اس بات کا پتہ چلا سکتے ہیں کہ ایک قوم اپنی زبان کی خوبی اور اچھائی سے کس قدر جلد ترقی کر گئی ہے اور دوسری اپنی زبان کی خامی اور خرابی سے قعر مذلت و جہالت سے نہ نکلنے پائی اور ہمیشہ کے لیے جاہل اور ان پڑھ رہ گئی۔ زبان درحقیقت انسان کی ترقی و بہبودی میں ایک ایسا نمایاں حصہ رکھتی ہے کہ وہ ایک قوم کی اصلی ترقی اور عروج کا راز کہی جا سکتی ہے۔

زمانہ شاہد ہے اور تاریخ کہہ رہی ہے کہ اس صفحۂ دہر پر بہت سی قومیں بنیں اور بگڑ گئیں۔ سیکڑوں قبیلے آباد ہوئے اور بے خانماں ہوگئے۔ ہزاروں بادشاہ تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے اور پھر زمانہ نے اُن کو تباہ و برباد کر دیا۔ یہی ہوتا آیا ہے ہمیشہ یہی ہوتا رہیگا گر دیکھئے اور غور کرتے کی یہ بات ہے کہ ان کی ترقی و عروج کا اصلی

باعث اور اُن کی تنزلی و بربادی کا حقیقی سبب کیا تھا۔ کونسا زینہ تھا جس نے اُن کو اقبا مندی کے آسمان پر پہونچا دیا۔ اور کونسی وہ چیز تھی جس نے ان کو افلاس اور جہالت کے تنگ وتار ایک گڈھے سے نہ نکلنے دیا۔ یہ ایک سوال ہے جس کو ہر زمان و زمین کے بسنے والے حل کرتے آئے ہیں اور جہاں تک خیال کیا جا سکتا ہے آنے والی نسلیں بھی اس میں اپنا دل و دماغ کھپا دیں گی۔ اس کا جواب ایک ہے اور صرف ایک جس پر تمام حکما اور فلسفی متفق ہیں یعنی "تعلیم"

مگر تعلیم ایک صورت میں مفید اور مفید تر۔ دوسری صورت میں مضر اور مضر تر ثابت ہو سکتی ہے۔ پس اگر ہم درحقیقت ترقی و عروج کے دلدادہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم دنیا کی مہذب اور شائستہ خواتین کہلائیں تو ہمیں چاہیے کہ سب سے پہلے کسی اچھے اصول اور بہتر سے بہتر طرز تعلیم کو اختیار کر لیں کہ بغیر اس کے قدم قدم پر سخت مشکلوں کا سامنا ہوگا اور ایک قدم بھی آگے چلنا مشکل اور محال۔

سب سے پہلے جو سوال تعلیم اور طرز تعلیم کے متعلق ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے وہ زبان کا سوال ہے کہ کونسی زبان اختیار کی جائے کہ جس سے ہم پورا فائدہ اٹھا سکیں اور جو ہمارے کام کو آسان اور سہل بنا دے۔ کیونکہ ہماری جماعت یعنی طبقہ اناث فطرتاً اسی بات کی متقاضی ہے کہ ایک مقررہ وقت کے اندر ہماری تعلیم اصلی معنوں میں اور مفید طریقے پر ختم ہو جائے۔

اس موقع پر ہمارا خیال فوراً مادری زبان میں تعلیم ہونے کی طرف منتقل ہوتا ہے کیونکہ مادری زبان میں تعلیم ہونے کی اسی قدر ضرورت ہے جس قدر معدہ کو موافق غذا پانے کی۔ معدہ میں ناموافق غذا کا پڑنا یا ثقیل شے کا جانا باعث اسہال و بدہضمی ہوتا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے اسہال و بدہضمی کی صورت نظر نہ آئی پھر بھی معدہ کو اس غذا کی تحلیل میں بہت بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور قبل اس کے کہ وہ

ناموافق غذا ہضم ہو اور پورے طور سے تحلیل ہو جائے ضرور ہے کہ گرانی یا کسی یا کسی قسم کی شکایت ہو۔ بالکل یہی حالت مادری زبان میں تعلیم کی ہے۔ پڑھنے والیوں یا والوں کو ایک معدہ کی صورت میں لیا جا سکتا ہے اور تعلیم کو ایک غذا کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ اور ہے بھی حقیقت میں یہہ ایک روحانی غذا۔ جس طرح موافق غذا تحلیل ہو کر بدن کا جزو بن جاتی ہے اور اس سے کچھ تو خون بنتا ہے کچھ ہڈیوں کی ساخت میں مدد ملتی ہے۔ اور کچھ حصے گوشت پوست بن جاتے ہیں۔ اسی طرح تعلیم کا اثر متعلم اور متعلمہ پر پڑتا ہے۔ غیر زبان میں تعلیم ثقیل غذا سے مضر ثابت ہوتی ہے۔ لیکن مادری زبان میں تعلیم و تربیت کا اثر ہم میں نئے نئے رنگ پیدا کرتا ہے کیونکہ قبولیت کا مادہ سمجھ کا معیار۔ کتابی الفاظ سے النسبت مضامین کی تہ کو پہونچنے کی قوت جبلی فطرتی طور سے جس قدر انسان کو اپنی مادری زبان کے توسط سے حاصل ہو اتنی کسی غیر زبان کی وساطت سے ہونی معلوم۔ مادری زبان کے اشارے کنائے مصطلحات و محاورات بچپن سے گھٹی میں پڑے ہوتے ہیں۔ اُن کے سمجھنے میں تو کچھ وقت ہی نہیں۔ رہی حرف شناسی اور املا کی اصلاح اس کے لیے کچھ بہت بڑی محنت کی ضرورت نہیں۔ جب عبارت پڑھنی آگئی پھر تو اس کے لیے وہیں سے تعلیم کا دروازہ اصلی معنوں میں کھل جاتا ہے۔ اور بڑے سے بڑے ماہرین علم و سخن کا بھی یہی قول ہے کہ "ایک شخص کو سچے معنوں میں غیر زبان میں تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ اصلی تعلیم درحقیقت وہ ہے جو مادری زبان میں دی جائے"

ابتدائی تعلیم کی حالت بالکل ایک ننھے پودے کی سی ہے۔ اگر پودے کو اس کی سرشت کے مطابق زمین ملی۔ کافی ہوا اور گرمی کا گزر رہا۔ رطوبت بھی پوری مقدار میں میسر آئی۔ پھر تو نہ پوچھیے اس قدر جلد جلد وہ ڈال پات پھینکنا شروع کرتا ہے کہ دیکھتے دیکھتے قد آدم کے برابر آجاتا ہے۔ لیکن اگر ترقی اور اپج میں مزاحمتیں ہوئیں کنکر اور روڑے اس کے بڑھنے میں مزاحم ہوے یا عدم موجودگی روشنی و گرمی یا

ہوا۔ اس کے بڑھنے میں سد راہ ہوئی تو سمجھ لیجیے کہ وہ ناٹھا کا ناٹھا ہی رہیگا۔ اس کی امنگ باقی نہیں رہے گی۔ نتیجہ کیا ہوگا کچھ دن بعد مرجھا جائیگا۔

بس یہی حالت طبقۂ انسان کی ہے۔ ننھے پودے ہمارے نونہالان ملک ہیں ہماری کم عمر بچیاں ہیں۔ جن پر آیندہ نسلوں کے بگڑنے اور بننے کا دار و مدار ہے۔ ان کے قوائے جسمانی اور ان کے اعضا کی ساخت کچھ اپنے ہی ملک کی رسم و رواج کی خوگیری کے لیے بنے ہیں۔ ان کے دماغ زیادہ تر اسی ملک کی آب و ہوا اور اُس کے نشا رکو وفا کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اور یہیں کی زبان انکی تعلیم میں سلاست پیدا کر سکتی ہے جس طرح پودے کو ایک ناموافق زمین میں بڑھنے اور پھیلنے سے انواع و اقسام کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اسی طرح ایک ملک کے ہونہار بچوں کو دوسرے ملک کی زبان میں تعلیم دینے میں مختلف رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ اپنی مادری زبان میں تعلیم پانا چنے چبانا ہے لیکن غیر زبان میں تعلیم پانا گویا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ اُس ملک کے لیے یہ سب سے بڑی آفت ہے جس کے باشندوں کو اُس گاڑی سے اُتار کر جو کیل کانٹے سے بالکل درست پہیا جس کا مضبوط کہ کتنا ہی لد جائے تو ٹوٹنے کا نام نہیں۔ ایک ایسی ڈگمگ نیا پر چڑھایا جاتا ہے جس کے نگل جانے کو ہزاروں موجیں منہ کھول کھول کر دوڑتی ہیں۔ موج حوادث سے تباہ ہونے کا جسے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اور کشتی بھی ایسی کہ جس کے پتوار بادبان اور ساخت سے یہ بیچارے ایسے ناواقف کہ کہیں گرداب بلا میں پڑ کر جو ڈگمگانے لگے تو اسے سنبھالنے کو عقل چکرائے۔

ناظرین! ہماری زندگی کا ایک مقررہ حصہ تعلیمی اغراض کے لیے متعین کر دیا گیا ہے۔ قدرت کی طرف سے ہم مجبور ہیں کہ اس کے آگے نہ بڑھیں (طبقۂ اناث سے میرا مطلب ہے) اور یہاں یہ حالت ہے کہ پوری زندگی بھی تصویر علم کے کسی ایک رخ کو پورے طور سے دیکھنے کو کافی نہیں ہو سکتی۔ علم کا دریا بے پایاں۔ ہماری مشکلات آمیں

نہیں چھوڑتیں۔ اور ہماری زندگی کا وہ تعلیمی حصہ اتنا وفا نہیں کر سکتا کہ شجر علم کی تمام شاخوں کی پتیاں گنی جا سکیں۔ ایک ڈالی کی پتیوں کے ہی شمار کرنے میں ہمارا وقت تعلیم گزر جاتا ہے۔ جب ہماری تعلیم کا یہ عالم ہے تو ایک اصل اصول قائم کر لینے کی ضرورت ہے جس سے مقصد وری بھی ہو۔ تضیع اوقات بھی نہ ہونے پائے اس کے لیے سب سے بہتر یہ ہوگا کہ مادری زبان میں تعلیم ہو۔

غیر زبان میں تعلیم اگر دی جائے تو سمجھ جائیے کہ ہم بہت گھاٹے میں رہیں گے۔ اوّل تو اس میں بہت بڑی تضیع اوقات ہوتی ہے۔ پڑھنے والیوں اور والوں کو ایک نئے قسم کے الفاظ اور نرالی طرز تحریر بعض وقت رسم الخط سے بھی مانوس ہو جانے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ غیر مانوس زبان اور نئے نئے الفاظ ذہن پر گراں ہیں وحشت سی ہوتی ہے۔ طبیعت آخذہ اگر ملی ہے تو غنیمت ورنہ اس مقررہ وقت کا ایک معتد بہ حصہ تو زبان سیکھنے کے لیے صرف کر دینا پڑتا ہے اور ابھی تعلیم کا اصلی معنوں میں حاصل ہونے کا تو نام تک نہیں ہوتا۔ صرف اسی زبان دانی اور عبارت فہمی کے پیچھے لگنوں کی دماغی قوتیں زائل ہو جاتی ہیں خود نحیف اور کمزور ہو جانا پڑتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کتنوں کے ذہن معطل ہو جاتے ہیں۔ جیسے آگے کی محنتوں میں وفا کی امید رکھنی محض لاحاصل بات ہوگی۔
دوسری بات اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ ہم سمجھیں کہ تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس کی غایت آدمی بنانا۔ دنیا کی ماہیت کو سمجھانا۔ معیشت و معاشرت کے سبق سکھانا۔ زندگی کی سیدھی راہ بتانا۔ اپنی خداداد قوتوں سے عمدہ طریقے پر کام لینے کی ترکیبیں سوجھانا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے "اپنی مادری زبان کی جگہ غیر زبان کو واسطۂ تعلیم بنانا صرف تعلیم ہی کا گلا گھونٹنا نہیں بلکہ اپنی قومیت کو بھی مٹانا ہے۔"

محترم ناظرین دنیا کی تاریخ اٹھا کر آپ دیکھیں اور بتائیں کہ کبھی کسی ملک میں بھی

غیر زبان میں تعلیم پاکر ترقی کی ہے ؟ کوئی قوم اپنی زبان کو چھوڑ کر باقی رہی ہے؟ مجھے تو قطعاً اس کی کوئی مثال یاد نہیں۔

انگریزی کی تائید میں ایک وجہ نہایت متانت اور معقولیت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ علوم و فنون کے جو خزانے اس زبان میں ہیں ان کا عشر عشیر بھی ابھی تک ہماری زبان میں موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بداہت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اس ضرورت کے لیے انگریزی کا ایک زبان کی حیثیت سے سیکھنا بالکل کافی ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اسی کو واسطۂ تعلیم بنایا جائے۔

پس لازم ہے کہ ہم اپنی مادری زبان یعنے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنائیں۔ مجھے ہرگز اتفاق نہیں کہ ہماری بچیاں اور ہونہار بچے اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر ایک نامانوس اور اجنبی زبان کو واسطۂ تعلیم بنائیں۔ اس کو میں کسی پہلو سے بھی مفید اور قابلِ عمل نہیں سمجھتی۔

تعلیمِ نسواں کے ایک بہت بڑے مربّی کا یہ قول ہے کہ "ہمکو چاہیئے کہ اردو میں اپنا نصاب مقرر کر کے اپنے ہاں کے غریب اور شریف خاندانوں کی دیسی عورتوں کو مناسب وظیفے دیکر معلّمی کے لیے تیار کریں جو اردو نوشت و خواند میں مہارت رکھتی ہوں۔ میرے خیال میں اگر ان کو دو برس تک اپنے نصاب اور طریقۂ تعلیم کی تعلیم دی جائے تو وہ یہ خدمت باحسن وجوہ انجام دے سکیں۔ اور چند ہی سال میں ان کی اتنی بڑی جماعت تیار ہو جائے جو ملک بھر میں نشر و اشاعتِ تعلیم کے لیے کافی ہو"

اس لیے میں آج نئے سرے سے اپنی قوم مسلم کے سامنے اس بات کو بہت زوروں سے پیش کرتی ہوں۔ اور مادر ہند کے ہر سپوت سے التجا کرتی ہوں کہ ہر فرد بشر کو پوری سعی سے کوشش کرنی چاہیے کہ یہ طریقہ دونوں طبقوں یعنے اناث و ذکور کے لیئے لازمی طور سے عمل میں لایا جائے۔ قوم مسلم کی ہر جگہہ کی مقامی مجلسوں سے میں عرض

کرتی ہوں کہ وہ خدارا اُردو کو اپنا ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کریں۔ اور کوشش کریں کہ ہر مقام کے ہر مسلم زنانہ و مردانہ اسکولوں میں اسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ کیونکہ اسلامی تاریخ اسلامی مذہب و اخلاق کا سرمایہ جس قدر اردو میں ہے ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔ اور جونکہ مسلمانوں کے بچے اردو میں ہر جگہ ابتدا میں قرآن شریف پڑھتے ہیں اور اس کی اور اردو کی تحریر اور اسلامی مذہب و اخلاق کی اکثر اور مستند کتابیں اُردو میں ہیں۔ اس لیے اس نکتہ خیال سے بھی کہ مذہبی اور اردو زبان کی تعلیم باہم اس طرح وابستہ ہو گئی ہے کہ اُس کا جدا کرنا ناممکن ہے۔ اردو کے واسطے تعلیم میں بہت بڑی سہولیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس رنگ کے علاوہ علوم و فنون کی کافی کتابیں زبان اُردو میں لائی جا چکی ہیں اور روزمرہ ان میں بڑی سُرعت کے ساتھ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اُردو زبان صرف مسلم قوم کے لیے ہند میں واسطۂ تعلیم بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی بلکہ مادر ہند کا ہر سپوت جو ایک منصف دل سینہ میں نہاں رکھتا ہے۔ خواہ وہ کسی ذات برادری کا ہو۔ فوراً کہہ اٹھیگا کہ یہی وہ ایک زبان ہے جو عام طور سے ہند کی تعلیم کا میڈیم قرار دی جا سکتی ہے۔ آج اُردو کی سلطنت کشمیر سے لیکر راس کماری تک اور سندھ سے لیکر برہما تک ہے اور اس کی راجدھانی کی وقعت ہر دل میں ہے۔ اس کا تسلط آج ہندوستان کے چپے چپے پر ہے۔ پس میں باادب و بالتجا اپنے ہندو بھائیوں اور اپنی ہندو بہنوں سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ اس مسئلہ کو کلیتاً فیصل کر لیں اور بہت جلد اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائیں۔

خدا کرے وہ دن جلد آئے کہ ہماری مادری زبان ذریعہ تعلیم ہو۔

آمین

برسات

اِک سش پیدا ہوئی ہی پھر ہوا سے خاک میں
بادلوں نے گھر کیا ہی آج پھر افلاک میں

پھر چلی بادِ صبا اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی
پھر جوانانِ چمن ہیں اطلسی پوشاک میں

پھر ہوئی تقویم پارینہ سے دنیا روشناس
خاصہ اکسیر کا پیدا ہوا پھر خاک میں

پھر زمین ہند رشکِ گلشنِ جنت ہوئی
دلفریبی پھر ہوئی پیدا خس و خاشاک میں

پھر ہوئی کافور تاریکی بختِ نارسا
نور پھر پیدا ہوا ہے دیدہ نمناک میں

خوبی تقدیر سے پھر مست ہیں وحش و طیور
پھونک دی اِک روح پھر بارش نے آ کر خاک میں

حالِ دنیا مختصر یہ ہی کہ گھر گھر عید ہی
ابر کیا ہی گویا خوشحالی کی اِک تمہید ہی

وہ اُٹھا مشرق سے بادل وہ چلی بادِ صبا
وہ گرا قطرہ زمیں پر اور گوہر ہو گیا

خاک کے ذرات میں طاقت ہی مقناطیس کی
چرخ کی آنکھوں کا پانی کھنچ کے اب آنے لگا

ذرہ ذرہ گلشنِ فطرت کا معنی خیز ہے
پتے پتے کا یہاں کے رنگ ہوتا ہی جدا

جب ترشح کے ذرا آثار دیکھے چرخ پر
ایک حرکت میں محیطِ دہر کا منہ کھل گیا

حسرتِ نظارۂ عالم کا اب رونا کہاں
فیض سے برسات کے ہر گھر میں اک دریا بہا

منتظم ہونے لگے فوراً ز ساعت کے اصول
ہر گلِ پژمردہ دل خود ہی شگفتہ ہو گیا

ابرِ مستانہ روش نے کر دیا محوِ سکوت
سارا عالم ایک سناٹے کا نقشہ ہو گیا

ہو گیا مفقود فوراً کس مپرسی کا خیال
جب گھٹاؤں کی نظر آنے لگی مستانہ چال

جادۂ عشرت میں گو یا عمر ہوتی ہے بسر
اب تو کوسوں دور ہی دنیا کی کلفت کا اثر

اللہ اللہ رے ادائے ناز وجدِ ذوق میں
کرتی ہی پابوسیِ گلشن ہر اک شاخِ شجر

اُف رے بیتابیِ دل دریا کی موجیں اُڑ مریں
اِک جھلک نظارۂ فطرت کا نقشہ دیکھ کر

کس بلا کی ان مناظر میں ہی دل آویزیاں
اللہ اللہ یہ زمانہ اور پھر اتنا اثر

حد امکاں تک دنیا عالم فریبی کا ثبوت
معنیِ فطرت سے ہی مملو ہر اک برگ و ثمر

بعد مدت کے نظر آئی ہیں یہ گلکاریاں
یاد آیا میکدہ دنیا تھی اسی قانون پر

تیرگیِ بختِ وامق از جہاں ناپید شد
روزِ نوروز ست و ساقی جامِ صہبا برگرفت

معاف کیجیے

دیکھتے ہی کسی پر مفتوں ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ مشرقی قصوں سے بیانتک ثابت ہے کہ شاہزادے صاحب تعریف سن کر یا محض خواب میں صورت زیبا دیکھ کر دل سے دست بردار ہو جاتے تھے۔ یورپ والے تسلیم کرتے ہیں لیکن سمجھ نہیں سکتے کہ پہلی نظر میں محبت کیونکر پیدا ہو جاتی ہے۔ سائنس مقناطیس کے جذب کو اور بجلی کی کشش کو ثبوت میں پیش کرتی ہے۔ مگر از روے مسئلہ تناسخ بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے کہ پہلی نظر میں محبت پیدا ہو جانا پہلے جنم کی دوستی کا ثبوت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو.... ہوٹل میں نظارۂ نظر فریب دلگیر تھا۔ سامنے والی میز پر ایک حسین و خوشنما نازنین "لنچ" کھانے میں مصروف تھی۔ جس نے اپنی نادان اداؤں سے اور سبک حرکات سے مجھے مسخر کر لیا اور میرے دل کو موہ لیا۔

یونانی توہمات اور اُن کی نازک خیالیاں ایسی نہیں جن کی قدر نہ کی جائے مگر ہم اوہام پرست نہیں جو سمجھوں کہ کیوپڈ نے تیر چلا دیا اور تاک کر میرے دل کو نشانہ بنا لیا۔ مانا کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ محبت کے دیوتا کو اندھا فرض کر لینا کمالِ شاعری ہے لیکن اندھا نشانہ باز نہیں ہو سکتا اور پھر نشانہ بھی لگاتا تو دل پر۔ جو ہلنے والا۔ دھڑکنے والا چلتا ہوا پرزہ ہے اور ساکت نہیں۔ نگاہِ غلط انداز میں حیا و شرم ایک ایسا چلتا ہوا جادو تھی جو کیوپڈ کے تیروں کو نصیب نہیں۔ دیکھتا تھا کہ بے اختیار اس طرح جس طرح سوئی مقناطیس کی طرف کھنچ جاتی ہے۔ نگاہِ واپسیں کے ساتھ ساتھ اس کی طرف کھنچ گیا

اور اس کی میز پر جاکے بیٹھ گیا۔ بات کرنے اور کچھ کہنے کی ہمت بالکل نہیں تھی۔ منہ پھیر کر کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ اپنی وحشت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے حواس ٹھیک کرنے لگا۔ اس عالم و کیفیت میں۔ دل کشمکش سے تنگ آکر کہہ اُٹھا۔ "معاف کیجیے! آپکی گھڑی میں کیا وقت ہے؟" مجھے تعجب آمیز غور سے دیکھ کر اور پھر اپنی کلائی کی طلائی گھڑی کو دیکھ کر آہستہ سے کہا "دَو" یہ مختصر مگر مکمل جواب مختلف سوالوں کی تمہید تھا۔ سلسلۂ گفتگو جاری ہو گیا اور مختصر جوابات نے مجھے سمجھا دیا کہ ہوٹل کو روزانہ رونق بخشی جاتی ہے۔

ہمکلامی و ہمنشینی اس بات کا یقین دلانے میں کامیاب تھی کہ جس طرح وہ حسن کی دیوی ہے اسی طرح حیا کی پتلی بھی ہے اور دولتِ حسن کے ساتھ ساتھ دولت دنیا سے بھی مالامال ہے۔ دولت اور محبت میں غالباً دشمنی ہوتی ہے۔ دولت۔ خواہ حسن کی ہو یا دنیا کی۔ ادب چاہتی ہے اور محبت گستاخ ہوتی ہے۔ میں دربردہ۔ اور فی المثل جذبات و کیفیات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اور وہ گویا کہ سمجھا ہی نہیں۔ اظہار شوق کو ہنسکر ٹال جایا کرتی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھا کرتا تھا اور دیکھ کر رہ جایا کرتا تھا۔ یہ گستاخی تھی اور دیوانگی۔ وہ میری طرف دیکھا کرتی تھی اور نظر ملنے سے پہلے سر جھکا لیا کرتی تھی۔ یہ ہوشیاری تھی اور نادانی۔ کاش وہ کچھ نہ کچھ کہکر مجھے مایوس کردیتی یا مطمئن بنا دیتی۔ تذبذب نے میری جان پر بنادی تھی۔ امید و بیم میں رہنا محبت کی نشانی ہے۔ لیکن میں یکسوئی چاہتا تھا اور کوشش کیا کرتا تھا کہ اپنی زبان سے وہ وہی کہدے جس کا اظہار اس کی سخن ساز آنکھیں کیا کرتی ہیں مگر غنچہ نما دہن ہنسنے کے لیے تھا نہ کہ بات کرنے کے لیے۔

میں نے دعوت دی۔ درخواستِ دعوت کا جواب" میں تمھیں نہیں جانتی" دیوانگی کے لیے تازیانہ تھا۔ بیشک باوجود اپنے زیر و زبر کردینے والے اشاروں کے وہ مجھ سے ناواقف تھی۔ میرا دل جو کچھ بھی ہو۔ پھڑکتے ہوئے اشاروں کا مجموعہ تھا جو ہر وقت شرارت

کے لیے بےچین رہتے تھے، دیے قرار ہو کر میں غور کیا کرتا تھا کہ تعارف INTRODUCTION کو کیا ایک ہندوستانی کے لیے تعارف کے معنی سمجھ لینا آسان کام نہیں۔ ہوٹل اور بال روم میں تعارف کی ضرورت نہیں لیکن ہوٹل سے اور بلیچ گھر سے باہر نکل کر بات کرنا تو درکنار سلام کرنا گناہ ہے۔ تعارف ایک رسم ہے اور رسم ہمیشہ بے معنی ہوتی ہیں۔ رسومات۔ آداب اور قوانین کسی ملک یا سوسائٹی کے بناتے ہوئے ہوتے ہیں جو یا تو نا لیسنی ہوتے ہیں یا محض دنیا کی ترقی اور آزادی کو روکنے کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ قوانین اور رسومات اگر نہ ہوتے تو دنیا پاک و صاف ہوتی۔ نہ کوئی برائی ہوتی اور نہ کوئی برا کہلاتا۔ قوانین جرم اور گناہ کا باعث ہوتے ہیں اور رسومات برائیاں پیدا کرتی ہیں۔

اس مبہم جواب کی ذمہ دار تعارف سے زیادہ حیا تھی، شرم اس کی بات بات میں پائی جاتی تھی اور شرم دور کرنے کے لیے یا اس لیے کہ اس کا شرمانا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ دعوت کے متعلق روزانہ اصرار کیا کرتا تھا اور دیکھتا یہ تھا کہ میں کہتے کہتے تھکتا ہوں یا وہ سنتے سنتے پریشان ہوتی ہے۔ درخواست دعوت کی تکرار میں وحشت شامل ہوتی تھی جو گستاخی سے کم نہ تھی۔ درخواست میں ہر اول شامل ہوتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اظہار آرزو نا قابل معافی گناہ ہے۔ ... پریشان ہو کر اس نے کہہ دیا۔ "معاف کیجیے"۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں لفظ اسے سکھا دیے گئے اور یاد کرا دیے گئے تھے۔ جو اس نے خوف کے مارے معصوم اور بھولے بچے کی طرح اوا کر دیے زبان نے کہا "معاف کیجیے" مگر نظروں کا اشارہ اس سے کچھ جدا تھا "میں اپنی درخواست پر شرمندہ ہوں" "مجھے افسوس ہے" یا اسی قسم کا کوئی اور جملہ کہنے والا تھا کہ جواب دیا گیا "معاف کیجیے" + میں خاموش ہو کر یقین کرنا چاہتا تھا کہ خوشنما آنکھیں دھوکہ دے سکتی ہیں یا نہیں۔ بہرحال میں مجبور تھا۔ میں نے معاف کر دیا۔ لیکن اگر معاف نہ کرتا تو؟

میرا جرم کوئی نیا نہ تھا۔ اور نہ کوئی اس میں جدت تھی۔ ایسا قصور کرنا آدمی کے خمیر میں ہے۔ نظر انتخاب کی داد مانگنا اگر گناہ ہے تو میں ہر سزا کے لیے تیار تھا۔ سنگین سے سنگین سزا

مجھے منظور تھی لیکن "بے بی" (BABY) کا ناراض ہو کر نہ بولنا مجھے گوارا نہ تھا۔ اس کا نام میں نے "بے بی" رکھ دیا تھا جو موزوں بھی تھا۔ اور چسپاں بھی۔ وہ واقعی ایک بچّہ تھی دلربا اور راحتِ جاں۔ میں ہر قیمت پر اُسے منانا چاہتا تھا اور کرنا چاہتا تھا۔ "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" مگر نگاہ پھیر لینا ایک ایسی سزا ہے جو برداشت نہیں کر سکتا۔ سزا مل چکی بس اب رحم کیجیے!"
لیکن "کس طرح مناؤں"؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے عرصے تک مجھے اس کے سامنے نہیں جانے دیا۔ اور جب معافی مانگنے کے ارادے سے جان پر کھیل کر اس کے سامنے گیا تو بات نہ کر سکا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دل تھرّا گیا اور زبان بند ہو گئی۔
محبّت بزدل بھی بنا دیتی ہے۔ معافی مانگنے کی کوشش کرنا اور نہ مانگ سکنا میری بزدلی کا ثبوت ہے۔ خدا جانے "BABY" "بے بی" نے مجھے گستاخ ہونے کے علاوہ کس قدر بدتہذیب سمجھا ہوگا۔ بزدلی کا نتیجہ کھلا ہوا محرومی ہے۔ اور میں محروم ہوں مگر پہلی نظر کی محبت مایوس نہیں ہونے دیتی۔ آیندہ جنم کا ابھی سے امیدوار ہوں۔ اس کی نظریں میں بھول نہیں سکتا سب سے کارگر وہ نظر تھی جبکہ راہ میں مجھے دیکھ کر ایک ادا کے ساتھ مُنہ پھیر لیا گیا جب کبھی اس کو میرا خیال آجاتا ہے دل دھڑکنے لگتا ہے اور مجھے خبر ہو جاتی ہے۔ آہ وہ نظریں! رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے!!
اتنے عرصے کے بعد بھی، عہدِ ماضی کا جب تصور بندھتا ہے۔ اپنے احباب کو پریشان کر دیتا ہوں یہ پوچھ کر کہ "کس طرح کہتا؟ - معاف کیجیے"

تم کہتے ہو کونین کی دولت دینگے | دنیا دینگے فضائے [illegible] دینگے
ہم کہتے ہیں اس [illegible] دنیا [illegible] | [illegible]

عثمانیہ یونیورسٹی و علوم جدیدہ

(از جناب پروفیسر مظفر الدین صاحب قریشی ۔ ایم۔ ایس۔ سی)

آج مسلمانوں کی عالمگیر پولیٹیکل۔ تمدنی اور علمی تباہی کے طوفانِ عظیم میں اگر کسی طرف امید کی ایک ضعیف سی جھلک نظر آتی ہے تو وہ ہندوستان کا ایک گوشہ ہے جہاں عظمتِ گذشتہ کی ایک یادگار یعنی فرمانروائے دکن سریرآرائے سلطنت ہے۔ یہی وہ پایۂ تخت ہے جس کی طرف مسلمانانِ ہندوستان کی نظریں جھکی ہوئی ہیں اور اسی تاج کے ساتھ ان کی تمام امیدیں وابستہ نظر آتی ہیں۔ چنانچہ یہ ایک جانفزا اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو ڈھارس دینے والا مژدہ ہے کہ اس وقت جبکہ مسلمانانِ عالم پر مایوسی کے بادل گھٹا ٹوپ چھا رہے ہیں۔ حیدرآباد کے تخت پر ایک ایسا روشن ضمیر اور بیدار مغز نظام متمکن ہے جو نہ صرف دنیائے اسلام کی تباہی و بربادی کا پورا پورا احساس رکھتا ہے بلکہ اس احساس کو عملی جامہ پہنانے میں ہر ممکن طریق سے کوشاں نظر آرہا ہے۔ یوں تو مسلمانانِ ہندوستان مدت سے اس منبع فیوض سے مستفید ہو رہے ہیں اس وقت ان میں جس قدر بھی روشنیِ علوم نظر آرہی ہے وہ اسی فیاض سلطنت کا طفیل ہے۔ مدرسۃ العلوم علیگڈھ کو مسلمانوں میں علمی بیداری پیدا کرنے کا فخر حاصل ہے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ سرسید کی کامیابی اور مدرسۃ العلوم کا قیام دربار نظام ہی کی فیاضانہ و ہمدردانہ پالیسی کا نتیجہ تھا۔ مگر قطع نظر ان سب باتوں کے حال میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام اور زبان اردو کی ترقی و تحفظ کا عظیم الشان کام جو فرمانروائے موجودہ کی پہلے درجے کی بیدار مغزی کی دلیل ہے ایک ایسا واقعہ ہے جو مسلمانانِ ہندوستان بلکہ تمام مسلمانانِ عالم سے تحسین و آفرین اور احسانمندی کا خراج لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

منجملہ دیگر امور کے ایک بڑا اور اہم کام جو عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے ذمہ لیا ہے۔

وہ اردو میں علوم جدیدہ کی تعلیم و اشاعت ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ کام جس قدر ملک و قوم کے حق میں مفید اور لازمی ہے اسی قدر مشکلات سے پر ہے۔ بڑی دقت تو یہ ہے کہ اردو جسے ہم نے بطور اپنی زبان اختیار کر لیا ہے اور جو ہماری قومی زندگی کے ساتھ اس طرح منضبط ہو گئی ہے کہ کسی طرح علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسی زبان ہے کہ جس نے ہوش سنبھالنے سے آج تک سوائے حسن و عشق کے فسانوں کے کوئی اور بات تک سنی نہیں۔ اور برعکس اس کے وہ علوم جنہیں ہم اس زبان میں منتقل کرنا چاہتے ہیں ایسے علوم ہیں کہ جن سے یہ زبان بالکل ناآشنا رہی ہے جو یورپ کی زبانوں میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی اور وہیں عہد شباب کو پہنچے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح ان علوم کو اپنی زبان میں منتقل کر لیں کہ ملک بھی پوری طرح فائدہ اٹھائے اور علوم کی ترقی میں بھی کوئی فرق نہ آنے پائے۔ یہی ایک بڑا عقدہ ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش ہے۔ اور اسی عقدے کے صحیح حل پر اس موجودہ تحریک اور اسی قسم کی ہر ایک تحریک کی کامیابی منحصر ہے۔ اگرچہ ان اصحاب کی قابلیت و اہلیت جو اس کام کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں ایک مسلّمہ امر ہے لیکن تاہم کام کی اہمیت اس امر کی بھی مقتضی ہے کہ قدم بڑھانے سے پیشتر حتی الوسع کامیابی کا یقین ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ ڈر ہے کہ وقت اور محنت برباد نہ ہو۔ مجھے اس بات کا پورا علم نہیں کہ علوم جدیدہ کے تراجم اور ان کے ابتدائی مراحل کے متعلق اب تک کیا کچھ کیا جا چکا ہے البتہ علوم کیمیا کے متعلق چودھری برکت علی صاحب بی۔ ایس۔ سی (علیگ) کا مجوزہ طریق تسمیہ میری نظر سے گذرا ہے۔

مضمون پر ہر پہلو سے کافی غور و خوض کرنے کے بعد جو کچھ میری ناقص سمجھ میں آیا ہے۔ اُسے معذرت کے ساتھ پیش کرتا ہوں ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اوّل میں چودھری صاحب کا اپنی طرف سے اور اُن جملہ حضرات کی طرف سے جو اُردو

کی ترقی میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنے فرائض منصبی کو نہایت
ہی احسن طریق سے سرانجام دیا ہے اور اردو زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اس میں کوئی
کلام نہیں کہ چودھری صاحب موصوف نے اس قابلانہ۔ عالمانہ اور ناقدانہ مضمون کے لکھنے
سے نہ فقط اردو زبان پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے۔ بلکہ اس بات کا بڑا ثبوت دیا ہے
کہ آپ سے بڑھ کر اس اہم کام کا کوئی اہل نہیں ہو سکتا۔ کیمیائی تسمیہ کی جو راہ جس قدر اسلم
تجویز کی گئی ہے۔ وہ بذات خود نہایت عمدہ۔ جامع۔ اور ایک حد تک موزوں بھی ہے۔ مجھے
چودھری صاحب کی مسلمہ قابلیت پر پورا پورا اعتماد ہے۔ اور امید ہے کہ وہ اس مسئلہ کی
اس طرح پر تکمیل کر لیں گے کہ فن کی ضروریات پر کسی حد تک حاوی ہو سکے۔ اگر یہ امر طے ہو جائے
کہ اردو میں کیمیائی تسمیہ کے لیے سب سے بہترین طریق یہی ہے جو فاضل مضمون نگار نے
اختیار کیا ہے۔ تو ہماری مشکلات کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ میرے نزدیک
یہ امر ابھی تک طے نہیں ہوا۔ چودھری صاحب نے اپنے مضمون میں مجوزہ طریق تسمیہ کی [illegible]
پر جو بحث کی ہے۔ وہ ادبی حیثیت سے تو بیشک قابل تعریف ہے۔ لیکن ملک کے حالات
اور نقائص فن کے نقطہ نگاہ سے اس قدر قابل تسکین نہیں۔ جو لوگ فن کیمیا سے واقف ہیں
وہ اس اصول کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ترقی فن کے لیے فن کیمیا کا ایک بین الاقوامی چیز ہونا
نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ قابل مضمون نگار نے اس نکتہ کو بالکل نظر انداز تو نہیں کیا لیکن اس پر
کوئی تشفی بخش بحث بھی نہیں کی۔ یورپ کے طریق مروجہ کو اردو میں اختیار نہ کرنے کی دو وجہ
بتلائی ہیں۔ اول ہمارا طرز تحریر یورپ کے طرز تحریر سے جداگانہ ہے اور یہ ممکن نہیں کہ
یورپ کے الفاظ کو ہم بلا تغیر اپنے حروف میں لکھ لیں۔ دوئم یورپ کی زبانیں ہماری زبان
سے اس قدر مختلف ہیں کہ اردو میں ان الفاظ کا داخلہ بایں کثرت ممکن نہیں۔ اب یہاں یہ
سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا ان وجوہات کی بنا پر ہم کیمیا کی بین الاقوامی حیثیت میں رخنہ ڈال
سکتے ہیں؟۔ میں اس سوال کا جواب نفی میں دونگا۔ اور اس امر پر زور دونگا کہ اگر بالکل

جداگانہ اور نیا اسلوب اختیار کرنے کے بجائے یورپ کے طریق تسمیہ کی تقلید ملک اور اردو زبان کے حق میں زیادہ مفید ہوگی۔

ہمیں یہ بات نظرانداز نہیں کرنی چاہیے کہ یونانیوں کے علوم قدیمہ کو یورپ کے علوم جدیدہ سے کوئی نسبت نہیں۔ یونانی علوم جب مسلمانوں کے ہاتھ لگے تو ایک مدفون خزانہ کی مانند تھے جسے عربوں نے کھولا اور اپنی زبان میں ڈھال لیا۔ پھر جو کچھ ترقی ان علوم نے حاصل کی وہ عربوں کے ہاتھوں کی۔ دوسری اقوام نے جب ان علوم کو حاصل کرنا چاہا تو عربی یونیورسٹیوں کے دروازہ کو کھٹ کھٹایا۔ اور عربی زبان کے توسل سے ان علوم سے بہرہ یاب ہوئے۔ کچھ عرصہ تک یہی صورت حالات رہی اور جب تک عرب مسند علوم پر متمکن رہے۔ علوم پر بھی عربی زبان کا تسلط رہا۔ البتہ جس وقت عربوں میں ترقی تہذیب کے ساتھ ترقی علوم بھی رک گئی اور یورپ نے اس میدان میں قدم بڑھانے شروع کیے۔ تو علوم بھی عربی زبان سے یورپ کی زبانوں میں منتقل ہونے شروع ہوئے۔ اس کے بعد جو کچھ ترقی ان علوم نے حاصل کی وہ یورپ کی زبانوں میں کی۔ یورپ کی ترقی کی بابت کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ جذبات کو بالائے طاق رکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ علوم عقلی و نظری میں جو حیرت انگیز ترقی یورپ نے پچھلے دو صدیوں میں کی ہو وہ دنیا کی تاریخ علوم میں ایک کرشمہ ہے جس کے سامنے بنی نوع انسان کی تمام گزشتہ ترقیات ہیچ ہیں۔ اور ابھی یہ ترقی رکی نہیں۔ بلکہ اس کا مستقبل حال اور ماضی سے بھی بڑھ کر شاندار نظر آرہا ہے۔ علوم کی ترقی تمدن کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب تک یورپ کا تمدن اس دنیا میں حکمراں رہیگا خزانۂ علوم پر بھی یورپ کی زبانوں کا تسلط جما رہیگا۔ اور اگر یورپ کا تمدن مٹ بھی جائے تو کیا کوئی سمجھدار آدمی یہ خیال کرسکتا ہے کہ علوم پر سے بھی یورپ کی زبانوں کا اثر دفعتہً جاتا رہیگا۔ ہرگز نہیں۔ عربوں نے علم ہیئات میں ایک نمایاں ترقی کی تھی۔ اور باوجودیکہ حال کی ترقیات نے عربوں کی ترقیات کو ماند کر دیا ہے۔ تاہم آج بھی جبکہ علم ہیئت یوروپ کی بدولت معراج ترقی پر پہنچ چکا ہے۔ عربی

زبان کا اثر اس علم کی اصطلاحات اور ستاروں کے ناموں میں ظاہر ہے۔ بقول......
"عرب گو مٹ گئے لیکن اپنا سکہ آسمان کے ستاروں پر قائم کر گئے" یورپ بھی مٹ جائیگا
لیکن یہ ممکن نہیں کہ ان علوم پر سے جنھیں یورپ نے اپنی گود میں پرورش کی ہے۔ اور اب جن
علما کو یورپ نے اس قدر وسعت دی ہے ان کی زبان کا اثر بھی مٹ جائے۔ کیا اس صورت
میں اس بات کی کوشش کرنا کہ جس علم کو ہم یورپ سے سیکھ رہے ہیں ان میں یورپ کی زبان
کا اثر کلیۃً نہ رہے بجائے خود ایک ایسا کام ہے جو قانون فطرت کے خلاف ہے۔ اب ارباب فن ہی
اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یورپ کے تمدن اور علوم جدیدہ کے مقابلے میں ہماری موجودہ
علمی تمدنی اور پولٹیکل حالت کس امر کی مقتضی ہے۔ دیگر علوم کو برطرف کر کے اگر فقط کیمیا ہی کو
مدنظر رکھا جائے تو یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت رہ جاتی ہے کہ اس فن نے جس قدر ترقی
حاصل کی ہے اس میں ہمارا حصہ عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ بلکہ ابھی تک ہماری حالت ایک
طفلِ مکتب کی سی ہے جو یورپ سے اس فن کو سیکھ رہا ہے اور جو ایک مدت تک اس
فن کے اکتساب اور تکمیل میں اُسی کا دستِ نگر رہیگا۔ کیا اس حالت میں یورپ سے کیمیا کے
بین الاقوامی تعلقات کو منقطع کرنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں؟

اسی سلسلہ میں ایک اور امر بھی قابلِ لحاظ ہے۔ فن کیمیا فی زمانہ نہایت سرعت سے
ترقی پذیر ہو رہا ہے۔ اور اس ترقی میں زیادہ تر بلکہ تمامتر یورپ اور امریکہ کا حصہ ہے۔ کوئی
دن نہیں جاتا کہ کیمیا کی کسی نہ کسی شاخ میں وسعت حدود واقع نہ ہوتی ہو۔ سیکڑوں ہفتہ وار
اور ماہوار رسالے اس فن کی نئی معلومات اور انکشافات شائع کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ
سب کے سب یورپین زبانوں میں ہیں جن میں فقط ایک ہی طریق تسمیہ مروج و مدون ہے
فن کیمیا کے محقق کے لیے خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ ہو ان انکشافاتِ فن سے جو ان
میں شائع ہوتے رہتے ہیں باخبر رہنا نہایت ضروری ہے۔ بحالتِ موجودہ ایک ہندوستانی
کے لیے جس نے فن کیمیا کو انگریزی میں سیکھا ہو وہ تمام آسانیاں مہیا ہیں جن کے ذریعہ

وہ جدید ترقیات فن سے باخبر رہ سکتا ہے۔ انگریزی جرنلوں کے ذریعہ سے وہ نہ فقط ان ترقیات
کے متعلق معلومات حاصل کر سکتا ہے جو انگلینڈ اور امریکہ میں واقع ہوئی ہونگی۔ بلکہ ممالک یورپ
کی ترقیات کے متعلق بھی بالواسطہ کچھ نہ کچھ معلومات بہم پہونچا سکتا ہے اور اگر بالفرض اُسے یورپ
کے کسی دوسرے ملک (مثلاً جرمن) کی ترقیات فن کے متعلق پوری پوری کیفیت دریافت کرنا ہو تو اس
ملک کی زبان میں تھوڑی سی مہارت پیدا کرنی اس کے لیے کافی ہے۔ اس کو یہ ضرورت
پیش نہیں آتی کہ کیمیا کو نئے سرے سے اُسی ملک کی زبان میں سیکھے کیونکہ طریق تسمیہ
انگریزی اور دوسری زبانوں میں مشترک ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مجوزہ اسکیم کے تحت
میں ایک ہندوستانی کیمیاداں کے لیے مذکورہ بالا آسانیاں کس حد تک مہیا ہو سکتی ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جو ہندوستانی علم کیمیا کو اردو زبان میں مجوزہ طریق تسمیہ کے مطابق حاصل
کریگا۔ اس کے لیے فقط انگریزی زبان کا جاننا اس امر کے لیے کافی نہیں ہو سکتا کہ وہ انگریزی
کیمیا کو اچھی طرح سے سمجھ لے۔ لہذا اسے یورپ کی جدید ترقیات فن سے باخبر رہنے کے لیے
یورپ کا طریق تسمیہ بھی سیکھنا پڑیگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جو دقت اور محنت ترقی فن کے لیے صرف ہونی
چاہیے تھی وہ فن کے سیکھنے اور اس کے متعلق جدید معلومات حاصل کرنے میں صرف ہوگی
یوروپ نفس فن کو ترقی دیتا رہے گا اور ہم اپنی تمام قوتیں یوروپ کی ترقیات کو اپنے سانچے
میں ڈھالنے میں خرچ کرتے رہیں گے اور شاید وہ دن نہ آئے کہ ہم تحقیق فن میں کوئی حصہ لینے کو
قابل ہوسکیں۔

مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر ہم فن کیمیا کے فوائد سے من حیث القوم
مستفید ہونا چاہتے ہیں۔ تو موجودہ حالت میں ہمارے لیے بہترین طریق یہی ہو کہ یوروپ سے
اس فن کے بین الاقوامی تعلقات کو دفعتاً منقطع نہ کریں بلکہ نئے تغیر و تبدل کے ساتھ مروجہ طریق
تسمیہ کو اردو میں اختیار کرلیں اور اس بات کی مطلق پرواہ نہ کریں کہ یہ داخلہ "حلوہ میں مٹی کا"
کا مصداق ہوگا۔ ضرورت ہمیں اس امر پر مجبور کرتی ہے کہ دو بدعتوں میں سے ایک ہلکی بدعت

اختیار کرلیں۔ مجھے ڈر ہے ایسا نہ کیا تو ہماری تمام تحقیق بیکار جائیگی اور اب انجام ہمیں پچھتانا پڑیگا۔ کہ ایک امید موہوم کے پیچھے ہم نے ایک ضروری [illegible] کہ اس سلسلے میں جاپان کی مثال قابل تقلید نہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ ہمارا [illegible] تک حد لگا دے۔ اور یہ ایک بڑی مشکل ہے جو مروجہ طریق تعلیم کے اختیار کرنے میں حائل ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم اس مشکل سے بھی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

کلام [illegible]

زندگی تجھ کو مبارک ہو حیات جاوید — [illegible] تو اب کوئی سامان نہ تھا
جوشِ تعلیم نے دنیا پہ وہ احسان کیا — [illegible] کوئی جاہل رہا نہ نادان رہا
علم کے ساتھ عمل کے ہیں بہت کم اسباب — [illegible] تو پھر علم کا سامان نہ رہا
کردیا صنعت و حرفت کی کمی نے بیکار — [illegible] وہ پریشان نہ رہا
ہوئیں تیار مشینیں تو یہاں یہ حالت — [illegible] کوئی سوال اس کا امکان نہ رہا
بیچیے پہلے علاقہ تو مشینیں لیجیے — یہی وہ عقدۂ مشکل ہے جو آسان نہ رہا
جن کو نقصان نہ محسوس ہوا ایسے کم ہیں — جو ہیں دلدادۂ زینت انہیں نقصان نہ رہا

کاشتکاروں میں ہے گو برسرِ کار اک انبوہ — لیکن اس کو بھی نہ کہیے کہ پریشان نہ رہا
منتظم ہوگئے اس طرح زراعت کے اصول — انتہا یہ ہے کہ دانہ کوئی بریاں نہ رہا
وائے قسمت کہ نہ فصلوں کا تغیر سمجھے — گو کہ بیکار و عبث کوئی بیابان نہ رہا
متغیر ہیں مگر بعض نظامِ قدرت — جو معین تھا وہ اب موسمِ باران نہ رہا

پھر سبب کیا کہ زراعت کے نہ بدلیں اوقات — جبکہ پیاسا وہ قانونِ زر افشاں نہ رہا
ایسے سامان مہیا کئے صناعوں نے — کون ہے وہ جو انھیں دیکھ کے حیراں نہ رہا
پرِ پرواز سے بالائے ہوا بھی ہیں جہاز — جانور بن گیا انسان اب انساں نہ رہا
اپنی قسمت تو بہر طور بنا لی لیکن — محلہ میں کوئی غریبوں کا نگہباں نہ رہا

یوں عدالت کو ترقی ہوئی رفتہ رفتہ — راست گوئی سے جو لے کام وہ انساں نہ رہا
ظلم حد سے زیادہ مگر انصاف بہت ہے — مدعی اس کو نہ کہیے جو بے سر و ساماں نہ رہا
عذر گر مال گذاری کے اضافہ میں کیا — یا زمیندار لٹا۔ یا کوئی دہقاں نہ رہا
رہا دعویٰ نہ کسیکو بھی زباں دانی کا — ہم زباں ہو گئے سب کوئی زباں داں نہ رہا
شہر آراستہ ایسے ہوئے نئے انکر کیں؟ — معترض ہو کوئی دشمن بھی یہ امکاں نہ رہا
قابلِ دید ہے ہر سمت عمارت کی شان — تیرگیٔ حبس میں ہو ایسا کوئی زنداں نہ رہا
لائقِ علم ہیں۔ لیکن فقرا ہیں مریض — نہ رہا ان کے لیے گر کوئی ساماں نہ رہا

ایسے تیار ہوئے چار طرف اسپتال — حادثہ یہ ہے کوئی مریضِ غمِ ہجراں نہ رہا
انسداد مرض الموت کی لیکن ہو گئی — ہوا جو کچھ بھی" یہ سب عقل کے شایاں نہ رہا

خون سے جن کے زمانہ کی ہوئی آرائش — اُن مریضوں کے لیے کوئی بھی درماں نہ رہا
قوم میں ہند کے ملحوظ رہیں کچھ تو حقوق — یوں تجارت ہوئی آزاد یہ امکاں نہ رہا
مل گئے آہ سیاست میں تجارت کے اصول — کون تاجر ہے جو مجبور و پریشاں نہ رہا
کون سنتا ہے یہ باتیں جو سنیں بھی تو کہیں — چھڑ گئی جنگ کچھ ایسی کہ یہ امکاں نہ رہا
انتہا ہے یہ تغیر کی اگر غور کرو" — اس زمانہ میں شرر بھی تو غزلخواں نہ رہا

سیرۃ الزوجہ

تمہید

یہہ کتاب اس وقت تک نہایت پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ شاید اشاعت کو پردہ دری کا خوف مانع ہوا ہو۔ لیکن خوش قسمتی سے ہمارے ہاتھ آگئی اور چونکہ پردہ دری ہماری سرشت میں ہے۔ اس لیے اس کی اشاعت ہم پہ فرض ہے۔

علامہ فرعدلی جو اس کتاب کا مصنف ہے علم زوجیات کا ماہر تھا اور اپنے زمانہ میں یکتائے روزگار سمجھا جاتا تھا اس کی سوانح عمری بہت تھوڑی سی ہے۔ اپنی پوری زندگی میں کل آٹھ شادیاں کیں اُس کا بیان ہے کہ میں نے کبھی ایک وقت میں دو سے زیادہ بیویاں نہیں رکھیں اسی لیے میرے معاصر مجھے ذوالزوجتین کہتے تھے۔

سیرۃ الزوجہ میں اس نے اپنی آخری بیوی کے حالات لکھے ہیں۔

مضامین کتاب

کتاب آٹھ مقالات میں تقسیم کی گئی ہے۔ مقالۂ اوّل زوجہ کے زوجہ ہونے کے بیان میں ہے۔ اس کی تشریح دلچسپی سے خالی نہیں یعنی ایک حالت تو وہ تھی جبکہ زوجہ زوجہ نہ تھی بلکہ صرف اپنے ماں باپ کی لڑکی تھی۔ اس حالت کا متغیر ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ العالم متغیر۔ چنانچہ یہ حالت متغیر ہوئی یعنی زوجہ بنی۔ لیکن شارح اس پر ایک اعتراض کرتا ہے۔ کیونکہ بعد زوجہ ہونے کے بھی اپنے ماں باپ کی لڑکی رہی۔ لیکن اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں۔ کہ زوجہ ہونے کی صورت میں میاں کی بیوی بھی بن گئی خالی ماں باپ کی لڑکی تو نہ رہی۔ اس لیے تغیر حالت ثابت ہو گیا رہا تغیر صورت اس کی دلیل یہہ ہے کہ قبل زوجہ ہونے کے وہ حاملہ نہ تھی اور اب وہ حاملہ ہو گئی۔ اس سبب تغیر صورت بھی ثابت ہے۔ سوال ہو سکتا ہے کہ حمل سے تغیر صورت لازم نہیں آتا۔ اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ بیشک تغیر صورت لازم نہیں آتا لیکن درازی شکم

تو لازم آتی ہے جو عین تغیر صورت ہے۔

علامہ لکھتے ہیں کہ زوجہ کے ایام طفولیت کا زمانہ دار جو [illegible] نہیں ہوتا۔ اس لیے اس زمانہ سے ناواقف اپنے کو [illegible] نافرین مصلحت ہے۔

اُس سے یہ خواہش کرنا کہ اُس زمانے کے حالات لکھے [illegible] ہے۔ اس لیے سیرۃ الزوجہ کی ابتدا اسی وقت سے ہو سکتی ہے جبکہ لڑکی مبدل بہ زوجہ ہوئی۔

اس بیان سے جو اعتراضات واقع ہوتے ہیں ان سے [illegible] کیے جائیں تب بھی یہ خیال کسی طرح دماغ سے نہیں نکلتا کہ زوجہ کا یکایک زوجہ ہو جانا اصول ترقی تدریجی کے بالکل مخالف پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ مانا جائے کہ ماحول نے اس اور وجہ نیا دیا تو عصمت پر حرف [illegible] ہے اور کس زوج کی خوشی ہوگی کہ اپنی زوجہ کی عصمت کے متعلق بحث کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت پُرخار راہیں ہیں علامہ فرنالی یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان مسائل سے صاف بچ نکل گئے یہ کہکر کہ میں اپنی بیوی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب سے بیوی ہوئی۔

مقالہ دوم مصائب زچگی کے بیان میں ہے۔ تیسرے مقالے میں دودھ خشک ہو جانے کی کیفیت تحریر ہے۔

چوتھا مقالہ بچے کے دانت نکلنے دست آنے اور آنکھیں دکھنے کے ذکر میں ہے۔

مقالہ پنجم زچگی زوجہ بار دوم

مقالہ ششم زچگی زوجہ بار سوم

مقالہ ہفتم زچگی زوجہ بار چہارم

مقالہ ہشتم زوجہ کا زوجیت سے خارج ہو کر فرد اقتصادی محض بنجانا اور زوج کی جان پر دو بھر ہونا۔

یہ ہیں آٹھ مقالات جن پر سیرۃ الزوجہ منقسم ہے۔

کتاب کے بیانات اور اُن پر تفصیلی بحث کسی دوسرے نمبر میں انشاءاللہ شائع کرنے کی غرض سے بھیجوں گا۔ اس مضمون میں علاوہ فرحالی ذوالزجتین کے نام اور ان کی معرکۃ الآرا تصنیف سے لوگوں کو آگاہ کرنا مقصود ہے۔

ایک بھونرا اور بلبل

پرلطف کیا بہار کا جوبن سماں تھا | وہ گلستاں نہیں تھا اک نسخۂ جناں تھا
بادِ صبا روش پر اٹھلاتی پھر رہی تھی | سبزہ دیار لوٹتی تھی پتوں کو چھیڑتی تھی
... شاخیں تھک تھک کے جھومتی تھیں | آپس میں ان رہی تھیں رک رک کے جھومتی تھیں
... رہی تھی | ایک نودمیدہ گل کو اُس پر سلا رہی تھی
جب تک نہ گل کو مدہوش خواب پاتی | جھولا کبھی جھلاتی - لوری کبھی سناتی
کوئی کلی جو ... کرتی | جھونکوں سے پھر تھپکتی اور اُس کو پیار کرتی
اک میں جو سبزہ اُگا ... تا | بیٹھا ہوا روش پر میں اُس کا لطف اٹھاتا

تھوڑی ٹک پہنچ رہی تھی کیا کیا مری نظر کو
تسکین دے رہا تھا اپنے دل و جگر کو

اوڑتا ہوا چمن میں ناگاہ ایک بھونرا | اُس پھول کے سرہانے آیا اور جا کے پہنچا
روش نسیم پر وہ پہلے تو تھرتھرایا | پھر اُس نے راگ اپنا دلکش سروں میں گایا
یعنی میں اس جہاں میں ہوں وقف خود پرستی | حصے میں میرے آئی حسن و ادا پرستی
روز ازل سے گویا عاشق مزاج ہوں میں | دنیائے شاعری کا زرین تاج ہوں میں
دیتے ہیں لوگ مجھ کو زلفِ حسیں سے نسبت | چشم سیہ سے نسبت، خالِ جبیں سے نسبت
دنیائے عاشقی میں روشن ہے کام میرا | بھاشا کی شاعری میں مشہور نام میرا
پیدا ہوا جہاں میں میں تشنہ کامِ الفت | میرے لیے مگر ہیں یہ پھول جامِ عشرت

تو نوش ہوں انگبیں کا، میں خواہاں ہوں انگبیں کا خواہاں ہوں مدتوں سے میں لطفِ انگبیں کا
گلشن میں ڈھونڈھتا ہوں، صحرا میں ڈھونڈھتا ہوں پھولوں کی جستجو میں مدت سے پھر رہا ہوں
کس واسطے بنی ہے بلبل رقیب میری دشمن ہوئی ہے آخر کیوں بد نصیب میری

یہ کہکے اُس نے چاہا اب گُل کا ہمنشیں ہو
دستِ ہوس بڑھا کر سیرابِ انگبیں ہو

بلبل نے جب سنا یہ لاف و گزاف اُس کا اور فعل اُس نے دیکھا بالکل خلاف اُس کا
تڑپی ہوئی وہ بیکس نزدیک اُس کے آئی بولی کہ اے ستمگر اس درجہ خودستائی
تو مطلب آشنا ہے، تو ننگِ عاشقی ہے ایمان سے بتا تو رسمِ وفا یہی ہے؟
آج ایک گُل پہ عاشق، کل دوسرے کا جویا اے خود غرض! بھرم یوں الفت کا تو نے کھویا
گُل سے تجھے غرض کیا، گلشن سے واسطہ کیا مطلب کا آشنا ہے مطلب کا تو ہے شیدا
حد سے بڑھا ہے تیرا جوشِ ہوس پرستی پھر اُس پہ کہہ رہا ہے "میں ہوں درد مند ساتی"
اب مجھ سے سُن ستمگر میرا بیانِ الفت میری حکایتِ غم، اور داستانِ حسرت
محرومِ آرزو ہوں، ناکامِ آرزو ہوں دنیائے عاشقی میں بدنامِ آرزو ہوں
مطلب نہیں ہے کوئی، صورت کی ہوں میں شیدا دل کی لگی زباں سے ہو جاتی ہے ہویدا
سب اس خطا پہ مجھ سے بیزار ہو گئے ہیں اک جان کو ہزاروں آزار ہو گئے ہیں
گلچیں الگ عدو ہے، صیاد الگ ہے دشمن ہے فکر باغباں کو توڑے مرا نشیمن
یہ میرے چار تنکے دل میں کھٹک رہے ہیں اللہ کیسے کیسے میں نے ستم سہے ہیں
لے دیکھ وہ نشیمن اُجڑا ہوا پڑا ہے میری طرح سے تو بھی بے خانماں ہوا ہے؟
انصاف سے بتا دے! ایماں سے بتا دے! جھیلے ہیں تو نے بھی کچھ قیدِ قفس کے صدمے؟
میری طرح سے تیرے نوچے ہیں پر کسی نے؟ گھنٹوں تجھے رُلایا کب رنجِ بیکسی نے؟
گردن پہ تیری ظالم پھیری گئی چھری کب؟ میری طرح اُٹھائی تو نے کبھی کڑی کب؟
ہر دل کو جس نے چھینا وہ غم نژاد میں ہوں! وہ درد مند میں ہوں، وہ نامراد میں ہوں!
میدانِ عشق میں آ گر تجھ کو حوصلا ہے ناحق کو کیوں یہ باتیں مجھ سے بنا رہا ہے
بھونرے سے بن نہ آیا جب کچھ جواب اُس کا چپکے سے چلدیا وہ سُن کر عتاب اُس کا

گلشن میں بیٹھے بیٹھے فہمی بھی تھک گیا تھا
اک داغِ تازہ لے کر واپس وہ گھر کو آیا

بے تار کی تار برقی

از

جناب محمد اسمٰعیل صاحب بانڈے

یہ مفید ایجاد اٹلی کے ایک نوجوان مارکونی نامی کی ہے یورپ کی ہر سلطنت میں بے تار کی تار برقی کے کئی اسٹیشن ہوتے ہیں۔ فرانس میں دس اسٹیشن ہیں جن میں سے سب سے زیادہ قوی، اور مشہور و معروف برج ایفل پر ہے۔ اور اسی طرح اور اسٹیشن بھی اہمیت اور قوت کے اعتبار سے دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ وہ انتہائی مسافت جہاں تک خبر کی جا سکتی ہے چھ ہزار پانسو کیلو میٹر ہے۔ اور کسی حالت میں بھی دس ہزار کیلو میٹر سے زیادہ بات چیت نہیں کر سکتے۔

جرمنی میں سب سلطنتوں سے زیادہ اور طاقت دار اسٹیشن ہیں۔ ان میں سے صرف نائن کے اسٹیشن پر نظر ڈالنا کافی ہوگا۔ جو بے انتہا قوت دار ہے اور جس سے بہت زیادہ فاصلے پر گفتگو کر سکتے ہیں اور جس کی مثال دنیا میں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں مل سکتی۔ یہ وہی عظیم الشان قوت کا اسٹیشن ہے جس سے اصفہان کی بے تار کی تار برقی اسٹیشن سے بلا واسطہ بات چیت ہوتی ہے۔ ان دونوں اسٹیشنوں کا فاصلہ تقریباً بارہ ہزار کیلو میٹر ہے جو پانچ ہزار سات سو میل کے برابر ہے۔ اسی قوت و عظمت کا دوسرا اسٹیشن اسپین میں ہے۔ ایک افریقہ میں اور ایک ساوین میں جس کا سلسلہ نیویارک سے ملتا ہے۔ امریکہ کا یہ اسٹیشن شروع جنگ میں بہت قوت نہیں رکھتا تھا لیکن نہایت پر اسرار طور پر اس کی قوت کو تگنا کر دیا گیا۔

اسٹیشن تین کھموں کی مجموعی حالت کو کہتے ہیں۔ ہر کھم ایک سو پچاس گز لمبا ہوتا ہے جن کو نہایت احتیاط اور استحکام سے گاڑا جاتا ہے۔

لڑائی شروع ہوتے ہی جرمنی کے تحت البحری تاروں کا سلسلہ دنیا کے تمام ممالک سے ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن انھوں نے بے تار کی تار برقی کے ذریعہ اس زبردست کمی کو پورا کرلیا۔

بے تار کی تار برقی کی ... قی موجیں بغیر زبا دنی کمی کے ہوا میں نہایت تیز حرکت کرتی ہیں۔ اور ایک سیکینڈ میں نوہزار میل مسافت طے کرلیتی ہیں۔ اور جس طرح آئینہ سورج کی روشنی اور کرنوں کو خط سیر سے منحرف کرسکتا ہے اسی طرح قوی ... کمزور تار کو منحرف کرتا ہے۔

جب چند تار برقیاں مشغول مخابرہ ہوں تو فطرتاً ان کی برقی شعاعیں فضائے محیط میں فوراً باہم مل جاتی ہیں۔ اور قوی اسٹیشن سب خبروں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

لڑائی شروع ہونے سے پہلے اس نقص کی ترمیم کے لیے ایک بین الاقوامی انجمن لندن میں قائم ہوئی تھی اور چھوٹی بڑی سلطنتوں کے نمایندے شریک ہوئے تھے یہاں یہ بات طے کی جاتی کہ ہر سلطنت کے لیے گھنٹے مقرر ہوجائیں جن میں سے اس تار برقی سے کام لینے کی اجازت ہو لیکن یہ انجمن ابھی طفلانہ اٹھکھیلیوں ہی میں تھی کہ عظیم الشان جنگ یورپ کا آفتاب طلوع ہوگیا۔ اور قدرتی طور پر انجمن ٹوٹ گئی۔ تمام ممبر رخصت ہوگئے۔ کیونکہ قرار و قیام کا اب کوئی موقعہ نہیں رہا تھا۔ جس خطرے سے بچنے کے لیے انجمن کی بنیاد ڈالی گئی تھی وہ بلائے ناگہانی کی طرح سر پر آگیا تھا۔

جرمنی نے جو دنیا کی قوی ترین اسٹیشنوں کی مالک ہے اس جنگ میں سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ جنگی محاذوں، فوجی مرکزوں۔ اور نائن، اسپین اور امریکہ کے اسٹیشنوں سے برابر روزانہ کی جنگی۔ پولیٹیکل۔ تجارتی اور اس کے علاوہ ہر قسم کی خبریں جرمنی کو پہونچتی تھیں۔ اور تمام مطبوعات اور فتح کی خبریں ہر ملک میں شائع کی جاتی اور پھیلائی جاتی تھیں۔

بڑے بڑے اسٹیشنوں کی شاخیں بھی قائم ہیں چنانچہ اتازونی میں چھتیس (۳۶)

میکسکو میں سولہ شاخیں ہیں اور اسی طرح شمالی اور جنوبی امریکہ۔ مشرق اقصیٰ۔ ٹرکی۔ ایران اور افریقہ میں کثیر التعداد شاخیں مخابرات کے لیے قائم ہیں جن کا نارن اور مایویل کے اسٹیشنوں سے براہ راست تعلق ہے۔

یہ تمام اسٹیشن اور اُن کی شاخیں درحقیقت میں کرسے کہ گیارہ گھنٹے ضرور کام کرتے ہیں اور طاقتور ہونے کی وجہ سے دوسرے فریق کی خبروں کو مقام مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی کھینچ لیتے ہیں۔ دوسرے فریق کی خبریں حاصل کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ نپولین کے اصول و قواعد جنگ میں سے ایک یہ بھی تھا، وہ کہتا تھا کہ "غنیم کے مضمحل کرنے کے لیے بہترین اور آسان طریقہ اس کی خبر رسانی کے سلسلے کو منقطع کر دینا ہے" اور اس قاعدے کی پابندی جرمنی نے جس خوبی سے کی وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

بے تار کی تار برقی کے اُن اسٹیشنوں کے تار بابوؤں کی حالت جو سمندر کے ساحلوں یا فوجی بندرگاہوں۔ جنگی جہازوں۔ اور قلعوں پر ہوتے ہیں عجیب حسرتناک ہے۔ وہ گھنٹوں تعلوں میں ہاتھ دبے کھڑے رہتے ہیں اور برقی شعاعوں کے تموج سے سمجھتے ہیں کہ ابھی تار برقی دشمن کے کام میں مصروف ہے۔ وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ ایک سکینڈ کی بھی مہلت ملے تو ہم کام لیں وہ اپنے اسٹیشن کے ضعف سے باخبر ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ دشمن کے کام کرنے کے دوران میں ہم خبر نہیں دے سکتے۔ مگر دشمن ذرا بھی دم نہیں لیتا اور دو دو تین تین گھنٹے گزرنے کے بعد کام کا وقت بھی گزر جاتا ہے۔ اس وقت تار بابو دل میں کہتا ہے ہمارا اسٹیشن محض بے مصرف چیز بنا دیا گیا ہے۔

انگریزی اسٹیشن بھی فرنچ ڈھانچ پر ہیں اور اُن میں بھی یہی نقص ہے دور کرنے کی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن نمایاں اور معتدبہ فائدہ نہیں ہوا۔ یہ مقولہ بہت موزوں ہے کہ بے تار کی تار برقی صرف جرمنی کی خدمت گزار ہے اور دوسروں کی خدمات سے استعفےٰ دیدیا ہے۔ (ترجمہ ماخوذ)

نظارۂ عبرت

ہیں بشر حرص و طمع کے دام میں اکثر پھنسے — جب یہی فطرت ہوا انسان کی تو وہ پھر کیا کرے

کل ہوس اس طرح پر ترغیب دیتی تھی مجھے — کیا ہی ملک روس ہے کیا سرزمین طوس ہے

سیر دریا باغ و بستاں میں لگے واں اپنا جی — غیب سے اے کاش وہ دولت جو تھی قارون کی

گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجے زندگی — شورِ بلبل اک طرف اک سو صدائے کوس ہے

سن کے یہ اس فکر میں تھا میں کہ اب کیا کیجیے — فکر عقبیٰ کی کروں یا لوٹوں دنیا کے مزے

اتنے میں عبرت یہ بولی اک تماشہ میں تجھے — چل کے دکھلاؤں جو قیدِ حرص کا محبوس ہے

میں یہ سمجھا لے چلیگی یہ گلستاں کی طرف — رہبری میری کرے گی باغ و بستاں کی طرف

لے گئی کمبارگی گورِ غریباں کی طرف — جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے

دیکھا یہ میں نے تو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا — میری گھبراہٹ کو پا کر جلد میرے پاس آ

مرقدیں دو چار دکھلا کر یہ عبرت نے کہا — یہ سکندر ہے، یہ دارا ہے، یہ کیکاؤس ہے

تھا کسی کو ان میں حاصل ربع مسکون کا خراج — ثلث دنیا کا تھا مالک کوئی اہل تخت و تاج

پوچھ لے ان سے تو جاہ و حشمت دنیا ہے آج — کچھ بھی حاصل تم کو غیر از حسرت و افسوس ہے

تھا سماں وہ عالمِ فانی کا جس پیش نظر — دفعتاً اک غیب سے آئی صدا جا کام کر

یاں کا عالم اور ہے کیا سوچتا ہے بے خبر — ہے یہ روحانی جہاں وہ عالمِ محسوس ہے

کہدے یوں ممنون سب سے جس سے ہے یاں مشتہر — چھوڑنا مت اتباع حضرتِ خیر البشر

ترک کر رہبانیت اور قوم کی خدمت تو کر — پھر تو یہ عالم بھی تجھ کو جنت الفردوس ہے

خواہش زیست

از

جناب صبیح الدین احمد صاحب بی اے ایل ٹی -

اشتداد عمر جو لذت زندگی کو کم کرتی ہے - تمناے حیات کو بڑھاتی ہے - جن خطرات کو ہم ایام شباب میں حقارت کی نظر سے دیکھنے کے عادی تھے - درازی عمر کے ساتھ ساتھ وہ نئے نئے خدشات سے مملو معلوم ہونے لگتے ہیں - کبر سنی کے دوش بدوش ہماری احتیاط بھی روز افزوں ہوتی جاتی ہے - یہاں تک کہ خوف ہمارے دل کا جذبۂ غالب بن جاتا ہے - اور زندگی کا بقیہ مختصر حصۂ ہستی کے اختتام کے ٹالنے یا بقاے حیات کے اسباب بہم پہونچانے میں صرف ہو جاتا ہے -

ہماری سرشت میں یہ ایک عجیب تناقض ہے جس سے عقلا بھی مستثنے نہیں اگر مستقبل کا قیاس ماضی پر کیا جاے تو نہایت بھیانک منظر نظر آتا ہے تجربہ بتلاتا ہے کہ حظوظ گزشتہ سے اصلی مسرت نہیں حاصل ہوئی اور احساس یقین دلاتا ہے کہ لذات ماضی - لذات مستقبل سے قوی تر تھیں - لیکن تجربہ کی تعلیمات لاحاصل اور احساس کی تحریکات بے حصول - امید جو ان دونوں سے قوی تر ہے - استقبال کو خیالی حسن و دلفریبی کا لباس پہنا کر سامنے کھڑا کر دیتی ہے - ایک مسرت موہوم ہکو اشارہ سے اپنی طرف بلاتی ہے اور ہارنے والے قمار باز کی مانند ہر جدید ناامیدی سے بازی کو قائم رکھنے کا شوق سوا ہوتا ہے -

ماحول سے ہم جس قدر آشنا ہوتے جاتے ہیں - اسی قدر ہمارا انس اس کے ساتھ ترقی کرتا جاتا ہے - ایک فرانسیسی فلسفی کا قول ہے کہ " میں ایک بوسیدہ

ستون کا اکھاڑا جانا بھی پسند نہ کروں گا جس سے میری آنکھیں سالہا سال سے آشنا ہیں۔" دل جن چیزوں کا عرصۂ دراز سے خوگر ہو جاتا ہے اُن سے اُس کو اُنس ہو جاتا ہے۔ وہ عادتاً ان کو دیکھنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ اور ان کی مفارقت اُس کو ناگوار گذرتی ہے۔ ضعیف العمر لوگوں کی طمع کی بھی بنیاد ہے۔ وہ دنیا اور اُس کی پیداوار سے محبت رکھتے ہیں۔ وہ زندگی اور اُس کے جملہ فوائد کو عزیز رکھتے ہیں نہ اس لیے کہ وہ باعثِ ازدیادِ عیش ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ مدت مدید سے ان سے آشنا ہیں۔

شنو انگ مقدس نے جب چین کے تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ تو فرمان نافذ کیا۔ کہ جملہ اسیران جو اُس کے متقدمین کی عہد حکومت میں ناانصافی کے ہاتھوں قید میں ڈالے گئے تھے آزاد کر دیے جائیں۔ منجملہ ان لوگوں کے جو اس عنایت خسروی کی منت گذاری کے لیے دربار شاہی میں حاضر ہوئے ایک معمّر مگر شاندار شخص بھی تھا جس نے خاقان کے قدموں پر گر کر یوں خطاب کیا:" جہاں پناہ آپ کی حضور میں ایک کمبخت بدنصیب شخص حاضر ہوا ہے جس کی عمر اس وقت ۸۵ سال کی ہے اور جو ۲۲ سال کی عمر میں اسیر زنداں کیا گیا۔ میں بالکل بے گناہ قید کیا گیا تھا۔ اور مجھے اپنی بے تقصیری کے اثبات کا ذرا بھی موقع نہ دیا گیا تھا۔ زاویہ زنداں کی تاریکی اور تنہائی میں مجھے ۶۰ سال سے زائد گزرے اور میں رنج و مصیبت کا خوگر ہو گیا ہوں جب سے آپ کے حکم سے مجھے تیرگی زنداں سے نکال کر آفتاب کی روشنی اور آزادی کی ہوا میں لایا گیا۔ شہر کے کوچہ و برزن میں دربدر خاک بسر پھرتا رہا کہ شاید کوئی دوست و غمخوار۔ مونس و مددگار مل جائے۔ جو مجھے پہچان سکے۔ مگر افسوس کہ میرے جملہ احباب اور اعزا راہی عالم بقا ہوئے۔ اور میں تنہا رہ گیا ہوں کوئی نام لیوا اور پانی دیوا باقی نہیں مجھے اجازت ہو کہ اپنی ناشاد و نامراد زندگی کا بقیہ حصّہ اپنے اگلے قید خانے میں گذاردوں

اس قید خانے کی دیواریں مجھے عالیشان سے عالیشان محل سے زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ اب اس دنیا میں مجھے زیادہ رہنا نہیں ہے۔ اور کسی طرح مجھے راحت نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ میں اپنی بقیہ زندگی اسی جگہ بسر کروں۔ جہاں میرے ایام شباب گزرے۔ یعنی اس زندان میں جہاں سے آپ نے از راہ کرم مجھے رہائی بخشی۔"

اس معمر آدمی کا انس قید خانہ کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا کہ ہمارا زندگی کے ساتھ ہم قید خانہ کے عادی ہوجاتے ہیں۔ اس کو بے اطمینانی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تاہم اسیری کی طوالت سے ہمارا انس اس کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ تعلقات میں تنوع اور استحکام پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے اُن کے انقطاع کلی و دائمی کا خیال اذیت پہونچاتا ہے۔ ہمارے نصب کردہ اشجار۔ تعمیر کردہ عمارات۔ ہماری اولاد اور لاتعداد و لاتحصا نعم و برکات جو رب کریم نے ہم کو مرحمت فرمائی ہیں سب کی سب ہم کو اس زندان آب و گل سے ایسا وابستہ کر دیتی ہیں۔ کہ مفارقت بہت تلخ معلوم ہوتی ہے۔ نوجوان کے لیے زندگی ایک نئے آشنا کے مثل ہے۔ ایک رفیق جس کی باتیں دلچسپ اور سبق آموز۔ اور صحبت مسرت بخش تاہم وہ اس کی چنداں قدر نہیں کرتا۔ معمر لوگوں کے لیے وہ مثل دوست قدیمی کے ہے۔ جس کے لطائف کو وہ بار بار سن چکے۔ اور اُن کی وقعت اُن کی نگاہ میں چچوڑی ہوئی ہڈیوں سے زیادہ نہیں۔ وہ اُن کی دلبستگی کے لیے کوئی نیا قصہ نہیں سنا سکتی۔ اور نہ حیرت میں ڈالنے کے لیے کوئی تازہ ترقی دکھلا سکتی ہے۔ تاہم حظ و لطف سے معرا ہونے کے باوجود وہ اس پر مرتے ہیں۔ اور بخیل [illegible] ہوئے خزانہ کو روز افزوں کفایت شعاری کے ساتھ صرف کرتے ہیں۔ اور [illegible] وقت سخت تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

عیدی

مجھ سے آوارۂ وطن سے نہ پوچھ
دن کٹے گا یہ عید کا کیوں کر؟

کیا غضب میرے دل پہ ڈھائے گا؟
شام غربت کے چاند کا خنجر

دل میں امید و بیم یارا نہیں
دیدے حیرت سے ہو گئے پتھر

گوش مشتاق جس کے ہوں وہ کہاں
دیدے مشتاق جس کے ہیں وہ کدھر؟

کوئی مونس نہیں رفیق نہیں
دل یہ بہلے گا کس کے ہاں جا کر

ہونگا میں اور کنج تنہائی
طفل اشک اپنی گود میں لیکر

یاس و حسرت کھڑی ہیں دلبیار
وار دلپہ کریں گی بڑھ بڑھ کر

میرے لب پر مگر یہ ہوگی دعا
جس کو کہیئے دوائے درد جگر

اے خدائے یگانہ و برتر
مالک الملک خالق اکبر

وحدہٗ لاشریک ہو بیشک
تیرا حقا نہیں کوئی ہمسر

ایک تو ہے ترے سوا سب ہیچ
اور برحق ہے تیرا پیغمبر

تجھ پہ تیرے حبیب پر قرباں
ایک کیا لاکھ جانیں بھی ہوں اگر

لاج میری دعا کی رکھ لینا
سر رگڑتا ہوں تیری چوکھٹ پر

میں اگر غم میں ہوں نہیں پروا
میں ہوں تنہا اگر نہیں کچھ ڈر

دل میں ہوتا ہے درد ہونے دے
میں تو یارب ہوں درد کا خوگر

پر مرے دوستوں کی بات ہو اور
اپنی رحمت کی کیجیو خاص نظر

عید ان کی سعید ہو یارب
چین سے ان کی زندگی ہو بسر

چین راحت خوشی نشاط مدام
ان کے بندے ہوں انکے ہوں چاکر

میں بھی خوش ہوں انہیں خدا کی قسم
خوش اگر ہیں سراج اور اکبر

منصوری

از

"الورد"

گرمیوں میں جاڑوں کی یاد تازہ کرنا ہو۔ برسات کا لطف اٹھانا ہو یا محض گرمی کی شدت اور تکلیف سے نجات پانا ہو تو (بشرطیکہ آپ خوش نصیبی سے غیر منکوح ہوں) آپ اپنی حبیب شریف سے صلاح کیجئے اور سیٹی میں "بھاڑ میں جائیں لیسے لیل ونہار" گاتے ہوئے پہاڑ پر پہنچ جائیے۔ ہندوستان میں ایک نہیں۔ دو۔ نہیں۔ خدا کے دیے بیسیوں پہاڑ ہیں جو اپنی شان ورفعت میں جواب نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں اگر نظر تیز ہو تو۔ پہاڑوں پر سے خدا دکھائی دے سکتا ہے ہندوؤں کے صاحبِ دل رشی اپنی عمر کا زیادہ حصہ اسی لیے پہاڑوں پر گذارا کرتے تھے۔ اگر نظر تیز کرنا ہو تو پہاڑوں کا کھلا ہوا راستہ ہے۔ ہر ڈاک گاڑی کسی نہ کسی پہاڑ پر یا دامن کوہ تک پہنچا سکتی ہے!!

ڈاک گاڑی میں تورکے تڑکے جب آنکھ کھلتی ہے تو جلوہ نظر آتا ہے۔ سبز سبز درخت لہلہاتی ہوئی کھیتیاں۔ فراٹے بھرتے ہوئے نالے۔ سر بفلک پہاڑیاں۔ سربسجود وادیاں اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں۔ دور پر ایک غیر استوار خط دکھائی دیتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے یہی منصوری ہے۔ گھنٹہ بھر کے بعد دیرہ دون آجائے گا ڈاک گاڑی کو "خیر باد" کہدی جائے گی۔ دیرہ دون سے راجپور تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ کوئی چار میل ہوگا۔ اور یہ مسافت موٹر یا تانگے میں طے کی جاتی ہے۔ راجپور سے منصوری تک گھوڑا لے جاتا ہے یا "ڈانڈی"!!

گاڑی سے اترتے ہی جو شخص ملتا ہے وہ کسی ایجنسی کا کارکن ہوتا ہے اور پوچھتا ہے "موٹر چاہیے یا تانگا؟" کرایہ کی شرح مقرر ہے جو غالباً زیادہ ہے۔ اگر کرایہ ٹھہرانے کی

عادت ہو اور جھگڑا کرنے میں لطف آتا ہو تو بہتر ین صورت یہ ہے کہ "ایجنٹ" کو اور اس کے سوال کو نظرانداز کر کے سواری کا انتظام خود کیا جائے مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ مجھ سے اور میری جیب سے عین حالت صلح میں اکثر جنگ ہو جاتی ہے۔ سفر کی حالت میں تو ایسا ہونا یقینی ہے۔ لہٰذا اسے جنگ کا نتیجہ سمجھیے یا میری کمزوریٔ دل کا ہونا یہی ہے کہ میں "ایجنٹ" کے ذریعہ سے سواری کا انتظام کرتا ہوں۔ شرح کی بحث و تکرار سے بچنا اگر فضول خرچی ہے تو کرایہ ٹھہرانے میں وقت کی بربادی ہے اور پھر تھوڑی سی سُبکی بھی۔ دونوں طرف سے مخالفت اور موافقت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن قصہ مختصر یہ اپنی اپنی طبیعت ہے۔ جو جس کو پسند ہو!!

راجپور سے منصوری تک گھوڑے کی سواری اس قدر پر لطف نہیں جس قدر "بیر بھٹی" سے نینی تال تک ہے۔ غالباً وجہ یہ ہے کہ منصوری کا راستہ بہت چوڑا ہے اور لطف وہیں آسکتا ہے جہاں سڑک تنگ ہو اور ہر قدم پر خوف ہو کہ اب گرے اور اب گرے اس کے علاوہ پہاڑی ٹٹو کی عادت میں داخل ہے کہ وہ ہمیشہ پہاڑی سے دور خندق ہی کی طرف چلتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شہسوار نہ ہو یا کسی کی نازک طبیعت سواری کی متحمل نہ ہو سکتی ہو تو "ڈانڈی" موجود ہے اور جیتے جی چار کے کندھوں پر جایا جا سکتا ہے۔ ڈانڈی ایک قسم کی ڈولی ہوتی ہے جو عیسائیوں کے تابوت یا چینیوں کی کشتی سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ ایک ڈانڈی میں چار سے لیکر سولہ قلی تک دیکھے گئے ہیں۔ کوئی قید نہیں اور نہ قلیوں کی تعداد مقرر کی جا سکتی ہے۔ یہ منحصر ہے اس کشش پر جس سے کہ بیٹھنے والے کو زمین اپنی طرف کھینچتی ہے!!

ڈانڈی لیجیے یا گھوڑا لیکن "ہاف وے ہاؤس" تک آپ تھک ضرور جائیں گے تھکان کا احساس ہو یا نہ ہو ڈانڈی کا قلی اور گھوڑا خود آپ کو مطلع کر دیگا کہ آپ تھک گئے ہیں۔ اس جگہ پر گھوڑے کو پانی پینے کی عادت ہے اور قلیوں کو سگریٹ پینے کی یہ عادت شاید

"ہاف وے ہاؤس" کے منتظمین نے کچھ دے دلا کر ٹالا لذی ہے اور اس کی بنا تجارتی اصول پر ہے یعنی آپ بھی "ریسٹوران" میں کچھ کھا پی کر اپنی ناقابل محسوس تکان کو دور کر لیجیے اگر بعض رسمی ہوٹل میں جانے سے مانع ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ حلوائی کی دوکان موجود ہے محض جدِ مرحوم کی فاتحہ خوانی مقصود نہ ہو تو پوری کچوری اور مٹھائی سے کام وہاں کی دعوت کیجیے یا چپل قدمی کرتے رہیے لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ یہاں قیام نہ ہو اور ایک معتد بہ رقم "بخشیش" راکب کی جیب سے مرکوب کی جیب میں منتقل نہ ہو جائے !!

اگر آپ کی باصرہ تیز ہے اور قوتِ سامعہ ہوشیاری سے کام کرنے کی عادی ہو تو موسیقی اپنی باوا آدم کے زمانہ والی وضع قطع میں ایک بارِ عظیم سر پر لیجاتے ہوئے دکھائی دے گی۔ یہ باربردار پہاڑی قلی لحن داودی سے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے موسیقیٔ عریاں کا نقشہ پیش کرتے ہوئے جاتے ہیں اور مذاقِ سلیم ان کے نغمہائے گوناگوں سے لذت یاب ہو سکتا ہے۔ پہاڑوں میں موسیقی بے معنی آواز کے ناموزوں اُتار چڑھاؤ کو کہتے ہیں جس کا مفہوم ممکن ہے کہ کچھ ہوتا ہو اور پہاڑی قوم کے لیے ضرور ہوتا ہوگا مگر میرے اور آپ کے لیے یہ موسیقی مجموعۂ مرموزات و مخففات ہے !!

مہاراجہ نیپال کی عظیم الشان کوٹھی سے بڑھ کر بارلو گنج کو سوائے آب و ہوا کے اور کسی سے غرض و مطلب نہیں۔ محض منصوری کا نظارہ بعید یا ہر سے موصول ہونے والے خطوط پر منصوری کا نام لکھا ہونا اس بات کا ثبوت دے کر کہ وہ منصوری میں ہے تسلی کرتا رہتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس شخص نے بارلو گنج کو منصوری کے حدودِ میونسپلٹی میں شامل کئے جانے کی رائے دی وہ اس شخص سے قریبی تعلق رکھتا تھا جس نے عدن کو احاطۂ بمبئی میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ کم از کم یہ آبادی ہر جانے والے کو اطمینان ضرور دلا دیتی ہے کہ منصوری آگیا۔

"بھرے پانی" پر بھی گھوڑا پانی پیتا ہے لیکن اس عادت میں تجارتی اصول شامل

نہیں۔ آپ نہیں تھکتے۔ محض گھوڑا تھکتا ہے۔ اس لیے آپ کو اُترنے کی ضرورت نہیں۔
یہاں سے "شارلیویل" اور "سیوائے" ہوٹل کا راستہ جدا ہوتا ہے۔ دو نوں
ہوٹل ہر لحاظ سے اپنے آپ کو خلد بریں ثابت کرنے میں مسابقت کا کوئی پہلو اٹھا نہیں
رکھتے۔ یہاں ناکتخدا اصحاب کے لیے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ہمیشہ طیار رہتی ہیں۔ لیکن
بیڑیاں ڈالنے سے پہلے جذبۂ گرفتاری اور خواہش قید کے صداقت وکمال کا امتحان شرط
ہے۔ چنانچہ سال میں کئی مرتبہ امتحان کی تاریخیں مقرر کی جاتی ہیں۔ اور آخر سال میں
نتائج شائع کیے جاتے ہیں کہ اتنے امیدوار بہ تفاوت مدارج سزایاب ہوکر پابہ زنجیر و
گلو در رسن ہوئے۔ رومتہ الکبریٰ کے متعلق مانٹسکیو نے لکھا تھا "اس میں دنیا کی آبادی
غلام ہوکر داخل ہوتی تھی اور آزاد ہوکر نکلتی تھی" کیا میں ان الفاظ کو مستعار لیکر "شارلیویل"
اور "سیوائے" کے متعلق عرض کر سکتا ہوں کہ "یہاں ایک آزاد اور حکمراں قوم کے افراد
آزاد ہونے کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں اور غلام ہونے کی حیثیت سے نکلتے ہیں[1]!!

"لنڈھور" اور "نخچر خانے" کے رہنے والوں کے علاوہ باقی سب مسافروں کی رہنمائی
راجپور والی سڑک کرتی ہے جو آگے بڑھکر "تصویر گھر" کے پاس سے "مال روڈ"
بنجاتی ہے اور نام کے علاوہ صورت بھی بدل لیتی ہے۔ "نخچر خانے" کے متعلق محض یہ
کہدینا کافی ہے کہ اس میں گندھک کا چشمہ موجود ہے۔ اب یہ بات کہ گندھک جو اس
چشمے کے پانی میں محلول ہے کبریت احمر ہے یا اصفر نہیں بتایا جا سکتا۔ مگر باعتبار خواص و
نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ چشمۂ حیوان یہی ہے۔ سکندر کا ہندوستان میں آنا تاریخی شہادت
سے ثابت ہے۔ ممکن ہے کہ اس چشمۂ حیوان کی تلاش میں آیا ہو۔ چشمۂ حیوان اس کو صرف اس لیے

---

[1] مذکورۂ بالا ہوٹل ہر سال صلائے عام دے کر مشتہر کرتے ہیں اور فوقیت ثابت کرتے ہیں کہ گزشتہ سال ہمارے
یہاں اتنے نلیع ہوئے اتنی دعوتیں ہوئیں اور اتنی شادیاں۔

ہی نہیں کہا کہ یہاں کا پانی معین ہضم و مہرِ حیات ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہاں ہزار وں نچرامد گدھے لاکھوں من پانی اپنے اوپر لادھکر "ڈپو" کو لے جاتے ہیں۔ اس جگہ کا نام دھوکہ دینے والا ہے لہذا وہاں کے رہنے والے خودداری قائم رکھنے کے لیے ۔ ہمیشہ کلکٹر صاحب کو عرضی دیتے ہیں کہ نام بدل دیا جائے مگر شنوائی نہیں ہوتی۔ تند عو ییں کم خرچ اور بالانشین آگار ہزار و شیب بھرے ہوئے خاک نشین ہندوستانی رہتے ہیں۔

بساط خانے کے علاوہ پھل اور ترکاری کا بازار بھی ہے۔ ان کی خریداری کے لیے بڑے بڑے خود نما اور خود دار اس بازار کو زینت بخشا کرتے ہیں!!

کہنے کے لیے منصوری بہت بڑا شہر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فتح و نصرت کے ڈنکے ہر وقت "کلبری" اور "لائبریری" میں بجا کرتے ہیں۔ یہ حصہ منصوری اس پہاڑ کی جان ہے اور وہی معنی رکھتا ہے جو لندن کے لیے "ویسٹ اینڈ"۔ منصوری کی پہاڑیاں اگست سے پہلے قدرت کی صناعیوں سے محروم اور مادرزاد برہنہ ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ پہاڑ خصوصیت کے ساتھ سیاہ رنگ کا ہے اس لیے آخر جولائی تک کوہستانی سلسلہ ہاتھیوں کی ایک لمبی قطار معلوم ہوتا ہے لیکن پہلے برساتی غسل کے بعد سیاہی سبزی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ رنگ برنگ کے پھول مع اپنی خوشبوؤں کے سبزۂ خوابیدہ سے سر نکالتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ رعنائی و خوشنمائی کی نمائش ہوتی ہے۔ غالباً یہاں کے موسم بہار کا اتنا بدیہی اثر ہوتا ہے کہ منصوری آتے ہی لوگ رنگ کے اندھے ہو جاتے ہیں سفیدی و سیاہی میں تمیز نہیں کر سکتے۔ رنگ میں امتیاز بہت کم کیا جاتا ہے۔ یہ فرق اگر کسی قدر دکھائی دیتا ہے تو "بینڈ اسٹینڈ" کے قریب لائبریری میں جس کے ایک معاون اور سرپرست مہاراجہ کپورتھلہ بھی ہیں جو باوجود اختیار رکھنے کے لائبریری میں قدم نہیں رکھتے شاید اس لیے کہ کچھ رنگ کا معاملہ اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ اس لائبریری میں علمی ذخیرہ بےحد و بےحساب ہے اور اندیشہ یہ ہے کہ سیاہ رنگ کا مزید اضافہ کل ذخیرۂ

علمی کے اوراق پر سیاہی نہ پھیر دے یا ممکن ہے کہ پالٹیکس کا راز اسی جگہ بند ہو۔ بہرحال لائبریری کو چھوڑ کر سفید و سیاہ ہر جگہ مخلوط ہے۔ البتہ شان ہر جگہ نمایاں ہے۔ سفیدی ممکن ہے کہ مؤدب فاصلہ پر رہنا چاہتی ہو لیکن سیاہی رسوخ پیدا کر لیتی ہے۔ سفیدی تو سیاہی بن نہیں سکتی۔ خوف ہے کہ کہیں سیاہی سفیدی میں تبدیل نہ ہو جائے اچھائی سے زیادہ زود اثر برائی ہوا کرتی ہے۔ رہنمایانِ قوم و ملک ابھی سے انتظام کرلیں ورنہ زُلف کے سر ہونے تک خدا جانے کیا ہو۔!!

اگر آپ کو قلی سے زائد اپنی ٹانگوں پر اعتماد ہے یا چہل قدمی کو زیادہ باعثِ تفریح سمجھتے ہیں۔ یا ڈاکٹر صاحب نے ٹہلنے کو آپ کی صحت کے لیے سب سے زیادہ ضروری بتایا ہے تو آپ بیٹنگ ہ مال روڈ" اور "کیلیس بیک روڈ" کی پوری مسافت پر قدم رنجہ فرمائیں مگر دورانِ سیر میں "رکشا صاحب" "رکشا صاحب" کی سامعہ نواز آواز کے لیے آپ کے کانوں کو تیار رہنا چاہیئے "رکشا صاحب" نہ کسی کا نام ہے نہ خطاب بلکہ "صاحب اگر آپ سوار ہونا چاہیں تو رکشا حاضر ہے" کا مخفف ہے۔ اگر جولیس سیزر اور سر چارلس نیپیر زندہ ہوتے تو اس تخفیف اور تلخیص کی داد دیتے[1]۔ رکشا ایک قسم کی دو پہیہ گاڑی ہوتی ہے جس کو بجائے حیوانِ مطلق کے حیوانِ ناطق چلاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ سنگل اور ڈبل۔ سنگل رکشا میں بیٹھنا اظہارِ ریاست کے علاوہ بیکینی و دوگوش ہونے کا ثبوت ہے۔ جب دو ہوں تو ڈبل رکشا بھی اسی طرح ضروری سمجھا جائیگا جس طرح "ڈبل بیڈ" کرایہ کی رکشا والے قلی وردیاں نہیں رکھتے

---

[1] جولیس سیزر کا پیغام تاریخ میں محفوظ ہے جو اُس نے بجائے کسی طویل ڈسپیچ کے دارالسلطنت روم کو روانہ کیا تھا جس کا یہ مفہوم تھا "میں آیا۔ میں نے دیکھا۔ اور میں نے فتح کیا یا VINI VIDI VICI نیپیر نے جب ملک سندھ کو فتح کیا تو ولایت کو محض اس قدر اطلاع دی PECCAVI جس کے انگریزی میں معنی یہ ہوئے I HAVE SINNED یعنی (سندھ) کا تلفظ تلمیح سے مقصود ہے "میں نے گناہ کیا" یا بالفاظ دیگر "میرے پاس سندھ ہے"۔

جس رکشا میں قلی وردیاں پہنے ہوئے ہوں۔ سمجھ لیجیے کسی بڑے آدمی کی ہے۔ ہر یورپین، سفید پوش ہندوستانی راجہ یا نواب کے ہی خطاب سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ مجھے کوئی راجہ کہے نواب کہے۔ صاحب کہے۔ یہاں تک کہ خان بہادر یا خان صاحب کہے۔ سب ضبط کر سکتا ہوں۔ لیکن اگر کوئی مجھے "بابو" کہے تو میں ضبط نہیں کر سکتا "بابو" سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ دہلی، آگرہ، منصوری اور ہر ریلوے اسٹیشن کے قلی یقیناً ملازم اُسترا ہیں کہ بابو کہکر بیچارے منڈ ومریخان اور بے گناہ مسافروں کی دل آزاری کرتے ہیں۔ بعض قیافہ شناس قلی "رکشا صاحب" کہنے سے پہلے سنگل یا ڈبل بھی کہتے ہیں۔ سنگل کہا جائے تو خیر ورنہ ڈبل رکشا اپنے پیٹنے سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ آپ کی ۔ تہذیب اور "معیت" آپ کو مجبور کر دے گی۔ "رکشا صاحب" یا ڈبل کی گالی ہے جو پھر کر دیکھنے والے کو لگتی ہے۔ آپ نہ دیکھئے۔ جواب نہ دیجیئے اور چلے جائیے مگر قدم قدم پر "سلام حضور" سے سابقہ پڑے گا اور ایک خط آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ "سلام حضور" نامہ بر قلی ہوتا ہے جو نا ہمارے شوق کی منزل مقصود کا نام ونشان خط دکھا کر معلوم کرنا چاہتا ہے "سلام حضور" سے رہائی پانے کے لیئے رکشا وغیرہ میں بیٹھنے کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ لباس تبدیل کر لیا جائے اور یہ لباس ملازموں کا ہو یا قلیوں کا ہو۔ تبدیلِ لباس میں اگر بیس و پیش ہو اور ہونا چاہیے تو میری طرح کہدیا کیجئے۔ "یہ خط ہمارا نہیں ہے"

"یہ سچ ہے کہ بخشیش" دنیا کے کسی قانون مندرجہ مجریہ حکومت کی رو سے واجب الادا نہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ ہر حکومت کی قلمرو میں عموماً ہمیشہ اور خصوصاً اس زمانہ میں ایک ایسے دستور کی رو سے جو قانونِ غیر مندرجہ کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے واجب الوصول ہے۔ اگر بخشیش فوراً اور بخنداں پیشانی ادا کر کے داد و ستد کا انفصال نہ کر دیا جائے

تو "وا ہِب بخشیش" کو اختیار ہے کہ "مدیونِ بخشیش" کو جتنی دیر تک چاہے پریشان کرے اور جس قدر تفصیر خدمات چاہے کرے تاآنکہ "مدیون بخشیش"، "رقم بخشیش دیکر اور بہ نقرہ دو حرف بہ اکسرا اپنا پیچھا چھڑا ئے۔ کرا یہ سے زائد بخشیش دینا بھی قلی کو مطمئن نہیں کرسکتا۔ کم از کم میں تو ہمیشہ اس کوشش میں ناکام رہا ہوں اور کامیاب بھی ہوا ہوں تو ڈانٹ دے کر۔ ایک سگرٹ کا عطیہ (جس کا شمار بخشیش کے تحت میں نہیں) جادو کی چھڑی کا کام کرجائے گا پہاڑی قلی ایک ' ہمہ جا حاضر ' اور ' ہر کار کن ' ہستی ہے جس کے بغیر پہاڑی زندگی بے کیف ہے۔ مگر یہ ہستی اُسی وقت تک قلی ہے جب وقت تک کسی کام پر معمور ہو۔ بیکاری کی حالت میں اس کا خطاب " فالتو " ہے۔ پہاڑ کی آب وہوا نے اس لفظ کو ذرا تندرست بنادیا ہے۔ دہلی والے " فالتو "، بولتے ہیں اور اس کا مفہوم ایڈیشنل آنریری مجسٹریٹ یا منصف کی ذات گرامی بخوبی سمجھا سکتی ہے۔ صحیح مصرف نکال کر اُردو پر احسان کیا گیا ہے۔ حامیانِ اردو ممنون ہوں اور تسلیم نہ کریں یہ دوسری بات ہے!!

شام کے وقت " بینڈ اسٹینڈ " کی طرف ہر تیسرے روز خلقت کشاں کشاں جاتی ہے اور رکشا کی لیں ڈوریاں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ سیرکنان جماعت میں مجھے جو چیز متوجہ کرتی ہے وہ ' ساریاں ' ہوتی ہیں۔ جب سے مولوی اور پنڈت ضلع کی کلکٹری اور ہائی کورٹ کی ججی پاکر صاحب لوگوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے لگے ہیں۔ ساریوں نے بھی یہ طے کرلیا ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ بھی " سلیے " کے قدم بہ قدم نہ چلیں۔ بمبئی میں تو "چوپاٹی" اور "اپالو بندر" پر شام کے وقت ساریوں کی تعداد سایوں کی تعداد سے وہی نسبت رکھتی ہے جو موجودہ کونسلوں میں " آفیشل " ممبروں کی تعداد " نان آفیشل " ممبروں کی تعداد سے۔ مگر منصوری ابھی ترقی کرکے اس نقطے تک نہیں پہنچا ہے۔ وہاں ابھی ساریوں کی تعداد سایوں کی تعداد سے مساوی بھی نہیں ہوئی ہے۔ اپنے معزز دوست مسٹر آئیر (سابق ایڈیٹر ایڈوکیٹ لکھنؤ اور موجودہ سب ایڈیٹر انڈیپنڈنٹ الہ آباد) کی طرح میں بھی " ہوم رول " ہوں مگر خیالات میں تھوڑا سا

فرق ہے۔ وہ پھول کے لیے خود نمائی مزدوری سمجھتے ہیں اور میں خوبصورتی کا ساز اس کی بُو میں پاتا ہوں۔ میرے ایک مکرم و محترم اور پراونشل سروس کے معزز رکن جن کا اخلاق ہمیشہ آزادی کا ضامن ہے۔ سالِ گذشتہ ایک شام کو مال روڈ پر ٹہلتے ہوئے قدرت کی صنعت کاریوں کے نظارے میں محو تھے کہ اُن کی کلائی کی رسٹ واچ ایک معزز ساڑی میں اُلجھ گئی۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو منصوری سے "ساپا" غائب ہو جائیگا۔ اور ساریاں ہی ساریاں نظر آئینگی۔ خیر۔ یونہی سہی۔ مگر۔ فغاں زپردہ نشینان کہ پردہ دارانند۔ یہ ناقابلِ برداشت ہے اور میں نہیں دیکھ سکتا کہ رکشا اور ڈانڈی پر پردہ ڈالا جائے اور پردہ میں سے جھانک کر نظارے کو خراب کیا جائے اور گناہ بے لذت کی خاطر قلیوں کو بیکار مزدوری دی جائے۔ زنانہ رسالوں کے ایڈیٹر یا "روزانہ ہمدم" کے نامہ نگار مجھ سے اچھا ان مسائل کو سمجھ سکتے ہیں لہذا اس کی تحلیل و تحقیق کے وہ ذمہ دار ہیں!!

لائبریری کے سامنے بینڈ اپنی گتیں اُڑاتا ہوتا ہے اور مال روڈ۔ کیملس بیک روڈ اور شارلیویل والی سڑک کا سیلابِ حسن 'سیوائے کیفی' اور 'وکرائیٹیرین رسٹوران' میں جمع ہو جاتا ہے۔ بینڈ کی آواز اشتہار کو بڑہاتی ہے یا جار میں لطافت پیدا کرتی ہے۔ بہرحال شاہی زمانے کی یاد دلاتی ہے جبکہ ہر کھانے کے وقت باجا بجا کرتا تھا۔ مگر بینڈ میں کان سے زیادہ آنکھ محظوظ ہوتی ہے۔ یہاں کی موسیقی کا اثر دل و دماغ پر بصارت کے ذریعہ سے ہوتا ہے!!

رات کے وقت منصوری اپنے سیاہ ریشمی برقع میں سے بجلی کی آنکھوں سے مجھے گھورتا ہے اور میں مجنونانہ اپنے آپکو تاریکی میں چھپاتا پھرتا ہوں۔ راہ میں تقریباً ہر گھماؤ پر اُتار چڑہاؤ اور ہر مخدوش مقام پر غریب میونسپلٹی نے دمیونسپلٹی ہمیشہ اور ہر جگہ غریب ہی ہوا کرتی ہے) رکشا والوں کی ہدایت کے لیے نوٹس بورڈ لگا دیے ہیں "خطرہ ہے آہستہ چلاؤ" لیکن تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ خطرے کے اور بھی بہت سے مقامات ہیں جہاں اس قسم کے نوٹسوں کی سخت

ضرورت ہے کہ گرالابیان نسیبلی خطے کے اُن مقامات سے بھی باخبر ہوں اور ضرور باخبر ہیں سوائے اُن حضرات کے جن کا زمانہ ملازمت قریب اختتام ہی، تو نوجوانوں پر احسان ہوگا اگر اس کمی کو بھی پورا کر دیں ۔ میرے ایک دوست اس نوٹس بورڈ کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ "آہستہ چلاؤ" سے مدعا مقابلہ کے لیے طیار رہو جانا ہے اگر یہ صحیح ہے تو اس خطرے سے کون بچنا چاہتا ہے ۔!!

تصویر گھر میں بھی مجمعُ رنگین کی بہار رہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ تصاویر متحرکہ روشنی میں نہیں دکھائی جا سکتیں اور تاریکی پر روشنی ڈالنا کوئی شاعری نہیں ۔ اتنا جانتا ہوں کہ "پکچر پیلس" کے تماشہ بیں حضرات مختلف قسم کے ہوتے ہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر وہ ہیں جنھیں ذوقِ انتظار ایفائے عہد ۔ یا تقیُّن وقت کشاں کشاں وہاں پہنچا ہے اس کششِ جذب و اتصال کے لئے پکچر پیلس سے بہتر کوئی مقام نہیں ہو سکتا !!

"بلیرڈ روم" ایک دو نہیں بہت سے ہیں ۔ لیکن ہر جگہ تفریح وہی ایک ہے ۔ کم از کم دو آدمی ڈنڈے ہاتھوں میں لیئے ہوئے میز کے ارد گرد ہر وقت قربان ہوتے رہتے ہیں ڈنڈے سے مار کر اپنی گیند کو ۔ دو گیندوں سے لڑا دیا ۔ سرخ گیند کو یا اپنی گیند کو پاکٹ میں ڈالدیا ۔ بس یہی کھیل ہے اور یہی تفریح ۔ جو بات سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ساتھی کی گیند پاکٹ میں ڈال کر نمبر لینے کے ساتھ ساتھ معافی مانگی جاتی ہے ۔ اس سے زیادہ افسوس اور شرمندگی کی مضحکہ خیز مثال اور کیا ہو سکتی ہے ۔ واقعی اگر کوئی عیب ہے تو پھر نمبر لینے کی کیا ضرورت ہے ۔ بلیرڈ میں کھیلتا ضرور ہوں گو مجھے مہارت نہیں لیکن اپنے ساتھی سے معافی مانگنے میں مجھے کمال ہے معافی مانگنا اگر ایثارِ نفس اور اقرارِ جُرم کا ثبوت ہے تو میں اپنی قوم کو ایسی معافی کی تلقین کر کے ایک دن ضرور لیڈر بن جاؤں گا ۔ کیونکہ جانتا ہوں کامرانی اور حکمرانی کی کُنجی یہی معافی ہے !!

یادش بخیر ! مست اور بیہوش کر دینے والا "رِنک" (RINK) بہ لحاظ اپنی وسعت کے

مشرق میں اپنا جواب نہیں رکھتا - یہ کوہ وقار عمارت - مخزنِ دلکشی - اپنے مخصوص فن کے علاوہ تفریحِ متحرک - نالج - اور تماشوں کے لیے بھی وقف ہے - پہیے دار نعلین کو "اسکیٹس" کہتے ہیں جن کو جوتوں میں باندھ کر نیوٹن کے اصول ثانی کو ثابت کیا جاتا ہے - توازن میں ذرا فرق ہوا اور زمین بوسی کے لیے انسان مجبور ہو گیا - واصلِ زمین ہو کر جلدی سے ادھر ادھر دیکھ لینا اور دیکھ کر مسکرا دینا آداب میں داخل ہے اور خفت مٹا دینے کے لیے ہنس دینا بہترین اصول بھی ہے - اسکیٹس باندھ کر ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جانا ایک نظارہ ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے - یہی وجہ ہے کہ رنک کے مرتبوں میں دیکھنے والوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہوتی - ایسا معلوم ہوتا ہے - کوئی مست میخوار نہایت تیزی سے - ناقابلِ محسوس حرکت کے ساتھ جھومتا چلا جا رہا ہے یا ایک دریا ہے جو انتہائے جوش میں ادھر ادھر موجیں مارتا ہوا بہہ رہا ہے ایسے ایسے مست اور ایسے ایسے دریا جب ایک نہیں ہزاروں ہوں تو دل میں لہر نہ اٹھے کیا معنی ؟ - اسکیٹنگ کے وقت 'رنک' ایک تختہ گلہائے رنگیں ہے جن کے ساتھ ہوا اٹھکھیلیاں کرتی ہوتی ہے اور ہوا کی دیوانگی آموز لہروں سے رنگ برنگ کے پھول جھومتے ہوتے ہیں - ورزش و تفریح کے خالص مغربی خیال کے اس دارالعمل میں بھی نیلگوں ساری کی حکومت دیکھ کر میرے تعجب کی کوئی حد نہیں رہتی - جس طرح سول سروس کے کامیاب امیدواروں کی فہرست میں مسٹر خان یا مسٹر شاستری کے نام پڑھ کر ایک ہندوستانی محب وطن کا دل جذباتِ فخر و مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے "دوسائے" کے مقابلہ میں ساری کو بازی لیجاتا دیکھ کر میرا دل بھی اسی جذبۂ فخر و مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے - ایک تتلی ہے جو نہایت نزاکت کے ساتھ اپنی سبک پروازی کا دعویٰ مع ثبوت پیش کرتی ہے - خوشنما پھولوں میں خوشبودار پھول بغیر رنگ جمائے ہوئے نہیں رہ سکتا - مقاومتِ خاموش یقینی ایک دن کامیاب ہوگی -

سودیشی بدیسی سے فوقیت لے جائے تو بعید نہیں ۔ حامیانِ نسواں غالباً یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ یہ سہرا صنف نازک ہی کے سر رہیگا !!

رنک میں جاذبیت ضرور ہے لیکن " تفریح کیا ہے ؟" میں نہیں سمجھ سکتا۔ ایک رنگین ادا سے یہی سوال کرچکا ہوں جس نے جواب تو کچھ نہیں دیا مگر اسکیٹ کر کے بتا دیا اور یہ بہترین جواب تھا -!!

" اسکیٹنگ جھمکھانوں " کا - ناچ کا اور اُن تمام تفریحوں کا جو " رنک " میں میسر آسکتی ہیں میں کچھ تذکرہ نہیں کروں گا - خوف ہے کہ یہ مضمون لاجواب اور لاثانی نہ بن جائے اس لیے کہ اس تذکرے میں میرے دل کی تاریخ پوشیدہ ہے جس کو میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا !!

اِن مشاغلِ اوقات کُش کے علاوہ منصوری اپنے گرد و پیش کے نظارہائے نظر فروز سے مالامال ہے ۔ قرب وجوار میں آبشار اور دوسرے قسم کے مقاماتِ تفریح قابلِ دید ہیں جہاں قدرت بھی اچھی طرح کھُل کھیلی ہے ۔ مجمعِ احباب کے ساتھ پا پیادہ یا کسی سواری پر سیر و تفریح کے لیے جانا اور جنگل میں منگل کرنا یہاں کا معمول ہے ہر تفریح گاہ اپنے زائرین کے نام و نشان بتا سکے اور چشم دید واقعات بیان کر سکے تو یہ تاریخ عجوبۂ روزگار ہو - پتھر پتھر بجائے خود ایک تاریخ ہے ۔ نام و نشان نواب بھی درختوں پر - اور چٹانوں پر کھُدے ہوئے مل جاتے ہیں ۔ تاریخ کے اگر آپ ذمہ دار بنا چاہتے ہیں تو قیاس کر لیجئے !!

سیرِ صبحگاہی - یعنی علی الصباح دو تین میل کا چکر لگا آنا ایک دوسرا مرض ہے اور کہا جاتا ہے کہ تندرستی کے لیے نہایت مفید ہے ۔ ممکن ہے کہ ہو لیکن رات کے دو بجے تک تماشا وغیرہ دیکھنے کے بعد لذتِ خوابِ سحر کچھ اور ہی چیز ہے !! -

ناممکن ہے کہ منصوری سے جی اکتائے ۔ چڑھاؤ اور اُتار کبھی تھکا نہیں سکتے ۔ کہتے ہیں چڑھائی پر چڑھتے وقت دم پھول جاتا ہے ۔ میں اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں

البتہ آتے وقت پہاڑ لیاں ضرور بھر جاتی ہیں۔ جبکہ جبر ... کی چڑھائی جائے تو اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ واپسی میں گھوڑے کی سواری تھوڑی ... سڑک پر بیٹھنا معیوب ہے اور رکشا آخر تک جا نہیں سکتی۔ لہذا پیدل ہی اترنا ہوگا۔ پہاڑ لیاں یقینی بھر جائیں گی اور دل ... ٹکیہ پر بیٹھ گیا۔ یہ ہے وہ منصوری ... کا ... واپس آنا معمولی بات نہیں پیچھے کو دیکھتے دیکھتے اور گردن پھیر پھیر کر ایک ایک ... یاد کرتے ہوئے ہاف وے ہاؤس تک آجائیے۔ وہاں غم غلط کرنے کے سب اسباب مل جائیں گے۔ اس مرتبہ واقعی تکان ہوگی۔ راجپور آکر سواری لیجئے اور ڈیرہ دون پہنچ کر اب وہاں سے بھی رخصت ہو لیجیے۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا !!!

مکان پہنچ کر گرمی ستائیگی اور گرمی سے زیادہ منصوری کی یاد۔ نتیجہ
کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ منصوری کبھی ہرگز نہیں جانا چاہیئے

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست !!

اک شب۔ سحر سے پہلے تاروں کی روشنی میں
آشفتہ سر۔ جہاں کی خوابیدہ خامشی میں

چرخ بریں پہ ٹوٹا ننھا سا اک ستارہ
اڑتا ہے آگ میں سے جیسے کوئی شرارہ

اس کشتۂ فنا نے یوں ٹوٹ کر فلک پر
اس ... بن بگڑ کر یوں جاں سے گزر کر

حل کر دیا ذرا میں اسرار زندگی کو
جو فلسفہ۔ نہ اب تک۔ سمجھا سکا کسی کو

’’ادیتا شافی‘‘

غزل کی شاعری

از

(جناب قاضی غلام امیر صاحب قبلہ - امیرؔ)

ہے ذہن بھی کند اور طبیعت بے کیف — حیراں ہوں نقیب کے لیے کیا لکھوں

کیا "منشی جی"[1] کے گھر کا بھانڈا پھوڑوں — اور اپنے نام کا معمّا لکھوں

یا حسن فروش گانے والوں کے لیے — ٹھمری - ٹپّا - کوئی ترانا لکھوں

اندر کی سبھا لکھوں امانت کی طرح — یہ بھی - نہ سہی - کوئی ڈراما لکھوں

ہو جائے بیک کرشمہ دو کار - اگر[2] — تو نعت کا منقبت کا خمسا لکھوں

جو ایک ہی شعر میں بہل جائے نقیب[3] — تو اکبر نغز گو سے اچھا لکھوں

کیوں ہجو لکھوں کسی کی مفتی بن کر[4] — کچھ نقد ملے تو ہجو مُلّا لکھوں

حاضر ہوں عذر کچھ غزل میں بھی نہیں — پر فکر یہ ہے غزل میں کیا کیا لکھوں

پیری میں عاشقی کو بدنام کروں — فرضی معشوق کا سراپا لکھوں

جب مارِ سیاہ زلف و گیسو ٹھیرے — تو اُس بُتِ شوخ کو سپیرا لکھوں

معصوم کمر سہی - سر... ں کو مگر — دو سلسلۂ کوہ ہمالہ لکھوں

میخانہ ہے چشمِ یار و مسجد ابرو — دونوں میں ضد ہے کس کو اچھا لکھوں

ٹھیری جو نگاہِ تیز نوکِ نشتر — تو آنکھ کو نشتروں کا ڈبّا لکھوں

---

[1] مضمون نمبر سات صفحہ سترہ نمبر ایک جلد ایک کی طرف اشارہ ہے (یعنی آنریری مجسٹریٹ)

[2] صفحہ ۲۴ نمبر ۳ جلد ۱ ملاحظہ ہو

[3] صفحہ ۳۲ نمبر ۳ جلد ۱ ملاحظہ ہو (گرامی نامۂ لسان العصر حضرت اکبر)

[4] صفحہ ۳۰ نمبر ۳ جلد ۱ ملاحظہ ہو

بلبل کا پتہ نہیں۔ کہاں ہے کیا ہے ۔۔۔ کیا بلبلِ باغ کو بھی عنقا لکھوں
لیکن اسے مان کر گلوں کا شیدا ۔۔۔ گلچیں کے ظلم کا فسانا لکھوں
کنٹر ہو، گلاس ہو، کٹورا ہو مگر ۔۔۔ میں سب کو جامِ بزم آرا لکھوں
بجلی کی روشنی ہو یا گیس کی ہو ۔۔۔ اِن سب کو شمع کی تجلّی لکھوں
فرضی اک دشت نجد میں قیس بنوں ۔۔۔ اشعار میں خانہ سازِ لیلیٰ لکھوں
مُہمل ہو تو ہو، مگر ہو شعرِ دقیق ۔۔۔ سادہ سی بات بھی مُعمّا لکھوں
پھر اپنے ہی شعر کے سمجھنے کے لیے ۔۔۔ غالب کی روح کو عریضہ لکھوں
منظور ہے لاکھ بار مرنا جینا ۔۔۔ اُس بت کو کسی طرح مسیحا لکھوں
یہ بھی کوئی بات ہے کہ اک شخص کو میں ۔۔۔ قاتل لکھوں۔ کبھی مسیحا لکھوں
اک بادہ فروش کی خوشامد میں عبث ۔۔۔ زاہد پر۔ شیخ پر۔ تبرّا لکھوں
خشتِ خُمِ مے کو سنگِ اسود کہہ کر ۔۔۔ ساقی کے میکدے کو کعبہ لکھوں
میخوار نہیں۔ مگر غزل کی خاطر ۔۔۔ خود آپ کو میکشوں کا قبلہ لکھوں
دستارِ زہد کا بہلائے مے میں ۔۔۔ ساقی کے نام رہن نامہ لکھوں
کعبہ میں پھروں کبھی کلیسا میں رہوں ۔۔۔ موقع ہو تو دَیر کا قصیدہ لکھوں
اخلاق کا پاس ہو نہ مذہب کا خیال ۔۔۔ جو کچھ جی چاہے بے محابا لکھوں
قسمت سے گلہ ہو۔ آسماں سے شکوہ ۔۔۔ لکھوں اور حد سے بھی زیادہ لکھوں
جب کذب و دروغ سے ہو تزئینِ غزل ۔۔۔ شاعر کو نہ کیوں بڑا دروغا لکھوں
گرگٹ کی طرح سے رنگ بدلوں لاکھوں ۔۔۔ خود اپنا آپ ہی تماشا لکھوں
پارینہ ہو گیا غزل کا ساماں ۔۔۔ مضمون لکھوں تو کیا انوکھا لکھوں

جب رنگِ غزل یہ ہے تو کیا لطفِ غزل
بہتر ہو غزل سے باز دعوی لکھوں

افکار آزاد

(از علامہ آزاد سبحانی)

وحشت ہے دلِ زار کو۔ سمجھا دو کہ تھم جائے
جاتا ہے مرے ہاتھ سے۔ تم آؤ کہ تھم جائے

دل خوں ہو غمِ ہجر سے خالی ہے کلیجہ
آنسو ٹپکنے کو بیتاب ہے۔ فرماؤ کہ تھم جائے

محشر میں نظر ڈھونڈتی پھرتی ہے کسی کو
تم بھولی ہوئی چیز ہو۔ مل جاؤ کہ تھم جائے

کچھ دیر تو رک جاؤ کہ ارمان نکل جائیں
کچھ کان میں کہنا ہے۔ کہہ جاؤ کہ تھم جائے

پھر ہوک کلیجہ میں اٹھی دیکھو نہ جاؤ
کچھ دیر ذرا اور نہ گھبراؤ کہ تھم جائے

تھمتا نظر آتا نہیں آنکھوں کا یہ طوفان
ہاں تم مگر آنکھوں میں سما جاؤ کہ تھم جائے

یہ جوشِ جنوں اور کسی سے نہ تھمیگا
تم سینے سے آ کر مرے لگ جاؤ کہ تھم جائے

بیمار کو اب کوئی دوا راس نہیں ہے
اعجاز مگر آنکھوں کا دکھلاؤ کہ تھم جائے

ماتم ہے کہ گرتا ہے محل عہدِ وفا کا
کچھ دل میں خدا کے لیے شرماؤ کہ تھم جائے

چلنے میں نہ بہکو کہ بہکتی ہے طبیعت
دیکھو وہ چلا ہوش سنبھل جاؤ کہ تھم جائے

رسید کتب

خورشید محشر:۔ مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی کا دیوان غزلیات صفحہ ۱۴۴ مطبوعہ نوز المطابع لکھنؤ قیمت عہ

گلکدہ: مصور جذبات مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کا دیوان غزلیات ۱۲۸ صفحے مطبوعہ نولکشور پریس حضرت مصنف سے اشرف آباد عزیز منزل کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

گلزار بادشاہ: قادر بادشاہ صاحب کا دیوان خطیب محمد عبدالرشید نمبرہ، گوداون اسٹریٹ کلکتہ سے مل سکتا ہے

نوحہ زندگی۔ آفتاب دمشق: مصنفہ مصور غم مولانا راشد الخیری صاحب دفتر عصمت دہلی سے طلب کیجیے۔

ماہِ عجم:۔ مصنفہ مصور غم۔ ملنے کا پتہ دفتر کہکشاں لاہور۔

تذکرہ

ہر نیا رسالہ اور اخبار اپنی دورِ عمر میں بدگمانیوں اور شکوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے
اور اس کی زندگی کے متعلق طرح طرح سے شبہے کیے جاتے ہیں۔ یہ شکوک بیجا نہیں کہے
جا سکتے لیکن نقیب کے متعلق یہ بدگمانیاں انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔ خاکسار ایڈیٹر کی غیر مستقل
مزاجی اس کی توضیح کر سکتی ہے۔ نقیب کی ششماہی زندگی مستقل مزاجی اور بقائے صحت
کا یقین دلا سکتی ہے تو نہایت مسرت کے ساتھ یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ اس
نمبر کے ساتھ دوسری جلد شروع ہوتی ہے۔ پہلی جلد کی فہرست۔ مضامین اسی نمبر میں کسی
دوسری جگہ شائع کی گئی ہے جس کو نقیب کی "ڈائری" سمجھنا چاہیئے "ڈائری" بتا
دے گی کہ پہلے چھ مہینے کس طرح گذرے۔ نقیب اپنی پالیسی میں کس قدر کامیاب ہوا
اور یہ کامیابی امید افزا ہے یا نہیں؟ تکمیل مقاصد کے متعلق میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ

"کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے"!!

اگر نامہ نگار کا کسی رسالے یا اخبار میں مضمون بھیجنا اُسے ایڈیٹر کے شکریہ کا مستحق قرار دیتا ہے۔
تو میں اپنے اُن کرم گستر نامہ نگاروں کے شکریہ کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں جن سے میں نے
نقیب کے لیے فرمائشی مضمون لکھوائے ہیں

میرا ششماہی تجربہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اگر کسی کام کو ہمت و استقلال سے شروع
کیا جائے تو کوئی مشکل نہیں جو سنگ راہ ہو اور کوئی مدد نہیں جو غیر متوقع اور غیر مترقبہ طریقے
سے نہ ملے۔ اس کا ثبوت نقیب کے ہر صفحے سے مل سکتا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس تحریک کی عزت و شہرت کا مستحق "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"
البتہ تحریک کو وجود میں لانا میرا کام ہے۔

آخری دو نمبروں کی کتابت وطباعت نقیب کی خوبیوں پر پانی پھیرنے کے لیے کافی ہو اس کی وجہ میری عدم توجہی نہیں بلکہ عدم موجودگی تھی۔ "منشی جی" صاحب کا عتاب نظر لفافہ اور سبق "موذ عتاب" بجائے خود ایک مضمون تھا جس کا حظ اُٹھانا میری قسمت میں تھا اور اُس سے ناظرین کو محظوظ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال نیا انتظام اس قسم کی شکایات کو پیدا ہونے کا انشا اللہ موقع ہی نہیں دیگا!!

کوشش و آرزو یہ تھی کہ نقیب اہلِ ذوق کی خدمت میں رسائی پیدا کرے۔ چنانچہ شکر ہے کہ نقیب اس میں ایک بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے اور ملک کے اکثر اربابِ علم اور صاحبانِ ذوقِ سلیم کا نام نامی نقیب کے معاونین کی فہرست کو زینت دیتا ہے مگر میں اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے جتنا میرا جی چاہتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اکثر صاحبانِ ذوق کی خدمت میں یا تو نقیب کی حاضری کی نوبت نہیں آئی یا کسی اہم مشغولیت کی وجہ سے نقیب کو باریابی کی عزت نہیں بخشی گئی۔ بہرحال شرف قبولیت اگر ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے تو آیندہ کے لیے میں مایوس نہیں ہوں!!

نقیب کا حصۂ نظم اس وقت تک کمزور رہا ہے۔ اس مرتبہ اس کی طرف بھی توجہ کی جائیگی کسی گذشتہ اشاعت میں عرض کیا جا چکا ہے کہ غزلیات کے لیے گلدستے موجود ہیں میں پھر بھی عرض کرونگا۔ اس سے یہ مدعا نہیں کہ غزلیں نقیب میں شائع نہیں ہونگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ پُرلطف نظمیں نقیب کو کامیاب بنا سکتی ہیں۔ اس وقت تک حضرات شعرا نے استدعا پر توجہ نہیں فرمائی اور ہجو کے خوف نے مجھے اصرار نہیں کرنے دیا۔

عرصے سے خیال یہ تھا کہ نقیب میں ایسے مضامین بھی شائع کیے جائیں جو صنفِ نازک کی دلچسپی کا باعث ہوں اور اس کے ساتھ کوشش یہ تھی کہ بسم اللہ صنفِ نازک ہی کی طرف سے ہو الحمدللہ کہ کوشش کامیاب ہوئی اور محترم بہن مریم احمد عارف بہام صاحبہ نے استدعا قبول فرما کر نقیب کے لیے "گنج علوم کی کنجی" کے نام سے مضمون لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

مضمون میں جو کچھ استدلال کیا گیا ہے وہ حسِ لطیف کے ہی نقطۂ نگاہ سے کیا گیا ہے جس سے کسی کو انحراف نہیں ہو سکتا اور اس میں شک نہیں کہ اس سے بہتر گنجِ علوم کی کنجی مل بھی نہیں سکتی۔ امید ہے کہ یہ مضمون دلچسپی کے ساتھ دیکھا جائے گا اور دیگر معزز بہنیں بھی قابل مضمون نگار کی تقلید کر کے نقیب کو ممنون بنائینگی۔

سیرۃ الزوجہ "دیدار مینمائی و پرہیزی کنی" کی مکمل تصویر ہے۔ جس قدر مختصر ہے اسی قدر دلچسپ۔ پردہ دری کی عادت نہیں ورنہ نام بتلانے میں ہمیں بھی تکلف نہ ہوتا۔ چونکہ یہ مضمون ختم نہیں کیا جائیگا۔ لہذا نام بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے مگر مضمون کی شوخی۔ بے تکلفی اور ندرت۔ مرحوم "معلومات" کے ناظرین کو کچھ اتہ پتہ بتا دے تو اس کا کیا علاج؟

ایک محترم کرم گستر نے جس سال بی اے کا امتحان دیا اس سال ملٹن کی مشہور نظم "لیلگرو" ( ) بھی داخلِ کورس تھی۔ نوٹ اور شرح کی پیاس نو طالبعلی کے زمانہ میں بجھتی نہیں باوجودیکہ کئی انگریزی علماء کی شرحیں اور نوٹ موجود تھے۔ پھر بھی یہ سنکر کہ پنجاب میں کسی نے اس نظم کا اردو میں ترجمہ کیا ہے منگا ہی لیا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ترجمہ نہیں کشمیر کا زعفران زار تھا۔ علی گڈھ کالج کے طالبعلم اس ترجمہ کو اپنے اپنے کمروں پر اُن سے مستعار منگواتے تھے اور پڑھکر ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاتے تھے۔ جن صاحبوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی وہ خود تکلیف کر کے ان صاحب کے کمرے پر آتے تھے۔ پڑھتے تھے اور لطف اُٹھاتے تھے۔ اس کے دو شعر اب بھی انھیں یاد رہ گئے ہیں۔ ہم ناظرین نقیب کو سناتے ہیں ملٹن کی اصل نظم کا ابتدائی شعر حسب ذیل ہے۔

HENCE, LOATHED MELANCHOLY

OF CERBERUS AND BLACKEST MIDNIGHT BORN

مترجم صاحب نے ملٹن کی مٹیوں پر اس طرح آبِ حیات چھڑکا ہے۔

پلپلا کا کتا جو تھا تن بیسرا | وہ ہو تیرا باپ اور شب تارا

ناظرین نقیب میں سے جو حضرات انگریزی داں ہیں اُن کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ "سرسبز" کی تقریب کے لیے خود ملٹن اگر اردو میں اشعار لکھتا تو ان سے بہتر الفاظ کہاں سے ڈھونڈھ لاتا "لپوٹا کا کتا جو بغاوت سے" دوسرا شعر انگریزی میں ہے۔

COME AND TRIP IT AS YDU GO

GN THE LIGT FANTASTIC TOE

اس کا ترجمہ بلیغ اور دلکش طرز میں ادا کیا گیا ہے۔ اس کی کما حقہ داد دینے کے لیے الفاظ مفقود ہیں

چلی آ چلی آ تو دیبی پری   انگوٹھے پہ اپنے یہ جلوہ گری

ہمارے اُن کرمفرما کی رائے میں ملٹن کے مترجم صاحب نے۔ آیندہ متاخرین مترجمین کے لیے فصاحت و بلاغت کا دروازہ بند کر دیا تھا مگر خدا بھلا کرے مسٹر جان بل کا کہ انھوں نے خواجہ حافظ کی غزلوں کے ترجمہ کا نمونہ پیش کر کے ثابت کر دیا کہ ابھی اس میدان میں بڑے بڑے مرد موجود ہیں۔ جن مترجمین نے اساتذہ متقدمین کے کلام کے ترجمے میں یہ التزام رکھا ہے کہ نظم کا ترجمہ نظم ہی میں ہو۔ انھیں اب تک ارباب ذوقِ سلیم نے اس التزام میں کامیاب سمجھا مگر خواجہ حافظ کے کلام کا ترجمہ منظوم دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ اصلی کامیابی کا سہرا حضرت "حافظ لودھیانوی ملک پنجاب" کے سر ہے۔ خاکسار ایڈیٹر نے خود حافظ لودھیانوی کے مرتبہ ترجمہ سے اکتساب فیض کیا ہے۔ ناظرین نقیب میں سے جن حضرات کو قسمت نے ایسے مقامات پر پھینک دیا ہے جہاں تنہائی کی شکایت ہو اور سامان دلچسپی موجود نہوں اُن سے مسٹر جان بل کا یہ عالمانہ ریویو سفارش کرتا ہے کہ وہ اس کتاب کی ایک جلد ضرور منگا لیں۔ کتاب کے ختم ہونے تک وہ یقیناً تنہائی کے شاکی نہونگے۔

سحر و تسکار کے متعلق مضامین شائع کیے جائیں تو خالی از دلچسپی نہیں۔ طبع آزمائی کے لیے وسیع میدان ہے۔ مذاقِ سلیم ارباب ذوق کو اس طرف متوجہ کرے تو کچھ بعید نہیں۔ چنانچہ "منصوری کی سرخی" سے ایک مضمون پیشکش کیا جاتا ہے اس کے متعلق محض یہ کہہ دینا کافی ہے۔ اپنا بیان حسن طبیعت ...

فہرست مضامین

قواعد

۱- یہ رسالہ بالعموم ہر ماہ کے آخر ہفتے میں شائع ہوا کرتا ہی-

۲- شائقین کی آسانی کے لیے دو قسم کے کاغذوں پر چھاپا جاتا ہی- قیمت حسب ذیل ہی:-

قسم اول   للعہ سالانہ عہ ششماہی

قسم دوم   عہ سالانہ   ۲

کوئی خاص نمبر جو مطلوب ہو (بالحاظ قسم) آٹھ آنے پیشگی- نمونہ (کوئی سا ایک گزشتہ نمبر ارسال ہوگا) تین آنے پیشگی-

۳- نمونہ مفت نہیں دیا جائے گا-

۴ کسی ماہ کا رسالہ نہ پہنچنے کی شکایت دس تاریخ تک آنا چاہیئے-

۵- جواب کے لیے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

شرح اجرت اشتہارات

صفحہ	سالانہ	ششماہی	سہ ماہی	ماہوار
	روپیہ	روپیہ	روپیہ	روپیہ
ایک صفحہ	۳۵	۱۸	۱۱	۵
نصف	۱۸	۱۱	۵	۳
چہارم	۱۱	۵	۳	۲

۱- اجرت اشتہار ہر حالت میں پیشگی آنا چاہیئے

۲- مختصر اشتہارات بشرح ۲ر فی سطر- لیکن دو روپیہ سے کم جس اشتہار کی اجرت ہوگی قبول نہیں کیا جائیگا-

۳- اشتہار کی عبارت مہذب ہونا چاہیئے

۴- یہ اجرت کم سے کم ہی براہ کرم اجرت ٹھہرانے میں تضیع اوقات نہ فرمائیے

نقیب

جلد ۲ | ستمبر ۱۹۱۹ء | نمبر ۲

لیڈر

از

جناب سلطان حیدر صاحب جوش

لیڈر کو بقیہ افراد انسانی سے وہی نسبت ہی جو حضرت نوح کو اپنی سالخوردہ کشتی سے تھی یا یسوع مسیح کو بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں سے رہی! تاریخ عالم کا وہ باب جو آیندہ چل کر اس سربلند ہستی کی سوانح عمری پر روز ازل سے روشنی ڈالیگا۔ دیکھنے اور سننے کے قابل ہوگا، فی الحال یہ حصہ اوراق سادہ کا مجموعہ ہی! عموماً ہندوستان کی تعلیم جدید اور خصوصاً سیاسیات کا وسعت پذیر دائرہ لیڈر کے وجود کے لیے دومٹ نمبر اول سے کسی طرح کم نہیں، ہر تخمِ بیکار تھوڑے وقفے میں باکار و بارآور ہو جاتا ہی! ہندوستان کے ہیجانِ قومیت نے مادۂ فاسد کی طرح مختلف اجسام میں عملِ گوناگوں کا اظہار اس درجہ کیا ہی کہ مسٹر مانٹیگو سے لیکر سر مائیکل اوڈوائر تک ہر سرخ و سفید ہستی "قلم بہ دنداں" یا "شمشیر بکف" نظر آتی ہی! علم الاعداد کی عینک سے صاف نظر آتا ہی کہ گذشتہ دس سال کی قلیل مدت نے لیڈر کی افزائشِ تعداد کے ساتھ وہی کام کیا ہی جو موسم برسات حشرات الارض

کے ساتھ کرتا دیا، امدادِ جنگ نے عطیۂ خطابات کے ساتھ کیا! خوف ہو کہ چند ہی سال میں طفل دبستان مسٹر بونر لا اور رہر ٹھان محمد علی بن جائے گا! مسلمانان ہند میں سر سید کے جیتے جی یہہ فرقہ نہایت محدود اور قریب قریب معدوم تھا، محسن الملک کے زمانہ میں مشتبہ ہوتا تھا "شاید کہ ہمیں بیضہ برآرد پروبال" وقارالملک کے زمانہ میں کھٹکنے کے آثار ہر چھلکے سے ہویدا ہونے لگے، اور نواب اسحاق خاں کی دو عملی میں مخلوقات نو خیز کلبلا کر نکل ہی تو پڑی! محاربات طرابلس و بلقان اور جنگ عظیم الشان کی آب وہوا کچھ ایسی موافق آئی کہ اب بڑے بڑے شہروں کے گلی کوچوں میں لیڈر کا وجود پیشۂ قانونی اختیار کرنے والے گروہ سے دُگنا چوگنا نظر آتا ہو؛ اس میں شک نہیں کہ ہر قاعدے کی مستثنیات کی طرح اس دعوے کی مستثنیات کی مثال میں بھی یہ البیلا ضلع جو پرانے زمانے سے پایا جاتا عالم کی بدحمانی کا جزو ممتاز رہا ہی نہایت صحت کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہی! یہاں خدا کے فضل سے سیاسیات کا مفہوم رانا سانگا کی باقاعدہ سائیسی کے سوائے اور کچھ نہیں سمجھا جاتا پنجاب کے شور و شنب کی خبریں اُسی لطف کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں جس طرح وانا اور برلن کے تار! چشم بد دور، اس ضلع کا سکونِ مستقل مہاتما گاندھی کی آندھی سے بھی ذرا نہ ہلا، اس کی متین وسکوت آمیز جبین پر کوئی تلاطمِ سیاسی معمولی سی شکن بھی نہ ڈال سکا! راوی کا بیان ہو کہ اس سرزمین پر راجہ بکرماجیت کے زمانے کا ستِ سلاجیت اب تک عموماً استعمال کیا جاتا ہو جس کے بدولت ہر فردِ باختیار سیواجی کا نقشِ ثانی بن جاتا ہو!

ہندوستانی لیڈر زیادہ تر دو قسم کے دیکھے اور سُنے جاتے ہیں :- قسم اوّل جبری اور قسم دوم اختیاری! جبری یا بالفاظ دیگر وہی وہ افراد ہیں جن کے گھر میں پیشۂ

رہبری آبائی میراث کی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا آتا ہو! یہہ اپنے گرد و پیش کی حالت
پر قطع و برید کا عمل جاری رکھنا ماں کے دودھ کے ساتھ پیتے ہیں۔ ان سپوتوں کے پاؤں
پالنے ہی میں "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کی طرح نظر آنے لگتے ہیں! وہ اپنی دھن
کے پکے اور اپنے دعوے کے سچے ضرور ہوتے ہیں۔ اُن کا بس نہیں چلتا ورنہ
صفحۂ روزگار پر کوئی "ان داتا" بچے نہ "نادر"! وہ ہر لحاظ سے "چو میرد مبتلا میرد - چو خیزد
مبتلا خیزد" کی سچی اور جیتی جاگتی تصویر ہوتے ہیں۔ جبری لیڈر اب بھی محدودے چند
ہیں اور ان کی تعداد میں کوئی قابلِ حیرت اضافہ ممکن نہیں البتہ سرتلاطم و انقلابات کے
دور میں وہ ہدفِ سخت گیری بن کر تنزل پذیر ضرور معلوم ہوتے ہیں!

زمانۂ موجودہ کے نبّاض، اختیاری لیڈر کو بھی دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں:
ایک اصلی، دوسرے مصنوعی! اصلی وہ ہیں جو محض شہرت و نام آوری کے لیے
پیشۂ رہبری کو اُسی لحاظ سے اختیار کرتے ہیں جس لحاظ سے متھرا کے ایک
مشہور وید ہر سالِ نو کی جنتری مفت تقسیم کرتے ہیں۔ یہہ پیشۂ نیک اُن
کے لیے وہی معنی رکھتا ہو جو گراموفون کمپنی مس گوہر جان کے لیے،
یا نوچندی کا میلا حسینانِ حسن نما کے لیے! مانا جاتا ہو کہ ایسے افراد اصلی جبری لیڈر کی
حرکات و سکنات کی نقل رات دن کرتے کرتے "نقل مطابقِ اصل" بن کر رہ جاتے ہیں!
ایسے اصلی نمونۂ اختیاری کو جبری سے تمیز کرنا اکثر اوقات ناممکن معلوم ہوتا ہو- افسوس
ہو کہ کوئی علامتِ نمایاں "ٹریڈ مارک" کے ہم معنی آج تک دریافت نہیں ہو سکی ہو
جس سے اختیاری و جبری کا فرق نظرِ اول میں معلوم ہو سکے! یہہ پیشۂ اختیاری ہمیشہ
اپنے عامل کی حدودِ اثر و دائرۂ اعتقاد کو دو چار ہی برس میں اُسی قدر وسیع کر دیتا ہو جس قدر

محض بلجیم کی طرفداری مقبوضات انگلستان کی حدود اربعہ کو بیک ضرب پھیلا دیتی ہو!
حدود اثر کی وسعت پچاس فی صدی دستِ غیب کا کام پوری حد تک دیتی ہو۔ اس
پیشۂ جائز کو دستِ غیب کا چلتا ہوا عمل بنانے کے لیے محض جذباتِ قومی یا مذہبی
کو چھیڑ دینے کی حاجت ہو اور بس! کسی مسجد یا مندر کا قدم درمیان ہو، پنجۂ آہنی
کے مظالم طرح طرح سے دکھائے جا سکیں۔ اور کچھ نہیں تو قربانی یا "گؤ رکھشا" کی پناہ
لی جا سکے، پھر آمد کا ابرِ نیساں چند دن کی بوچھار سے تھیلیاں نہ بھر دے تو ہما !
ذمہ! یہہ تمام خراجِ سیاسی نہایت آسانی سے محض ایک برمحل ڈکار کے ساتھ
لیڈر صاحب کے نذرِ معدہ ہو سکتا ہو اور ہوتا رہتا ہو! خوبی یہہ ہو کہ حساب
کتاب سوائے یوم الحساب کے کسی زمانے میں اور کسی جگہہ نہیں لیا جا سکتا۔
"کھانا اور غرّانا" اسی وجہ سے موجودہ پالٹیکس کا جزوِ ضروری قرار پایا ہو؛ سیاحت
کے لیے یہ پیشۂ سعید نہایت اعلیٰ درجہ کا "پاسپورٹ" ثابت ہوتا ہو: ہندوستان
کی حدود کے اندر جس جگہہ ورود کا ارادہ ہو لاکھوں افراد بلا سوچے سمجھے پلکیں
بچھانے کے لیے تیار۔ سمندر کی سطحِ آبی سے گزر کر دوسری دنیا کا قصد ہو تو بھی
واپسی کے ایک برس بعد تک کے تمام مصارف کی کفالت لیڈر کی جیب پر کسی طرح
نہیں پڑتی! ہندوستان کے باہر کی ہوا اس رنگ میں ایک دفعہ بھی کھا آنے سے
"حجِ اکبر" کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہو۔ پھر فوٹوگرافی سے لیکر جراحی تک جس پیشے کو اختیار
کیجیے امید سے زیادہ پھلے پھولیگا! خداداد ذہنِ رسا کو اس لحاظ سے استعمال
کرنے پر کہ سرزمینِ سیاست میں کوئی قدم اُس جگہہ سے متجاوز نہ ہو جہاں نظربندی
عبور دریائے شور اور سزائے موت کا سرحدّہ نصب ہو، مرتبۂ جاہ و نمود اور لیڈر

میں "قَابَ قَوسَینِ اَو اَدنیٰ" کا فاصلہ بھی باقی نہیں رہتا۔ پھر خدانخواستہ بعض نافہم و جنوں سرشت طبائع اگر مشکوک عینک سے دیکھنے لگیں تو بیک جست مرتبۂ ذاتی الّتبل حاصل کیا جا سکتا ہے۔

آنریبل سے لارڈ یا کم از کم جوڈیشل کمشنر ضرور بن سکتے ہیں! ہر طرح اور زمانے میں رہبرِ اعتباری کو وہ رتبہ حاصل رہتا ہے جو حکم کی بازی کو تاش کے کھیل "برج" میں دیا جاتا ہے: ایڈر کے روپ میں "حکم کے غلام" ہیں تو جوڈیشل کمشنر کے بھیس میں "حکم کے بادشاہ" ہوگئے۔ بازی جیتے حکم ہی کی رہی: لیکن اس میں شک نہیں کہ رہبرِ اختیاری کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے "گرگِ باراں دیدہ" ہونے کے علاوہ اور بوقلموں صفات کی بھی حاجت ہے۔ مثلاً حسبِ ضرورت معترض کی، زبان اور حاکم کے کان دونوں کو گلِ حکمت کرتے رہنا۔!

سب کے آخر میں اور غالباً سب سے زیادہ۔ رہبرِ مصنوعی کی باری آتی ہے! یہ عجیب ہستی۔ ایک ایسی خانہ ساز ہستی ہے جو دو آتشہ سے لیکر چار آتشہ تک - ہر قوّت و حِدّت کی ہو سکتی ہے اور دیکھنے میں آتی ہے! یہ آتشِ سیال واقعاتِ عالم کی معمولی سی ٹھیس سے چراغ پا ہو جاتی ہے! اس ذاتِ برق عادات کی معلومات مذہبیات سے شروع ہوتی ہے اور قومیات، اقتصادیات، سیاسیات وغیرہ کی منازل طے کرتی ہوئی واہیات پر ختم ہوتی ہے! جامعیت کے لحاظ سے اس کی تنہا ذات ہر جلسہ و صحبت میں "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" کے تازہ ترین ایڈیشن کا کام دے سکتی ہے!

فلسفۂ اجماع سے لیکر فنِ معیشت تک تمام علوم و فنون اُس بحرِ اعظمِ لحمی کے سینے

میں متغل ہیں اور اس لحاظ سے اُس کا وجود دائرۂ احباب میں "کتبخانۂ رواں" سے کم نہیں! وہ اکثر ہمہ داں، ہمہ فہم، ہمہ گیر اور ہمہ گو، پایا گیا ہی!

بسا اوقات طریقۂ آبائی کو ترک اور پیشۂ رہبری کو اختیار کرنے کی تحریک اُن ہی اُصولوں پر مبنی ہوتی ہی جو ایک مشہور مصوّر کو طبیب بنانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ واقعہ نگارِ حال کی یہ بھی رائے ہی کہ اکثر افراد کسی جگہہ باکار نہ بن سکنے پر "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق محض کسبِ اکلِ حلال کے لیے اس پیشۂ اختیاری کو اختیار کر لیتے ہیں اور سچ یہ ہی کہ بالآخر۔ اُس رانڈ کی طرح جو بیاہتا سے اچھی پڑ رہتی؟ کسی با اختیار شخصیت سے کسی لحاظ سے کم نہیں رہتے! ایک صاحب ۱۹۱۵ء میں سپلائی اینڈ ٹرانسپورٹ کورز" SUPPLY & TRANSPORT CORPS میں بیل ہانکنے کے لیے بھرتی ہوئے تھے! بصرہ کی آب و ہوا کی ناموافقت کی بدولت بیک بینی و دوگوش ۱۹۱۶ء سے پہلے ہی نام کٹا کر واپس آ گئے! اور کسی مصرف کی دوا نہ تھے۔ اخبار کی ایجنسی شروع کر دی۔ خدا کا کرنا کیا ہونا ہی ۱۹۱۷ء تک لکچرار اور اچھے خاصے رہبر مصنوعی بن گئے! ماننا پڑتا ہی کہ قوم کا ہانکنا، بیلوں کے ہانکنے سے، آسان کام ہی! اور ہونا بھی چاہیے۔ بیل ٹھہرے محض حیوان، اور قوم ہی اللہ کے فضل سے حیوانِ ناطق!

میرے ایک اور عنایت فرما کم و بیش بارہ سال کا عرصہ ہوا، حسبِ مرضی ترقی نہ مل سکنے پر ملازمتِ سرکاری سے دست کش ہوئے اور رفتہ رفتہ اس پیشۂ سہل الحصول کو اختیار کر بیٹھے۔ آج ۱۹۲۱ء میں وہ قوم کے گروہِ رہبر کے مسلمہ فرد ہیں؛ فرض کیجیے وہ اپنی ملازمت کی لکیر کے فقیر بنے رہتے تو زیادہ سے زیادہ

آج تحصیل کی چہار دیواری میں یا محکمۂ نہر کے لبِ جو "عکم سٹ" پر بلا سوچے سمجھے دستخط کرتے ہوتے اور ملک تو درکنار اُن کے اپنے شہر کے کاچھی تک نہ جانتے کہ وہ ہیں کس کھیت کی مولی! میرے خیال میں وہ ترقی کرتے کرتے محکمۂ نہر سے محکمۂ سمندر کے حاکم اعلیٰ بھی بن جاتے۔ جب بھی یہ عزت نہ نصیب ہوتی کہ اُن کا نام سری نگر سے لیکر راس کماری تک۔ کسی جگہہ اور کبھی۔ بغیر "حضرت" یا "جناب" کے زیورِ طبع سے آراستہ ہو!

معنوعی لیڈر کا غصّہ جس کو اصطلاحِ سیاسیات میں حمیّتِ قومی، حمایتِ ملکی اور خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ رات دن میں کم و بیش چودہ گھنٹے چہرے کے اُس حصے پر رہتا ہی جو اپنی بلندی و ساخت کے اعتبار سے "کنچن جنگا" کی چوٹی کہا جا سکتا ہی! "نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن" - اُس کی رائے میں سعدی شیرازی کا مقولہ مہمل ہی؛ وہ ولیسی عینک سے بدیسی کو دیکھتا ہی، در نظارہ کو ناقابلِ برداشت پاکر سیاسیات کا "ہلاکو خاں" بن جانا اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہی!

قومیت کا مرض ایک مرضِ متعدی ہی اور تجربہ بتاتا ہی کہ تیس پینتیس برس کی عمر تک زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہی! بعض اوقات پختہ کار افراد بھی جو سنِ کہولت سے دو چار ہوں اس وبائے عالمگیر سے محفوظ نہیں رہ سکتے اور دیکھتے ہی دیکھتے فرشِ زمین سے عرشِ معلے کی خبر لانے لگتے ہیں؛ خواہ مشہورِ عالم ڈاکٹر ہوں یا حکیم حاذق کوئی اس کے اثر سے محفوظ نہیں!

یہ بیشک بجا ہی کہ ہر ابجد خوانِ قومیت ارسطو نہیں بن سکتا، لیکن باقاعدہ گلمدارانہ صحبت اور موزوں تادیب تھوڑے ہی عرصے میں ایک شائقِ رہبری کو لیڈر کا خطاب دلا سکتی ہیں! مسلمہ لیڈر بننے کے لیے متعدد کینچلیاں اُتارنے کی حاجت ہی۔ اس عمل

ارتقا کے مختلف مدارج گزشتہ پانچ سال کے تجربے پر حسب ذیل بیان کیے جا سکتے ہیں:-

اخبار بینی۔ جس وقت زمانہ غیر مطمئن کے واقعات کا غیر معمولی اثر کسی بھلے چنگے دماغ پر عمل ہیجان شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے اُس کے ہاتھ اخبار کی طرف بڑھتے ہیں۔ مرض قومیت کی یہ سب سے پہلی نمایاں علامت سمجھی جا سکتی ہے! اس عادت کی انتہا روزانہ صبح کو چاے یا ناشتے کے ساتھ کسی روزانہ اخبار کا پی جانا دریافت ہوئی ہے: جس وقت دل و دماغ علی الصباح اخبار کا پرچہ نہ پا سکنے سے انگڑائیاں اور جمائیاں لینے لگے تو گویا پہلی منزل کی تکمیل ہو گئی! مطالعہ اخبار کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ آنکھوں ہی سے کیا جائے، اکثر و بیشتر کانوں سے بھی کیا جا سکتا ہے!

اخبار فہمی۔ تھوڑے عرصے کی باقاعدہ "اخبار نوشی" خود بخود "اخبار فہمی" کے درجے پر پہونچا دیتی ہے! اس مرتبہ پر پہونچتے ہی چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ غائب و حاضر کا حال سب بلا واسطہ سمجھ میں آنے لگتا ہے! واقعات عالم کا کوئی راز راز نہیں رہتا: مثلاً اخبار فہمی کا مادہ پیدا ہونے پر جنگ یورپ کی تمام نقل و حرکت کے وجوہات مع نتائج انگریزی جنرل فاش اور جنرل ہنڈنبرگ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیے جا سکتے ہیں۔ باوجود شرائط صلح شائع ہو جانے کے پریسیڈنٹ ولسن کی غلطیاں پوری طرح بیان کی جا سکتی ہیں، قیصر ولیم کے مستقبل پر صلح کانفرنس سے شرط لگائی جا سکتی ہے اور اخبارات فتوحات کی تردید پورے استدلال کے ساتھ کی جا سکتی ہے! شاہان عالم کا مستقبل۔ بذریعہ اخبار فہمی۔ اس خوبی و یقین کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے کہ قیصر جرمنی اور انور بے اگر سن پائیں تو مبہوت ہو جائیں اور سر مائیکل اور لارڈ چیمسفورڈ کے گوش زد ہو جائے تو نہ زبان رہے، نہ بیان!!

اخبار نگاری - یہ تیسرا درجہ ہے لیکن لاعلاج نہیں مانا جاتا! اس مرتبہ پر پہونچتے ہی تصنیف وتالیف کے مادّۂ فطری میں ناقابلِ ضبط طوفان نمو پیدا ہوتا ہے! آغاز اخبار نگاری سے اور اختتام کتاب نگاری پر یہ آغاز و انجام سمجھیے! مقامی انتظامات سے لیکر بین الاقوامی سیاسیات تک کوئی عنوان ایسا نہیں بچتا جس پر اسٹوارٹ مِل اور برکلے سے چند گز آگے بڑھنے کا دعوے نہ لیا جائے! محلہ کے چوکیدار سے لیکر ملک کے وزیر اعظم تک کوئی اس قلمرو کے اخبار نگاری کی سرحد سے باہر نہیں جا سکتا! الا اندرونی۔ فنِ مقابلہ، تحکام، علم رموز السیاسیات فلسفۂ اجماع، فلسفۂ جنبش، فلسفہ مابعد الطبیعات، فلسفۂ مالیخولیا، اور ایسی ہی دیگر اہم اور وزنی تصانیف علمی کے دریا بہا دیئے جاتے ہیں!

اخبار رانی - اس درجے تک ہر فرد قومی نہ پہونچ سکا ہے نہ پہونچ سکتا ہے! وقت اور مال کے علاوہ وہ خاص مادّہ ہونے کی ضرورت ہے جو اخبار راں کے لیے نہایت ضروری ہے! یہ مادہ محض قدرت سے ودیعت ہوتا ہے، بی۔ اے کی ڈگری یا کوئی اور علمی ڈپلوما اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا! بعض اپر پرائمری کے بچے آنریبل چنتامنی کے کان کترنے کو تیار ہیں! جس طرح گاتے گاتے کلاونت اور لکھتے لکھتے ملاح ہو جاتا ہے اسی طرح اخبار نکالتے نکالتے اخبار راں بن جاتا ہے! اس درجے پر وہ تمام فوائد و حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو "ایسوشی ایٹڈ پریس" [۱] کو بصورت جماعت حاصل ہیں! حال ہی میں راولپنڈی سے ایک تار دیا گیا تھا: "افغانی نمایندے سات مکانوں میں مقیم ہیں" - کلکتہ پہونچنے تک اس نے نیا جنم لے لیا: "افغانی نمایندے

[۱] "ایسوشی ایٹڈ پریس" ASSOCIETED PRESS کو اور کچھ مادہ ملا نہیں اور خاموش رہنا شانِ خبر رسانی کے خلاف تھا لہٰذا فوراً یہ اطلاع اہم دیگئی۔ "AFGHAN DELEGATES ARE LIVING IN SEVEN HOUSES" قدرت کی ستم ظریفی نے ایسا کچھ عمل کیا کہ کلکتے پہنچا اس طرح سمجھا گیا AFGNAN DELEGATES ARE LEAVING IN SEVEN HOURS نہ صرف سمجھا گیا بلکہ بڑے بڑے اخبار والوں نے کالم کے کالم افغانیوں پر اپنے لیڈر میں لکھ مارے!!

سات گھنٹے میں رخصت ہونے والے ہیں"۔ اخبار راں دنیا میں "تلاطم مچ گیا۔ صفحے کے صفحے رنگ ڈالے گئے! یہ تمام استحقاقِ سیاہ و سفید محض اخبار رانی کے ہی زیرِ سایہ حاصل ہو سکتا ہے! اخبار رانی کے لیے سیاسیات میں لکھنا، سیاسیات میں ہنسنا، سیاسیات میں رونا۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ کُل حوائجِ ضروری کو سیاسیات میں بجا لانا نہایت ضروری ہے۔ اخبار راں کو سیاسیات کے پیچھے اُسی حد تک پڑنا چاہیے جس حد تک نظامی پریس بدایوں دیوانِ غالب کی طباعت کے پیچھے پڑا ہے! اگر فلسفۂ آزادی کے علاوہ تعلیم و تعلّم یا معاشرت کی بے وقت راگنی الاپنی شروع کی تو یقیناً اخبار کے خریداروں کی تعداد اُسی ہفتے میں ایک چوتھائی رہ جائے گی! اخبار راں ہوتے ہی اپنی آنکھوں کو تمام قوم کی عینک اور اپنی زبان کو تمام ملک کا گرامو فون سمجھنے کے "اختیاراتِ شخصی" حاصل ہو جاتے ہیں! اسی لحاظ سے ہر اخبار راں ہستی اپنی ذات کو بجا طور پر "ہم" سے خطاب کرتی ہے! "ہم" فی الحقیقت تمام قوم کا مفہوم اپنے ساتھ لیے رہتا ہے۔ میں نے حال ہی میں کسی اخبار میں پڑھا تھا "ہمارے گھر میں بچہ ہونے کی وجہ سے یہ غیر معمولی تاخیرِ اشاعت ....."۔ کیا یہاں بھی "ہمارے" کا مفہوم کُل قوم ہے؟ دورِ اخبار رانی کو دورِ "ہما ہمی" بھی کہتے ہیں!

اَخبار کُشی۔ یہ مرتبہ "فنا فی السیاسیات" کا ہے! اس درجہ پر پہونچنے سے آوازمیں دردِ مفروضہ اور بیان میں ایک نالۂ فریادی پیدا ہو جاتا ہے! ذاتِ والاصفات اخبار کے لیے وہی اثر رکھتی ہے جو اکاس بیل ایک نوخیز درخت کے لیے: قلم میں وہ اعجازِ عزرائیلی پیدا ہو جاتا ہے کہ بعض اخبار دو چار سطروں ہی میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے، بعض ایک دو مضامین کا متحمل ہوتا ہے اور بعض سسکتا سسکتا دو چار مہینے دم توڑ لیتا ہے مگر ایک

بھی ایسا نہیں رہتا جو بالآخر ایک نہ ایک دن "حد آخر موت" کے معمّے کو سمجھ کر قبل از وقت عدم کو نہ سدھار جائے! ضمانت ضبط ہونا، اخبار ضبط ہونا، مطبع ضبط ہونا اور بعض اوقات "قلم دوات تک ضبط ہونا" کرشمۂ سحر نگاری قرار پاتے ہیں! ایک درجن اخبار و رسائل اگر زندہ درگور کر دینے کا فخر حاصل ہو سکا تو گویا معراجِ سحر نگاری ہو گئی! یہ ایک ایسا ڈپلوما مل گیا جس کا مجرد اظہار آیندہ ہر اخبار کو جو اسی ہستی کے زیر ادارت شائع ہو کامیاب بنانے کا پورا بیڑہ اُٹھا سکتا ہے!

اخبار کشی سے آگے بڑھنا مصنوعی و اختیاری لیڈر کے بس کا روگ نہیں ہے وادیٔ پُر خطر کے حدود اسی جگہہ سے متصل ہیں۔ یہاں کوئی دیوانہ ؒ سرشار ہی سر کے بل چل سکتا ہے! مجذوبانِ ازلی کو ہمارے سر برآوردہ لیڈر سے وہی تعلق ہے جو ایک دیوانہ کو فرزانہ سے ہو سکتا ہے! موجودہ لیل و نہار کی برکت سے نازنین پیکر بھی وجود ہو گیا ہے۔ اگر متاثر کرنا، ہر دلعزیز بننا، اور نظر فریبی، لیڈر کے ضروری اوصاف قرار دیے جائیں تو یقینی ایک نزاکتِ مجسم لیڈر۔ قوی الجثہ ہستی سے ہر طرح زیادہ کارآمد ثابت ہو! صنفِ نازک نے بھی اشارہائے چشم و ابرو سے رہبری کا کام لیا تو یقیناً ہمارا قافلہ منزل مقصود تک۔ اُس منزل تک جہاں سب کو جانا ہے۔ بہت جلد پہنچ کر رہیگا! اس آخری قسم پر بھی کچھ روشنی ڈالنا چاہتا تھا مگر محض اس خوف سے باز رہتا ہوں کہ کہیں یہ مضمون اڈیٹر نقیب کا مضمون "بجلی" نہ بن جائے اور مجھ پر سرقہ کا الزام نہ تھوپا جائے! میرے ایک متانتِ مجسم دوست موجودہ زمانے کی رفتار دیکھ کر ہمیشہ مجھے یہ صلاحِ نیک دیا کرتے ہیں کہ

دے کے لکچر پکارتے پھرئے ✤ ہر گلی کوچہ۔ کام لیڈر کا!

کلامِ جوہر

جناب محمد علی صاحب اکسن

تشنہ لب ہوں مدتوں سے دیکھیے — کب درِ میخانۂ کوثر کھلے
طاقتِ پرواز ہی جب کھو چکے — پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے
چاک کر سینے کو پہلو چیر ڈال — یوں نہیں کچھ حالِ دلِ مضطر کھلے
رات تلچھٹ تک نہ چھوڑی تب کہیں — رازہائے بادہ و ساغر کھلے
لو وہ آ پہنچا جنوں کا قافلہ — پاؤں زخمی۔ خاک منہ پر سر کھلے
ہوں جو کثرت ہی کے قائل ان پہ کیا — رازِ فتحِ سبطِ پیغمبر کھلے
رونمائی کے لیے لایا ہوں جان — اب تو شاید چہرۂ انور کھلے
اب تو کشتی کے موافق ہے ہوا — ناخدا کیا دیر ہے لنگر کھلے
یہ نظر بندی بھی نکلی ردِ سحر — دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم — حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے
اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش — معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ — بال و پر نکلے۔ قفس کے در کھلے
کفر نے دکھلائی راہِ دینِ حق — اس نظر بندی میں یہ منظر کھلے

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

دماغی مومیائی

از

جناب مولوی علی اوسط صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں میں علم کی روشنی پورے ملک میں نہیں پھیلی تھی صرف روزیٹا اسٹون سے اس زمانے کے حروف تہجی کا پتہ چلتا ہے۔ اشوک کے زمانے میں سیکڑوں پتھر کے ستونوں پر ملکی احکام کندہ کرکے جابجا شائع کیے گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رعایا اس قدر پڑھی ہوئی تھی کہ ان احکام کو کم از کم پانچ فی صدی پڑھ سکتے تھے۔ گو مصر کی میناریں اب تک دنیا کو حیرت میں ڈال رہی ہیں اور بہت سے اقلیدس کے مسائل ان سے حل کیے گئے ہیں۔ بالخصوص یہہ مسئلہ کہ دنیا میں کوئی عمارت بالکل سیدھی نہیں بن سکتی ہے۔ تاہم قدیم مصریوں کا یہہ طریقہ کہ اپنے مُردوں کی نعش کی مومیائی بناتے تھے اس بات کا ثبوت ہے کہ دماغی مومیائی بنانے کا دستور اس زمانے میں زیادہ رائج نہیں تھا۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا نام زندہ رہے۔ لوگ کسی بڑے کام کو بالکل ثواب ہی کی غرض سے نہیں کرتے۔ ان میں بقاء نام بھی شامل ہے۔ نعش کی مومیائی بنانے سے یہہ اصلی غرض تھی کہ متوفی کی تصویر مدتوں تک قائم رہے۔ ان کو کیا یہہ خیال تھا کہ ایک زمانہ وہ آئیگا کہ اس مومیائی کی کھاد بنائی جائے گی اور یورپ کے باغوں میں پھولوں کی کیاریوں میں وہ کھاد استعمال ہوگی تاکہ شاید جو خوشبو پھولوں سے آئے اس میں کوئی رمق قدیم مصری دماغ کے عطر کی آجائے۔ قدیم مصری ترقی کے بعد جب یونانی ترقی کا دور شروع ہوا اور علم کی روشنی پوری چمکی یہہ خیال پیدا ہوا کہ بقاء نام کے لیے مومیائی نعش کی ضرورت نہیں ہے۔ دماغ کی مومیائی مدت مدید تک قائم رہیگی۔ کیونکہ بقاء ابدی تو صرف ایک

ذات پر ختم ہو چکی ہے۔ اُس ذات پاک کو ذات کہنا خود ہمارے علم کی کمی کی دلیل ہے۔ اسپنوزا "SPINOZA" نے صحیح لکھا ہے کہ ہمارے جس قدر خیالات خدا کے نسبت ہیں وہ انسان کی محدود خیال کی دلیل ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ خدا کے ناک کان جسم آنکھ نہیں ہے۔ پھر بھی ہم روز کہتے ہیں کہ خدا سنتا ہے۔ خدا دیکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے بھی خدا کے تھک جانے کا اعتراف کیا چھ روز میں تمام چیزیں اُس نے پیدا کیں اور ساتویں دن اُس نے آرام کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالکل تھک گیا تھا۔ بہرحال انسان خدا کی ذات کا کبھی مکمل خیال نہیں حاصل کر سکتا۔ محدود چیز کبھی لامحدود چیز کو وہم و گمان میں بھی نہیں لاسکتی۔

قدیم رومیوں اور یونانیوں نے یہ سوچا کہ جسم کی مومیائی بنانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ دماغ کی مومیائی بنانا چاہیئے۔ چنانچہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں سب سے پہلے لکھنے کا فن جاری ہوا۔ کیونکہ اُن کے یہاں لکھی ہوئی چیز کا نام کتاب ہوا۔

دماغ کی مومیائی کا طریقہ جلد ترقی کر گیا۔ جو شخص کچھ لکھا پڑھا ہوتا تھا اُس نے فوراً اپنے خیالات قلمبند کرنے شروع کر دیئے۔ اپنے خاندان اپنے ملک کے حالات درج کرنے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے کتب خانے اس دماغی مومیائی سے بھر گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں دماغی مومیائی کا سلسلہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے تمثیلات میں کہتے تھے کہ کوئی حد کتاب بنانے کی نہیں ہے اور بہت پڑھنے سے دماغ مختل ہو جاتا ہے۔

لیکن دیکھو قدرت کا مالی ہر جگہہ اپنے کام میں مشغول ہے۔ جو پھولدار یا پھلدار درخت پُرانے ہوتے جاتے ہیں اور جن میں پھول یا پھل نہیں آتے اُن کو برابر نکالتا جاتا ہے۔ سو جاہ

سدا بہار درختوں کو بھی جب وہ دیکھتا ہے کہ بہت پُرانے ہوگئے ہیں اور اُن کی جڑیں خشک ہو چلی ہیں چھانٹ دیتا ہے۔

وہ ہر ملک کی آب و ہوا۔ طرز معاشرت و ملکی مذاق کے موافق درخت لگاتا ہے۔ اور جس طور سے زمانے میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ مذاق بدلتے جاتے ہیں ویسے ہی وہ مالی پیٹرن میں جدت دکھاتا ہے۔

دماغی مومیائی کا بھی یہی حال ہے۔ ہومر۔ زرتشت۔ ورجل۔ افلاطون۔ ارسطاطالیس بقراط۔ سقراط۔ شکسپیر۔ ملٹن۔ فردوسی۔ سعدی۔ حافظ۔ والمیک کے نام بھی مدتوں تک قائم رہینگے۔ نہ ازل کی خبر ہے نہ ابد کی معلوم نہیں یہ دنیا کب پیدا ہوئی تھی اور کب تک قائم رہیگی۔ یہ تو ضرور ہے کہ ایک روز یہ دنیا فنا ہوجائے گی۔ اُس کی ہر چیز فانی۔ فانی سے کیا مراد ہے۔ نیست و نابود نہیں ہوگی۔ یہ تو ناممکن ہے۔ کیونکہ دنیا جزو خدا ہے اور خدا لافانی ہو صرف یہ ہوگا کہ دوسری صورت اختیار کرے گی۔ وہ کیا صورت ہوگی صرف خدا کو معلوم ہے یا اُس کے پاک رسول کو معلوم ہے۔

لیکن جب تک دنیا قائم ہے یہ دماغی مومیائی روز بروز ترقی کرتی جائے گی پُرانے طرز معاشرت تبدیل ہوں گے نئے قائم ہونگے۔ ایک دن وہ ہوگا کہ لوگ فردوسی وغیرہ کے نام سے ناآشنا ہوں گے اُن کی تصانیف سے بے بہرہ ہونگے۔ اب عبرانی زبان کے جاننے والے کتنے ہیں؟ گو ایک زمانے میں غالباً یہ مصر کی زبان ہوگی۔ پُرانی ژند و پہلوی زبان کے جاننے والے اب کتنے ہیں؟

زمانۂ حال میں چھاپے کے ذریعہ سے یہ دماغی مومیائی بہت ترقی کرتی جارہی ہے۔ لیکن افسوس کہ کثرت میں وہ جدت کہاں جو وحدت میں ہو۔

اب تو ہر باغ میں ایسے پھول لگائے جا رہے ہیں جن میں خوشبو نہیں ہو صرف رنگینی ہو۔ مطالب نہیں ہیں۔ صرف رنگینیٔ الفاظ ہو۔ کوئی جدت نہیں ہو۔ پہلے ایک لمبا چوڑا اشتہار شائع ہوتا ہو کہ ایک ایسی کتاب اردو زبان میں لکھی جائے گی جو کبھی کسی نے نہیں دیکھی ہو۔ بڑے بڑے علما کی کمیٹی اس کے لیے قائم ہوئی ہو وغیرہ وغیرہ جس طرح ملکی حالات میں کمیشن کا قائم ہونا اس بات کا نشان سمجھا جاتا ہو کہ کسی ملکی مصلحت سے کسی بات کو فوراً عمل میں لانا منظور نہیں اسی طور سے یہ کمیٹی قائم ہوتی ہو۔ کمیشن کی رپورٹ کی طرح اس ضخیم کتاب کا ملک کو مدت تک شوق رہتا ہو۔ لیکن جب کتاب شائع ہوتی ہو تو معلوم ہوتا ہو کہ معمولی باتیں ذرا نمک مرچ ملا کر چھاپ دی گئی ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ قدرت کا مالی کہیں ان دھوکوں میں آتا ہو؟ ہرگز نہیں۔ آپ نے ورق ادھر ادھر الٹے اور پھر کتاب کو کسی گوشے میں ڈال دیا۔ دماغ کی دمیانی کے لیے دماغ کی ضرورت ہو۔ کتاب لکھنا آسان کام نہیں ہو۔ بڑی کٹھن منزل ہو یوں تو روزمرہ کتابیں شائع ہوتے ہیں۔ مضامین شائع ہوتے ہیں یہ ہی کافی ہیں۔

جب میں کسی کتب خانے میں جاتا ہوں تو فوراً دل میں خیال آتا ہو کہ کتنے مُردے کس اطمینان سے یہاں سو رہے ہیں۔ کسی کے دماغی تابوت پر سونے کا غلاف چڑھا ہوا ہو کسی کی جلد سنہری اور خوبصورت ہو۔ دل کو خوشی ہوتی ہو۔ دیکھو جو ان میں سب سے زیادہ پُرانی موسیانی ہو اس میں کیڑے لگ گئے ہیں۔ لیکن کوئی ہرج نہیں ہو دوسری چھپ جائیگی خدا نے کوئی سی دو چیزیں دنیا میں یکساں پیدا نہیں کی ہیں۔ دنیا مدت سے ہی کچھ دنوں سے فونوگراف بھی جاری ہو۔ لیکن کیا تم دکھا سکتے ہو کہ دو آدمیوں کے بولنے کا لہجہ یکساں ہو۔ ضرور فرق ہوگا۔ دو صورتیں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ دو آوازیں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ یہ اس

کی وحدانیت و شناسائی کی دلیل ہو کسی دماغی موسیقی لے لو ہر ایک اپنے رنگ کی نرالی ہو۔ دس کتابیں سامنے رکھو۔ ہر ایک کو دس دس سطر پڑھو ہر شخص کا انداز جداگانہ ہوگا اچھا معلوم ہوتا ہے کہیں گلاب ہے کہیں سنبل کہیں چنبیلی ہر ایک میں جداگانہ مزہ ہے خوشبو لگا کے کچھا ہوا ہے کہیں اندر دل کو حوتی ہوتی ہے۔

جس زبان میں دماغی نسبت سے ادا کرنے کے الفاظ زیادہ ہوں گے اُس زبان کی دماغی موسیقی زیادہ دیرپا ہوگی۔ جس زبان میں دوسری کی طرح صرف گل و بلبل کے الفاظ زیادہ ہو گئے اُس کی دماغی موسیقی زیادہ دن نہیں چلے گی جس درخت میں نئی کلے پتے زیادہ ہوتے ہیں اُن میں پھل کم آتے ہیں جس درخت میں پھل زیادہ ہوتے ہیں اُن میں پتی کم ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اردو زبان کی موسیقی دیرپا ہوگی یا نہیں۔ اس کی نسبت آئندہ لکھا جائے گا۔

کلامِ اکبر

ظلم جتنے ہیں وہ ہم پر ہی کیے جاتے ہیں
ہم بھی ایسے ہیں کہ اس پر بھی جیے جاتے ہیں

بزمِ طرب میں بھی جو حزیں تھے حزیں رہے
دل اُس کا اُس کے ساتھ ہے گو وہ کہیں رہے

منظور ہے مجھے شکوۂ بیدادِ بتاں سے
للہ بتا دے کوئی اللہ کہاں ہے؟

گرامی نامہ حضرت اقبال

مکرمی — تسلیم

[illegible] اشعار حاضر ہیں

از من اے بادِ صبا گوے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

برق را ایں بجگر می زند آں رام کند
عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است

چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

محمد اقبال
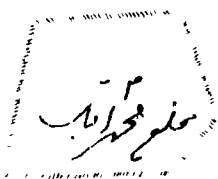
از من اے بادِ صبا گوے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

برق را ایں بجگر می زند آں رام کند
عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است

چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

"ذاتیات"

کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور مستشرق پروفیسر براؤن نے ایران کے اخبارات کا ایک دلچسپ تذکرہ لکھا تھا جو چند سال ہوئے شائع ہو چکا ہے۔ اہلِ مشرق اور خصوصاً مسلمانوں کی اخبار نویسی کے متعلق اپنی قسم کی یہ ایک ہی کتاب ہے۔ . . . . . .

اقبال کہتا ہے:-

"دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں"

میں "دوش" سے قطع نظر کر کے عہدِ حاضر کے آئینہ میں "فردا" کو دیکھنا چاہتا ہوں براؤن صاحب ہوں یا اقبال یہ سب تقلید کے بندے ہیں۔ میرے مذہب میں تقلید گناہ ہے (مقلد و غیر مقلد حضرات مذہبی بحث کی جانب رجوع نہ فرمائیں!) . . . . . میں عرصے سے سوچ رہا تھا کہ دس بیس برس بعد جب ہندوستان میں امن و سکون کامل ہو اور ہم سب حکومت برطانیہ کے گوناگوں برکات سے متمتع ہو رہے ہوں، میں ایک اخبار نکالوں جس کا نام زیبِ عنوان ہے۔ محض تخیل نہ سمجھیے، میری ساری اسکیم تیار رہی۔ ۱۹۵۷ء میں غدر کے پورے سو برس بعد یہ اخبار جاری کیا جائے گا، یہ فخر اڈیٹر صاحب نقیب ہی کا حصہ ہے کہ سب سے پہلے آج "ذاتیات" کا اشتہار اُن کے رسالے میں شائع ہوتا ہے۔

دنیا کا موجودہ عہد ایک عالمگیر بےچینی اور بدامنی کا عہد ہے جس میں تمام انسانی قویٰ میں یکسر ہیجان برپا ہے اور کوئی کچھ نہیں جانتا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ مسجد کے مولوی

صاحب جب شام کو اپنے حجرے کی چھت پر کھانا کھا کر بیٹھے ہوتے ہیں اور اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں کہ ان کے لیے شیخ صاحب کے یہاں سے جو کھانا آتا ہے اس میں روغن زرد روز بروز کیوں کم ہوتا جاتا ہے۔ تو بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اب قیامت قریب ہے اور قیامت کے آثار ظاہر ہوتے جاتے ہیں ....

فلاسفی جب کالج کے لڑکوں کو پڑھا کر گھر آتا ہے تو اس کا تھکا ہوا دماغ تسکین خود اختیاری کے اصول پر یوں استنباط نتائج کرتا ہے کہ قوی فطرت کا یہ ہیجان لازمی ہے جو تمدن انسانی کو ارتقا کے اعلیٰ مدارج کی جانب لیے جاتا ہے! ....

سیاست داں کا خیال ہے کہ اگر یہ ہیجان قائم رہا تو خواہ غلہ سستا ہو یا نہ ہو لیکن ملک میں بہت سی اصلاحات ہو جائینگی اور محکوم قوموں کو روٹی کے بدلے "حقوق" تو ضرور ہی مل جائیں گے!

ہندوستان کے شاعر کو ابھی یہ خبر نہیں کہ بولشویک فرقہ نے جو انقلاب کا علم لیے چلا آتا ہے، اپنے یہاں عورتوں کو افراد کی ملکیت سے نکال کر قوم کی عام ملکیت قرار دیدیا ہے، ورنہ وہ بھی اس مضمون کو سوطرح سے باندھتا،

غرضکہ

خواب یک خواب است اما مختلف تعبیرہا

میں کہتا ہوں کہ یہ سب غلط۔ ہندوستان میں انشا اللہ سب خیر و عافیت رہیگی اور ہم ان شاء اللہ ہمیشہ امن و امان کے ساتھ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گاتے رہینگے۔ اصول حکومت میں جو اصلاحیں ہو رہی ہیں ان کا لازمی نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ "امن عامہ" کا نازک پھول سدا بہار ہو جائے یہ وہ زمانہ

ہوگا کہ ہندوستان میں سوائے داڑھیوں کے ہر چیز روز افزوں ترقی کرے گی۔ ملک میں کمزوری اور ضرورت سے زیادہ مجلد ارضابطۂ فوجداری منسوخ ہوجائے گا اور اس کی جگہ قانون تحفظ ہند (مختصر اور زود اثر) اور مارشل لا (تیز وگرم) کے قوانین نصب ہوں گے جن میں سے عدل و انصاف کے دریا دودھ کی طرح سفید اور شہد سے زیادہ میٹھے بہا کرینگے۔ دنیا جس یوم راحت کا انتظار کر رہی ہے وہ انشاءاللہ سب سے پہلے ہندوستان ہی میں شروع ہوگا۔ عدالتوں کے اخراجات جو بڑی بڑی ریاستوں کو تباہ کرتے ہیں برائے نام باقی رہینگے۔ وکلا جو لاکھوں کا گھر خاک میں ملا دیتے ہیں عرائض نویسی کریں گے یا دفتروں میں ملازمت کے جویاں ہوں گے۔ ہر مقدمہ کے صرف دو فریق ہوں گے۔ پولیس اور رعایا! سول مین جج جو ناحق بال کی کھال نکالا کرتے ہیں پرانے کتب خانوں اور محکمہ اعداد و شمار میں بھیج دیے جائینگے۔ ان کے بجائے جج کی کرسی پر فوجی افسران بٹھائے جائیں گے جن کی تلوار کی دھار میں انصاف کا جوہر اصلی دمکتا ہوگا۔ خیر و برکت کا یہ زمانہ دنیا کو جنت النعیم بنا دے گا۔ اخباروں کے فضول نویس ایڈیٹر بقول ظفر علی خاں صاحب "دور انہ کار سیاست" سے کنارہ کش ہو کر خالص اخلاقی مضامین لکھا کریں گے۔ چنانچہ میرا اخبار بھی اس قسم کا بہترین نمونہ ہوگا۔ سب سے پہلے حسب ذیل اشتہار شائع کیا جائیگا جس کا مسودہ میں اس وقت خاص ناظرین نقیب کے لیے بصیغۂ راز پیش کرتا ہوں ابھی عام لوگوں کو اس اشتہار کے پڑھنے کی اجازت نہیں۔ خصوصاً اس زمانے کے وہ اخبار نویس جو ہوم رول مانگتے ہیں ہرگز نہ پڑھیں ورنہ ہم فوراً اوڈائر صاحب کو شکایت کا خط لکھینگے اور ممکن ہوا تو کرنل فرینک جانسن صاحب سے بھی ملنے جائینگے! اعلان مذکور بصیغۂ راز ملاحظہ ہو:۔

اعلانِ عام:-

ہم کو قومی درد کا ایک شدید دورہ پڑ رہا ہے۔ احباب و اطبّا علاج کرتے کرتے تھک گئے اب ہم اپنے قومی جذبات کو روک نہیں سکتے لہٰذا مجبور ہو کر اعلان کرتے ہیں کہ "قوم" کے لیے اب ہم اپنا تن من دھن قربان کر دیں گے۔ امید ہے کہ قوم ہمارے اُن احسانات کو جو ہم اُس پر کرنے والے ہیں بھول نہ جائے گی بلکہ ہمارے بعد اگر ضرورت ہوگی۔ تو ہمارے اہل و عیال کے لیے ایک معقول پنشن مقرر کر دے گی، اے قوم ہم تیرے لیے مرتے ہیں۔ اب ہم نے رستم کی طرح ہفتخواں کے طے کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ چنانچہ اس اعلان کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنے قومی درد سے مجبور ہو کر آخرکار ایک اخبار نکالنے والے ہیں۔ چونکہ اس زمانے کے لمبی زبان والے اخبار نویسوں نے لغو اور بے معنی مضامین لکھ لکھ کر اس شریف پیشے کا اعتبار رکھو دیا ہے۔ اس لیے ہم پہلے سے اپنے اخبار کا ایک نمونہ بھی چھاپے دیتے ہیں تاکہ لوگ اچھی طرح دیکھ لیں کہ ہم کس جانبازی کے ساتھ اپنی پیاری قوم کی خدمت کرنے والے ہیں۔ ہائے قوم! ہماری جان تجھ پر قربان!

ہمارے اخبار کا حجم کم از کم سو صفحے ہوگا اور تقطیع ۲۶ × ۲۰۔ قیمت والیان ملک سے بصیغۂ راز، گورنمنٹ سے کچھ نہیں، روساء و تعلقداران سے بقدرِ اشکِ بلبل، عامۃ الناس سے پچاس روپیہ سال۔ نقد قیمت پیشگی آنی چاہیے۔ وی۔ پی روانہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہم ہر حالت میں پوسٹ ماسٹر جنرل صاحب کے محکمے کی آسائش کا خیال رکھنگے۔

اہلِ پولیس و سی۔ آئی۔ ڈی۔ کو ہر پرچے کے ساتھ ایک اشرفی مٹھائی کھانے کے لیے دی جائے گی! اتنی رعایتوں کے بعد بھی اگر ہمارا اخبار نہ چلا تو ہم یقیناً "قوم" کی ہجو لکھنگے

خواہ کوئی بُرا کہے یا اچھا۔

خبروں کا ہم نے خاص انتظام کیا ہی تاکہ جلد اور تازہ ملیں۔

نمونہ ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۱

کلام سنانیں کے

مختصر نوٹ اور خبریں

برقیات
(گاؤکشی)

الٰہ آباد - ۱۱ فروری - آنریبل سید رضا علی کل رات پنڈت مدن موہن مالوی کے یہاں مدعو تھے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس موقع پر مسئلۂ گاؤکشی زیر بحث آیا۔ پنڈت صاحب کا کمال رونوں کے ساتھ بیان کرتا ہی کہ آنریبل سید رضا علی صاحب نے ترکِ گاؤکشی کا حلف اُٹھایا۔

ایک عظیم الشان مشاعرہ

بانکی پور - ۱۰ فروری - اطلاع ملی ہی کہ مسٹر حسن امام کے مکان پر عنقریب ایک عظیم الشان مشاعرہ ہونے والا ہی جس میں امید کی جاتی ہی - کہ بابو دنی لال گھوش اور مسٹر سی - آر داس بھی حصہ

افسوسناک حادثہ

احمد آباد - ۹ فروری - مسٹر گاندھی ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق جس بکری کا دودھ پیتے تھے اس کا دفعتاً کل شب ۱۱ بجکر ۵ منٹ پر انتقال ہو گیا - مرض کی تشخیص نہیں ہو سکی - مرحومہ کی عمر تخمیناً ۵ سال بتائی جاتی ہی - رنگ سیاہ تھا۔

(ہمیں پسماندگان سے دلی ہمدردی ہی)
(اڈیٹر ذاتیات)

آنریبل مولوی رفیع الدین احمد

بمبئی - ۹ فروری - آنریبل مولوی رفیع الدین احمد صاحب بمبئی کے شریف منتخب ہو گئے -

راجہ صاحب محمود آباد

قیصر باغ۔لکھنو۔۱۰فروری۔کل شام دفعتاً راجہ صاحب کا مزاج بے مزہ ہوگیا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کو بغرض علاج طلب کیا گیا ہے

مقامی حالات

ناظرین یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ہمارے ضلع کے مشہور رئیس جناب خان بہادر نواب مکلف علی خاں صاحب کے بڑے صاحبزادے کو از راہ رعایا پروری گورنمنٹ نے چند مواضعات کا پٹواری مقرر کر دیا۔ اِس عنایت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کل شام کو باغ عامہ میں ایک عام جلسہ منعقد ہوگا جس میں شکریے کے رزولیوشن پاس کیے جائیں گے

کل شام ہماری میونسپلٹی کے چیرمین صاحب کو جنٹ صاحب نے چاء نوشی کے لیے مدعو فرمایا تھا۔معلوم ہوا کہ دونوں صاحبوں میں تقریباً ۱۵ منٹ تک تخلیہ رہا۔

موسم نہایت خوشگوار ہے۔آج صبح سخت بارش ہوئی جس کی وجہ سے ہمارے دفتر کی ایک دیوار گر گئی۔

چونکہ کل رات ہمارے پریس مین کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی اس لیے وہ آج کام نہ کر سکا۔چنانچہ کل کا پرچہ شائع نہ ہو سکیگا۔ناظرین معاف فرمائیں۔
(اڈیٹر)

اشتہارات و تنقید

قانون تحفظ ہند با تصویر:۔ بچّوں اور بوڑھوں کے لیے یکساں مفید۔سنہ ۱۹۱۸ء کی بہترین اخلاقی تصنیف ہے جو عنقریب تمام مدارس کے طلباء کو بھی پڑھائی جایا کریگی اس میں وہ اُصول درج اور وہ باتیں لکھی ہیں جن کو پڑھ کر ہماری آیندہ نسلیں نیک خصال اور معزز پیدا ہوں گی۔جا بجا سبق آموز تصاویر بھی دی گئی ہیں تاکہ پڑھنے والا خواہ

کتنا ہی کوڑ مغز ہو معنی اور مفہوم کو بلا تامل سمجھ جائے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ مدرسہ دیوبند میں پڑھایا جاتا ہی۔ قیمت فی جلد ۱۲ علاوہ محصولڈاک

ظاہر ہیں۔ شرح نہایت بے مثل ہی۔ کتاب کا دیباچہ کرنیل فرنیک جانسن صاحب نے تحریر فرمایا ہی۔ اور اصول مارشل لا پر سرمائیکل اوڈائر نے ایک نہایت عالمانہ مقدمہ لکھا ہی قیمت ۸ معہ محصول ڈاک

مارشل لا مع شرح۔ مرتبہ و مترجمہ آنریبل میاں محمد شفیع صاحب۔ نام سے کتاب کی خوبیاں

المقدم کتب خانہ لاہور۔

ایڈیٹوریل مضامین کا نمونہ ابھی ہم شائع کرنا نہیں چاہتے۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ ایک صفحے کا نمونہ کافی ہی۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس قسم کے اخبار کی کس قدر ضرورت ہی اور وہ جب جاری ہوگا تو ملک و قوم کے لیے کس قدر مفید ثابت ہوگا۔ خریداران ابھی سے درخواستیں معہ چندہ نقد ارسال کریں چونکہ پرچہ ۱۹۱۵ء سے پہلے شائع نہ ہوگا اس لیے جو صاحبان چندہ ادا کرنے کے بعد اور اخبار جاری ہونے سے پہلے دار فانی سے انتقال فرما جائیں گے۔ ان سے ہم حلفیہ وعدہ کرتے ہیں کہ ان کے نام کا پرچہ ان کے ورثا کے پاس اوقات مقررہ پر ضرور بھیجا جائیگا۔ ہمارا پتہ و نشان ایڈیٹر صاحب نقیب سے دریافت کیجیے

ہی سوزِ دل سے پیدا اک آگ سی بدن میں
خاموش جل رہا ہوں دنیا کی انجمن میں

روتا ہوں یاد کر کے اپنا جنونِ وحشت
گلچیں سے جیب و داماں پر دیکھ کر چمن میں

حیران کر دیا ہی اسرار زندگی نے
شرمندہ ہو رہا ہوں لیکر زباں دہن میں

بیتاب ہم نہیں ہیں دلدار تو نہیں ہی
کچھ فرق آگیا ہی ہر ایک کے چلن میں

لو جانِ منتظر تو مایوس ہو کے چل دی
اب بعدِ مرگ لاشہ تڑپا کرے کفن میں

اب تک تو آبرو سے گذرا تھا عہدِ غربت
اب دیکھیے بسر ہو کس رنگ سے وطن میں

(اعجاز)

افکارِ ثاقب

جناب مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب قزلباش

آئے نہ آنچ سوزِ جگر کے بیان پر — چھالوں نے جال ڈال دیا ہی زبان پر

کس بسملِ جفا پہ قضا مہربان ہی — کروٹ بدل رہی ہی تری تیغ سان پر

میرے بیان سے وہ نہ سمجھے مذاقِ عشق — یہہ ذائقہ وہ تھا جو نہ آیا زبان پر

اے مے پرست شیشۂ دل بھی بغل میں ہی — گرنا سنبھل کے پیرِ مغاں کی دکان پر

وہ سنگدل سہی مگر اتنا ہی مجھ کو یاد — آنسو ٹپک پڑے تھے مری داستان پر

عمرِ شبِ فراق اُسی طرح ہی دراز — نالوں نے جا کے کچھ نہ کیا آسمان پر

پہلے یہہ شوق تھا کہ ہو دل آشنائے درد — اب دردِ دل ملا تو مصیبت ہی جان پر

دورِ فلک نے مجھ کو اُٹھا بھی دیا تو کیا — دل کو بٹھا دیا ہی ترے آستان پر

کثرت پہ اپنے نالوں کی بھولا ہوا ہی دل — کچھ اور آسمان بھی ہیں آسمان پر

کعبہ کدھر ہی شکر کا سجدہ ادا کروں — اللہ آپ آئے ہیں میرے مکان پر

مارا مجھے کسی نے وہ ہوں یا سپہر ہو — میں کس کا نام لوں فقط اپنے گمان پر

کیا جانے کب گئے درِ ساقی سے کب پھر آئے — نشہ اُتر گیا تو کھڑے تھے دکان پر

میری طرح ہی حال مرا اُن کا خیر خواہ — عاشق ہی اُن کی نیند مری داستان پر

یہہ تلخ کامیوں کا اثر ہی کہ نزع میں — کچھ موت کا مزہ نہیں کھلتا زبان پر

ثاقب جہاں میں عشق کی راہیں ہیں بے شمار
حیران عقل ہی کہ چلوں کس نشان پر

زبانوں اور علوم و فنون کے بنیادی ذرائع

از جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

تمام علوم و فنون کے اعلیٰ ذرائع صرف یہ چند ہیں۔ ممکن ہے کہ اور ذرائع بھی ہوں، مگر استقرائی تحقیقات کی رو سے تمام علوم و فنون انہیں ذرائع کے ماتحت نشو و نما پاتے ہیں:۔ (الف) سماعت (ب) بصارت (ج) لمس (د) شامہ (ہ) ذائقہ (و) تخیل۔ تخیل اور تفکر ان سب بقیہ ذرائع سے وابستہ ہے گو کہ تخیل کے الگ فرائض بھی ہیں لیکن باقی سب ذرائع کے ساتھ ہی یہ لگا رہتا ہے۔ اگر یہ کل پانچ ذرائع نہ ہوتے تو انسان کسی علم اور کسی فن کی بنیاد نہ ڈال سکتا۔ یہ ذرائع گو بعض دوسری زندہ مخلوق کو بھی ایک حد تک حاصل ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں دوسری مخلوق بھی اُن سے کام لیتی ہے۔ مگر وہ کمال اور وہ خوبی اور وہ وسعت حاصل نہیں جو انسان کے حصے میں آئی ہے یہی وجہ ہے کہ دوسری مخلوق انسانی کمالات تک نہیں پہنچ سکتی۔ حالانکہ انسان کے تمام کمالات معاشرت و تمدن و معاد انہیں ذرائع پر موقوف ہیں کوئی ایسا علم اور کوئی ایسا فن اور کوئی ایسا کمال نہیں جو ان ذرائع سے کسی نہ کسی جہت سے وابستہ نہ ہو۔ جو انسان نہ سُن سکتا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے۔ اور نہ خیال کر سکتا ہے نہ چھونے سے نہ سونگھنے سے کچھ معلوم کر سکتا ہے وہ کائنات اور موجودات کی گوناگوں کیفیات اور تاثرات سے کیا کچھ حاصل اور استدلال کر سکتا ہے؟ دنیا کے کل مناظر اور کائنات کے کل مراحل انہیں ذرائع

کے ماتحت رکھے گئے ہیں اور انھیں پر تمام انسانی کمالات کا مدار ہی۔

دوسرے الفاظ میں تمام انسانی علوم و فنون اور کمالات کی بنیاد :۔ (الف) آوازیں (ب)۔ مناظر (ج)، احساسات (د) تخیلات ہیں

غور کرنے کے بعد معلوم ہوجاے گا کہ کوئی علم۔ فن۔ کمال اُن سے باہر نہیں۔ زبان کی بنیاد بھی انھیں ذرائع پر ہی۔ کوئی زبان ان سے باہر نہیں جاسکتی۔ گو مختلف زبانوں کی صورت ترکیب اور وسعتِ طلاقت جداگانہ ہی اور اگرچہ ہر ایک زبان کی الفاظ بیانی ترکیبات میں بہت کچھ تضاد ہی۔ مگر ان ذرائع یا موجبات سے خارج نہیں ہیں۔ ہر زبان آواز۔ منظر۔ احساس اور تخیل کے تابع ہی۔ زبانوں کے تمام اجزائے صغیرہ وکبیرہ بے معنی و با معنی ان پانچوں اجزا سے مربوط ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہہ کہنا چاہیے کہ ان اجزا کی ترکیب اور تعلم کا نام ہی زبان ہی اور یہہ کہ ہر زبان آوازوں کی تابع ہی۔

گو زبان کا شروع تخیل سے ہوتا ہی اور خیال ہی کے تابع آوازیں بھی خارج ہوتی اور دوسروں تک پہونچتی ہیں۔ لیکن تخیل آواز ہی کی صورت میں وجود پذیر ہوتا ہی اگر آواز کی صورت اختیار نہ کرے تو اس کی ہستی اندر ہی اندر رہ کر ختم ہوجانے۔ خیال ایک ایسی آواز ہی جو اندر سے باہر نہیں نکلتی آواز ایک ایسا خیال ہی جو اندر سے خارج ہوکر باہر کی ہوا سے مخلوط ہونے کے بعد ظاہر ہوتا ہی جو کچھ ہم بولتے یا سنتے ہیں وہ دراصل ایک خیال ہی ہوتا ہی جو آواز کی صورت میں ہم تک پہنچتا یا پہنچایا جاتا ہی۔ جب زید بکر سے یہہ کہتا ہی کہ "میں یہہ چاہتا

ہوں تو ایک آواز کی صورت میں یہ زید کا وہ خیال ہو جو اس کے اندر پرورش پاکر باہر نکلا ہو اگر آواز کے قالب میں یہ نہ آتا تو بکر اس کو سن نہ سکتا گو اس کا موجد اول خیال ہو لیکن موجد ثانی وہ طریق عمل ہو جس کا نام آواز ہو:

آواز کیا ہو؟

جو کچھ ہم سنتے یا جو کچھ ہمیں سنایا جاتا ہو یہ ایک آواز ہو آواز صرف انسان ہی کے منہ سے نہیں نکلتی اور اجسام سے بھی آوازیں نکلتی یا سرزد ہوتی ہیں۔ ہر ایک قسم کی آواز آواز ہو صرف فرق یہ ہو کہ جو آواز انسان کے منہ سے نکلتی ہو اُس کو انسان کی بولی یا بولنے اور نطق سے تعبیر کرتے ہیں اور جو آوازیں دیگر زندہ مخلوق کے منہ سے نکلتی ہیں انھیں بعض آوازیا دیگر مختلف ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہو۔ جس قدر آوازیں ہمارے سننے میں آتی ہیں۔ یا جس قدر آوازیں سُنی جاسکتی ہیں وہ کسی نہ کسی قسم کے تصادم تضارب اور تقارب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جب تک تصادم تضارب اور تقارب نہ ہو اسوقت تک کوئی آواز نہیں پیدا ہوسکتی۔ اگرچہ یہ تصادم۔ تضارب اور تقارب بذاتہ کیوں نہ ہو انسان کے منہ سے اس وقت تک کوئی آواز نہیں نکل سکتی جب تک اُس کی باچھیں اور منہ نہ کھلے اور جب تک لب سے لب نہ ملیں یہ بھی ایک قسم کا تصادم۔ تضارب اور تقارب ہی ہو۔ انسان کی آوازوں کے سوائے اور جس قدر آوازیں ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں: (الف) حیوانی (ب) مادی۔

دیگر تمام جانوروں اور زندہ مخلوق کی آوازیں حیوانی ہیں یہ بھی قریباً اُسی طرح نکلتی اور اُسی طرح پیدا ہوتی ہیں جس طرح انسان کی آوازیں نکلتی اور پیدا ہوتی ہیں۔ مادی وہ آوازیں ہیں جو بے جان اجسام سے نکلتی یا سُنائی دیتی ہیں صرف فرق یہ ہو کہ انسانی اور حیوانی آوازوں کا کچھ نہ کچھ نام بالخصوص رکھا گیا ہو اور مادی آوازوں کا نام گو اسی نمط پر

نہیں رکھا گیا۔ لیکن پھر بھی ان میں سے اکثر آوازیں کچھ نہ کچھ نام رکھتی ہیں اور اُن کو بھی اکثر کسی نہ کسی نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر جیسے انسانی اور حیوانی بانیں خاص خاص ناموں سے مشہور رہیں وہ نہیں ہیں۔

آواز کس طرح پیدا ہوتی ہے

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ہر آواز تصادم۔ تضارب اور تقارب سے پیدا ہوتی ہے۔ بعض تصادم۔ تضارب اور تقارب کا ہم احساس کرتے اور کر سکتے ہیں اور بعض کا نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہم یہہ سمجھتے ہیں کہ ہوا کے چلنے کی آواز بغیر کسی تصادم کے ہے۔ یہہ درست نہیں ہوا کی آواز بھی تصادم ہی کی وجہ سے نکلتی ہے۔ بجلی کی کوند اور بادل کے گرجنے کی آواز بھی تصادم کی وجہ سے ہی ہے۔ مینہ برسنے کی آواز بھی بہ وجہ تصادم کے ہے۔ انسان کی بھی تمام آوازیں تابع تصادم۔ تضارب و تقارب ہیں۔

کچھ تصادم۔ تضارب اور تقارب اندرونی اجزائے دہن کی اور کچھ ہوا کی وجہ سے ہوتا ہے اور ان دونوں کے ملنے سے آواز نکلتی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ مارنے سے جو آواز نکلتی ہے وہ بھی تصادم اور ہوا کی وجہ ہی سے نکلتی ہے۔ بندوق چلانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ بھی ہوا کے تصادم کی وجہ سے ہے ٹھوس اجسام پر جب کوئی ضرب لگتی ہے تو اُن سے بھی ایک ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جو دوسرے سن سکتے ہیں لیکن جب پولے اور نرم اجسام پر کوئی ضرب لگتی ہے تو وہ کم سُنائی دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہوا کا تصادم اشیاء کے نرم ہونے کی وجہ سے کم زور پڑ جاتا ہے۔ روئی کا تصادم اور لکڑی کا تصادم الگ نہیں ہو سکتا۔ یہہ بات کہ روئی تصادم سے آواز نہیں دیتی ہے درست نہیں۔ آواز دیتی ہے مگر اُس میں بوجہ پول اور نرمی کے ہوا کی ضرب ہلکی پڑ جاتی ہے۔ دیکھو پانی میں جب لاٹھی ماری جائے تو اُس کی آواز لکڑی پر لاٹھی مارنے

کی آواز سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح جب کسی بند کان میں آواز دی جائے یا
منہ ڈھانپ کر آواز دی جائے تو وہ کم سنائی دے گی۔ کیونکہ ان حالات میں تداخل ہوا
یا تصادم ہوا پورے زور سے نہیں ہوتا بلکہ ہوا رک رک کر داخل ہوتی اور نکلتی ہے۔ آواز
اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب ہوا داخل ہو کر نکلتی ہے۔ دیکھو جب آدمی سانس اندر کو
کھینچتا ہے تو آواز کا زور کم ہوتا ہے لیکن جب سانس باہر کو لیتا ہے تو آواز زور سے نکلتی ہے
ایک لکڑی پر دوسری لکڑی یا ایک لوہے کی سلاخ پر دوسری سلاخ لوہے کی جب مارتے ہیں
تو دونوں سے مختلف آوازیں نکلتی ہیں۔ ضرب ایک ہی وزن اور ایک ہی پیمانے کی
ہوتی ہے لیکن ہوا کا تداخل اور تصادم دونوں مختلف اجسام میں جداگانہ طور پر ہوتا ہے
چونکہ لوہے کے اجزا میں ہوا کا تداخل لکڑی کے اجزا کی طرح نہیں ہوتا اس واسطے لوہے
کی آواز میں نسبتاً تیزی اور سبکی زیادہ ہوتی ہے اور لکڑی کی آواز میں ایک قسم کی ثقالت
اور وزن پایا جاتا ہے اور سننے والا فوراً سمجھ لیتا ہے کہ ایک لکڑی کی آواز ہے اور دوسری لوہے کی۔
ڈھول اور باجوں میں جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور سُر نکلتے ہیں وہ بھی تضارب اور
ہوا ہی کا اثر ہے اگر ہوا کا تداخل نہ ہو اور اس تداخل کی وجہ سے تضارب اور تقارب کی
صورتیں نہ پیدا ہوں تو باجوں کی گتیں اور آوازیں پیدا ہی نہ ہوں۔ سارنگی میں سے جو
آوازیں اور جو سُر نکلتے ہیں اُن کی وجہ بھی یہی تضارب اور تقارب ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپ
کی آوازیں صرف گھوڑوں کے پاؤں ہی کی نہیں ہوتیں۔ بلکہ اُن میں ہوا کا بھی دخل ہوتا ہے
اگر ہوا کا تداخل نہ ہو تو ایسی آوازیں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ دیکھو سخت اور ٹھوس زمین پر
گھوڑوں کی ٹاپ کی آوازیں ویسی نہیں ہوتیں جیسے نرم زمین پر چلنے سے پیدا ہوتی ہیں۔
نرم زمین میں گھوڑوں کے پاؤں کھب جانے کی وجہ سے ہوا کے تداخل میں کم زوری پیدا

اور جتنا جسم پولا اور نرم ہوگا اتنا ہی ہوا کا تداخل بھی کم زور اور نرم ہوگا۔ روئی پر ہاتھ مارنا بہ نسبت لکڑی اور چمڑے پر ہاتھ مارنے کے ہمیشہ نرم آواز دے گا۔

آگ جب ہوا میں جلائی جائے گی تو اوس کی آواز اور شعلہ کسی اور صورت کا ہوگا اور جب اندر جلائی جائے گی تو کچھ اور کیفیت ہوگی۔ لیمپ کی بتی ہمیشہ ہوا میں لرزتی اور آواز دیتی ہے لیکن جن میں ہوا کم ہوگی اوتنی ہی سکون نما ہوگی کاغذ تھوڑی ہوا میں وہ آواز نہیں دیتا جو تند ہوا میں دیتا ہے۔ پتنگ تیز ہوا میں شاں شاں کی آواز دیتی ہے۔ لیکن کم ہوا میں ایسی آواز نہیں نکلتی۔ جب تک کوئی چیز ہلتی نہیں یا جب تک کسی شے کو حرکت نہ دی جائے اس وقت تک آواز یا تو نکلتی ہی نہیں اور یا بہت ہی کم نکلتی ہے۔ حرکت اور جنبش سے ہوا پیدا ہوتی ہے اور جو ہوا پیدا ہوتی ہے اس سے آواز نکلتی ہے دیکھو کہ اگر حرکت اور جنبش نہ دی جائے تو اس سے ہوا نہیں نکلتی اور نہ اوس ہوا میں سے آواز نکلتی ہے۔

اشکال آواز

جتنی آوازیں مختلف اجسام یا مختلف طریق سے پیدا ہوتی اور نکلتی ہیں۔ اُن سب کی کوئی نہ کوئی شکل اور ہیئت ہوتی ہے۔ جو کچھ انسان منہ سے نکالتا اور بولتا ہے وہ آواز یا آوازیں ہیں اور اُن کی کوئی نہ کوئی شکل اور ہیئت ہوتی ہے ایک اخبار میں کسی وقت یہ نکلا تھا کہ ملک امریکہ میں ایک ایسا آلہ ایجاد کیا گیا ہے جس سے یہ ثابت کیا جائیگا کہ انسان جو کچھ بولتا اور کہتا ہے اُس کی ہیئت اور شکل کھینچی جا سکتی ہے۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک درست ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ انسان بولتا اور کہتا ہے یا جو جو آوازیں مختلف اجسام سے نکلتی اور سرزد ہوتی ہیں اُن سب کی کوئی نہ کوئی شکل اور ہیئت ہوتی ہے۔ گراموفون اور فونوگراف میں جسقدر آوازیں لی جاتی ہیں اُن سب کی اس طریق عمل سے اشکال ہی منعکس ہوتی اور اترتی ہیں جس

وقت انسان بولتا ہو یا کسی اور طرح پر کسی جسم سے کوئی آواز نکلتی ہو تو ہوا میں اس کی شکل بن جاتی ہو یا یہ کہ وہ ایک قسم کا وجود اختیار کرتی ہو اگر ایسا نہ ہو تو ایک آواز دوسری تک پہنچے ہی نہیں۔ ہوا ایک دائرہ کی شکل میں اس کو دوسروں تک پہنچاتی ہو۔ ہوا اس [illegible] نے ایک لچک پیدا کی، دوسرے اس لچک میں ایک مادہ رکھا گیا ہو۔ جب کوئی آواز اپنے مرکز سے نکلتی ہو تو وہ مادہ اُسے اپنے آپ میں جذب کر کے ایک ہیئت یا ایک شکل بخشتا ہو اور اس ہیئت یا اس شکل کی صورت میں دوسروں تک اسے پہنچا دیتا ہو۔ ہمکو سورج کی کرنیں اور روشنی سے ذرات مختلف اشکال میں جلوہ افروز اور رونما معلوم ہوتے ہیں۔ غور سے دیکھوگے تو معلوم ہو جائے گا کہ سورج کی کرنیں مختلف رنگوں اور مختلف اشکال میں منعکس ہوتی ہیں جس طرح آفتاب کی کرنیں ہر ظرف کے مطابق اشکال اختیار کرلیتی ہیں اس طرح پر ہوائی کرہ میں بھی مختلف آوازوں کے واسطے مختلف اشکال کے دائرے یا مختلف قالب بنتے جاتے ہیں اور ہر آواز اُن دائروں اور اُن قالبوں کے مطابق شکل اختیار کرتی جاتی ہو۔ گو ہم ایسی اشکال کا مشاہدہ آنکھوں سے نہیں کرسکتے۔ لیکن ہوا کے دیگر تصرفات ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ ایسا ہونا ضرور ہو۔ اگر ہم نے گراموفون کا تماشا نہ دیکھا ہوتا تو ایسی آوازوں کا بھی یقین کرنا بہت کچھ مشکل ہو جاتا۔ گراموفون میں دراصل مختلف قسم کی صدائی اشکال ہی کا عکس اترتا ہو اور وہی عکس پلیٹ رکھنے سے سنائی دیتا اور صدائی رنگ میں نمایاں ہوتا ہو۔ پلیٹوں میں تمہیں ایسی منجمد یا منعکس آوازوں کا کوئی نشان یا کوئی کتبہ نہیں ملے گا یہ اس واسطے نہیں کہ دراصل کوئی نشان یا کوئی کتبہ نہیں ہو بلکہ اس لیے کہ جس طرح ہوا دیکھی نہیں جاسکتی اُسی طرح اس کے خط اور اوس کی کتابت کا بھی مشاہدہ یا تماشا نہیں ہوسکتا۔ جب ہم منہ میں لفظ اکبر۔ اعلیٰ۔ ارفع۔ خدا۔ اب۔ گاڈ۔ پرمیشر بولتے یا کہتے

ہیں تو جس طرح کاغذ پر ان لفظوں کی اشکال لکھی جاتی ہیں اسی طرح صفحۂ ہوا پر بھی ان کی اشکال
بن جاتی ہیں۔ جس طرح یہ الفاظ ہاتھ کی حرکت سے کاغذ پر ترقیم پاتے ہیں۔ اسی طرح
منہ اور گرہ ہوا میں بھی ان کی اشکال مرتسم ہو جاتی ہیں۔ شاید یہ سوال کیا جائیگا کہ صفحات
کاغذ وغیرہ پر تو اشکالِ الفاظ نظر آتے ہیں مگر ہوا میں نظر نہیں آتی ہیں کس طرح ایسے ارتقام یا
ارتسام کا یقین کیا جائے؟ میں اس بات کا یہ جواب دونگا کہ جو آوازیں گرموفون میں اتاری
یا عکس کی جاتی ہیں وہ انعکاس اور اتارنے سے پہلے بھی موجود تھیں کیونکہ اگر موجود نہ ہوتیں
تو ان کا عکس کیونکر لیا جا سکتا جب منہ سے ایک آواز نکلتی ہے تو تا وقتیکہ وہ گراموفون میں اتر
نہ جائے اُس وقت تک وہ ہوا کی پلیٹوں پر منعکس ہوتی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو اُس کا
عکس کیونکر آ گیا مثلاً ہم نے یہ شعر پڑھا۔

کوئی چارہ تھا نہ مجبوری میں کوشش کے سوا
رہنمائے منزلِ مقصد ضرورت بن گئی

ہر لفظ پڑھنے کے ساتھ ہی منہ سے نکلتا اور الگ ہو جاتا ہے اور ادھر گرموفون میں
عکس بھی اترتا جاتا ہے۔ کوئی عکس اس وقت تک نہیں اتر سکتا جب تک اُس کی شکل اور ہیئت
موجود نہ ہو یہ ظاہر ہے کہ بظاہر الفاظ یا فقراتِ مطلقہ کی کوئی شکل اور کوئی ہیئت مشاہدہ
میں نہیں آتی اور باوجود اس کے گراموفون میں اتری جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ
ہوائی پلیٹوں میں آوازوں کی شکلیں ساتھ کی ساتھ ہی منعکس ہوتی جاتی ہیں اور منہ کے
جوف میں ہی تداخل ہوا کی وجہ سے اشکال بنتی جاتی ہیں:۔

چونکہ تمام قسم کی آوازیں بجائے خود ایک ہوا ہیں اس واسطے ہوائی دور میں
مل کر اشکال اختیار کرنا مشکل نہیں ہے ہر آواز میں فورس اور زور ہوتا ہے اور ادھر

ہوا بھی ایک نور اور ایک فورس رکھتی ہے جب دونوں فورس بالمقابل آتے ہیں تو غالب فورس (جو ہوا کا ہوتا ہے) مغلوب فورس کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے۔ اور اس انجذاب کی وجہ سے ہوا کی سطح پر اُس کا عکس ہو جاتا ہے۔

اگر ہم ہوا کو دیکھ سکتے تو اُن مختلف اشکال اور ہیات کو بھی دیکھ سکتے جو سطح ہوا پر منعکس ہوئی رہتی ہیں چونکہ ہم عکس لینے والی طاقت کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اس واسطے منعکسہ آوازوں یا صور کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔

(تخیل اور آوازیں)

جس قدر آوازیں انسان کے منہ سے نکلتی ہیں یا جس قدر آوازیں دوسرے حیوانات یا اجسام سے سرزد ہوتی ہیں اُن سب کا شروع تخیل سے ہوتا ہے جو اُن اجزا سے بالکل الگ ہے جنھیں آوازوں کا مخرج کہا جاتا ہے۔ تخیل مخرج نہیں ہے۔ لیکن اُس کی وجہ سے ہر آواز ایک یا کوئی نہ کوئی مخرج رکھتی ہے۔ انسانی آوازوں کا مخرج منہ ہے یا کبھی کبھی کوئی دوسرا جزو بدن منہ سے جو آوازیں نکلتی ہیں گو وہ منہ سے نکلتی ہیں لیکن اُن کا اصلی منبع تخیل ہے۔ جب تک مخزن تخیل میں آواز کا خیال پیدا نہ ہو اس وقت تک منہ سے کس طرح کوئی آواز نکل سکتی ہے۔ ہر انسان سوچ سکتا ہے کہ سب سے اوّل اُس کے خزینۂ خیال میں ایک آواز کے نکالنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ

"خدا کارسا نہ ہے یا خدا مسبب الاسباب ہے"

تو منہ سے یہ الفاظ نکلنے سے پہلے خیال میں ان کا توجہ ہوتا ہے۔ خیال اجازت دیتا ہے تو یہ الفاظ منہ سے نکلتے ہیں اگر خیال اجازت نہ دے یا حیطۂ خیال میں ایسے الفاظ نہ آئیں تو منہ سے یا زبان سے کچھ نہیں نکل سکتا۔ منہ ایک مخرج ہے اور زبان ذریعہ اخراج

دو طرح سے ایسا تخیل ہوتا ہے۔

(الف) اندرونی توجّہ سے

(ب) بیرونی توجہ سے

انسان عالم خاموشی میں بہ غور دیکھ سکتا ہے کہ اس کے دل یا دماغ میں کس کس قسم کے خیالات پیہم پیدا ہوتے اور ہجوم پڑتے جاتے ہیں ایک ابھی ختم ہونے نہیں پاتا کہ دوسرے کی نوبت آجاتی ہے کبھی یہ ایک ہی سلسلے کے تابع ہوتے ہیں اور کبھی مختلف سلسلوں سے وابستگی رکھتے ہیں۔ آنکھیں بند کرکے خاموشی سے اس اندرونی توجہ کا تماشا کرو بھانت بھانت کے خیالات متوجہ ہوں گے صرف خیالات ہی نہیں اُن کے ساتھ مختلف قسم کی شکلیں نقوش اور تمثیلات بھی مرتسم ہوتے جاتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ ایسی اشکال نقوش اور تمثیلات کا بہت سا حصہ بیرونی دنیا یا بیرونی اشکال اور مناظر کا عکس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اُن کے پہلو بہ پہلو ایسی شکلیں ایسے نقوش اور ایسے تمثیلات بھی وجود پذیر ہوتے ہیں جن کا اس ظاہری دنیا یا مادی دنیا میں نشان تک نہیں ملتا کسی نظیر اور مزید ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص اپنا تماشا آپ ہی کر سکتا ہے کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ آنکھیں تو بند ہیں اور ایک قسم کی روشنی میں ہم مختلف اشکال۔ نقوش اور تمثیلات دیکھ رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم گویا کھلی آنکھوں سے کوئی منظر یا کوئی چیز دیکھتے ہیں صوفیوں اور بڑے فلاسفروں کی اصطلاح میں یہ ایک اندرونی ضیا کا کام ہے اور جب رفتہ رفتہ ایسی ضیا بڑھتی جاتی ہے تو انسان دور تک بھی دیکھ سکتا ہے۔ اور اُس کی ظاہری بصارت سے اندرونی بصارت زیادہ کام دے جاتی ہے۔ بعض ڈاکٹروں نے خال خال ایسے انسان بھی دیکھے ہیں کہ جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ مشق کے متعلق ساری باتیں ہیں من جد وجد

بیرونی اشکال اور نقوش کے دیکھنے اور آوازوں کے سننے سے بھی خیالات صورت پذیر ہوتے ہیں اور قوت متخیلہ رفتہ رفتہ انھیں وجود میں لاتی جاتی ہے اور جب وہ بطن تخیل سے خارج ہونے ہیں تو دو صورتیں اختیار کرتے ہیں:

(الف) اشارات۔کنایات

(ب) آواز

اشارات کنایات اور آواز میں تخیل ہی نہیں جو ایک حد تک متلفظہ ہو جاتی ہیں گو وہ تلفظ خارج میں سنائی نہیں دیتا لیکن اس کا خاکہ تخیل ہی میں بننا شروع ہو جاتا ہے۔ تخیل اور ذہن میں ایک نسبت ہے۔ ذہن کی مدد سے تخیل اپنے تلفظ پر قادر ہوتا ہے گو کہ ظاہر میں زبان اور منہ سے کوئی تلفظ نہیں ہوتا مگر ذہن میں اس سے ایسی تلفظ سے تلفظہ ہوتا ہے ہر انسان ایسا تلفظ سنتا یا اسکا اپنے ذہن میں احساس کرتا ہے۔

جب بطن تخیل سے آواز بن ہو کر منہ اور زبان کے ذریعے سے خارج ہوتی ہیں تو وہی تلفظ تخیلہ رونما ہوتا ہے اور اسی کے مطابق انسان کے منہ کی شکل اور ہیئت بھی بن جاتی ہے۔ اگر ہم منہ سے الفاظ۔جاو۔آؤ۔کام۔نام۔دام نکالیں گے تو ان کے تلفظ کے مطابق ہمارے منہ کی شکل بھی بن جائے گی۔ اگر ہم احتیاط کے ساتھ تلفظ اور منہ کی شکل کا مقابلہ کریں گے تو ان دونوں میں بہت تھوڑا فرق پایا جائے گا۔ ہر لفظ چند حرکات رکھتا ہے اور منہ ان ہی چند حرکات کے مطابق کھلتا ہے۔ کسی ایسے گویّے کے منہ کی حالت گانے کے وقت غور سے دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ منہ سے نکلنے والے الفاظ کی اشکال کا منہ کی حرکات پر کہاں تک اثر ہوتا ہے اور ان حرکات کا مجموعہ کس قسم کی شکل بناتا اور کیا کچھ ہیئت پیدا کرتا ہے۔ منہ کا کھلنا اور بند ہونا اشکالی الفاظ کی ایک عملی ہیئت ہے۔

فغانِ فانی

کہتا ہی غم یار میں ہوں جانِ تمنّا — دنیا ہی مری عالمِ امکانِ تمنّا

مضمون تو مکتوبِ ازل کا نہیں معلوم — لکھّا ہی مرے خون سی عنوانِ تمنّا

جُز داغ نہیں کوئی چراغِ سرِ تربت — سینہ ہی مرا گورِ غریبانِ تمنّا

نالے ہیں نہ آہیں نہ خلش ہی نہ تپش ہی — باقی نہ رہا کوئی زباندانِ تمنّا

گو چاک ہوا دل مگر ارمان نہ نکلے — بے فائدہ کھولا درِ زندانِ تمنّا

کیا چارہ گر اب بھی تجھے امیدِ شفا ہی — یہہ زخم ہی یہہ دل ہی یہہ پیکانِ تمنّا

کیفیت ناکامیٔ دل کیا کہوں فانی

دل ٹوٹ گیا توڑ کے پیمانِ تمنّا

کلام حسرت موہانی

پیشِ نظر جو وہ قمرِ [illegible]گی نہیں — یہ جوششِ انتظار ہی دیوانگی نہیں

ذوقِ شراب کیوں ہو مجھے چشمِ یار میں — پیمانگی نہیں ہی کہ میخانگی نہیں

محفل میں دل کا حال چھپے کیا کہ شوق کو — اُس نازنیں سے قدرتِ بیگانگی نہیں

غم لائے دہر سے جو بری ہو وہی ہی مرد — حُزن و ہراس شیوۂ مردانگی نہیں

دیکھو کبھی تو آ کے مجھے نیم جاں تمہیں — اتنا بھی کیا سلیقۂ جانانگی نہیں

بڑھ جائیگا غرور کچھ اور اُن کے روبرو — اظہارِ حالِ دل کوئی فرزانگی نہیں

تم سے گدا کو اُس شہِ خوباں کی آرزو

[illegible]

تبصرہ

۱- کہکشاں (از ایڈیٹر)

ولایت میں ناقدین کا طبقہ مصنفین کے طبقے سے بالکل علاحدہ ہے یعنی جو شخص ناقد ہے وہ مصنف نہیں ہوتا اور اس لیے اُسے یہ خوف مطلق نہیں ہوتا کہ زید جس کی کتاب پر آج وہ نہایت سختی سے تنقید کر رہا ہے کل کو اُس ناقد کی تصنیف کے ساتھ وہی سلوک کریگا۔ یہی وجہ ہے کہ "کرٹک" (ناقد) "آتھر" (مصنف) کی تصنیف کے متعلق اپنی صحیح اور آزادانہ رائے دینے میں ذرا نہیں جھجکتا اور مطلق پس و پیش نہیں کرتا۔ لیکن جب ایک مصنف یا مدیر دوسرے مصنف یا مدیر کے نتائج دماغی کا ناقد ہو تو ظاہر ہے کہ شیشے کے مکان میں رہنے والے کلوخ اندازی کی مشق کر کے مسرت باہمدگر سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔

غالباً اس بدعت کے بانی مولوی ظفر علی خاں صاحب تھے کہ انھوں نے دکن ریویو نکال کر اپنے معاصرین سے خواہش کی کہ وہ اُس رسالے پر لمبی چوڑی تنقیدیں لکھیں اور اس کے بدلے میں مولوی صاحب موصوف نے اس زمانے کے قریب قریب ہر رسالے کے متعلق نہایت ناقدانہ نظر ڈالی جس میں کسی کو گرایا کسی کو چڑھایا۔ یہاں تک کہ آخر میں لطیف اور بعض وقت ناخوشگوار نوک جھونک بھی ہوا کرتی تھی۔ میرے خیال میں یہ طریقہ کچھ زیادہ مستحسن نہیں ہے نہ صرف اس وجہ سے کہ ابھی نہ ہماری اتنی نظر ہے کہ نیک نیتی سے اپنے بھائی کی برائی بھلائی جانچ سکیں نہ اتنا ظرف ہے کہ ٹھنڈے دل سے اپنے معائب سن سکیں اور سن کر اصلاح کی طرف متوجہ ہوں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ بہت سے عیوب ہم میں مشترک ہیں اور یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم دوسرے کے انھیں عیوب کو ظاہر کریں جو ہم میں موجود

ہیں !!

ممکن ہے کہ میرا یہ خیال صحیح ہو اور ممکن ہے کہ غلط۔ لیکن یہ تو یقیناً صحیح ہے کہ بزرگوں کو خردوں کے مناقب و مثالب گنانے کا حق حاصل ہے مگر خردوں کو بزرگوں کے عیب و صواب بتانے کا منصب حاصل نہیں۔ "رسالوں" کی فوج میں نقیب کی حیثیت ابھی تک ایک "نوگرفتہ" سے زیادہ نہیں اس لیے میں نے اب تک جرأت نہ کی کہ معزز و محترم معاصرین کے متعلق جو باعتبار تقدم زمانی نقیب کے بزرگ ہیں۔ اپنی ناچیز رائے لکھوں مگر معلوم ہوتا ہے کہ میرے سکوت کے معنی بجائے "حد ادب" کے "قدر ناشناسی" لیے جاتے ہیں لہذا الامر فوق الادب میں اپنی ناچیز رائے پیش کرنے کو حاضر ہوں اور چونکہ برادر عزیز ایڈیٹر صاحب کہکشاں فرماتے ہیں کہ وہ "سچی اور نیک نیتی کے ساتھ لکھی ہوئی تنقید پر بے انتہا شکرگزار ہونگے" لہذا یہ یقین دلانے کے بعد کہ میں جو کچھ لکھوں گا نہایت سچے دل سے اور بہ کمال نیک نیتی لکھونگا ابتدائے سخن کہکشاں ہی سے کرتا ہوں۔ چل رے خامہ بسم اللہ:۔

نام۔ لکھائی چھپائی اور سب سے آخر (لیکن بہ لحاظ اہمیت سب سے اقدم) تنوع مضامین کے اعتبار سے میں کہکشاں کو اردو کے ممتاز رسائل میں سمجھتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ

لاہور میں۔ اچھے کاغذ۔ اچھی لکھائی اچھی چھپائی کا آسانی سے انتظام ہو سکتا ہے۔ جو بعض مقامات پر مشکل ہے۔ لیکن اس آسانی سے کام لینا کام لینے والے کی نفاست پسندی کی دلیل ہے۔ ایڈیٹر صاحب کہکشاں کو رسالے کی ظاہری و باطنی خوبیاں بڑھانے میں یوماً فیوماً کامیابی ہوتی جاتی ہے۔ ہر پرچے میں ہر مذاق اور ہر پسند کے مضامین حسن ترتیب کے ساتھ جمع کیے جاتے ہیں ایڈیٹر صاحب کہکشاں کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ انھیں جناب مولانا سید ممتاز علی صاحب قبلہ جیسے ادیب باپ اور قابل مضمون نگار اور منتظم سرپرست ملے ہیں

میں نے اُن مضامین ہی سے اکتساب فیض نہیں کیا ہی جو مولانا موصوف نے "تہذیب" یا "کہکشاں" کے لیے لکھے ہیں بلکہ اُن مضامین سے بھی بہرہ اندوز ہوا ہوں جو انھوں نے گورنمنٹ پنجاب کی مترجمی کے زمانے میں تحریر فرمائے تھے۔ مولانا کے مضامین کی تعریف کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہی کیونکہ دنیائے ادب واقف ہی کہ مولانا نے اپنے مضامین کی داد سرسید علیہ الرحمۃ تک سے لی ہی۔ مولانا سلیس جملوں، سادہ لفظوں اور عام فہم ترکیبوں سے کام لیکر جیسے ادق اور عالمانہ مضامین ادا کر جاتے ہیں۔ تام التجاب سے صہبہ خمیازہ تلش انگیز غبار جلوہ گر بیا۔ امیال وخواطف لکھ لکھ کر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ ہم نوجوانوں کو چاہیے کہ ہما بوڑھے انشا پرداز کی سادہ نگاری سے سبق لیں۔ انتخاب طبعی (اپریل) "اصل انواع" (مئی)، "ارتقا" (جون) ایسے مضامین ہیں جو یورپ کے بہتر سے بہتر علمی رسالوں کے لیے باعث امتیاز ہو سکتے ہیں۔

جناب "پطرس" کا "قدیم یونانی حکما اور ان کے خیالات" نہایت ہی اچھا سلسلہ ہی جو ہر مہینے جاری رہنا چاہیے۔ کہکشاں کے ذریعہ سے اگر اردو میں اس قسم کے مضامین آ جائیں تو یہ اس کی بہترین خدمت سمجھی جائے گی۔ یہی رائے پروفیسر مراد صاحب کے "مبادی علم مقناطیس (مارچ)" کے متعلق ہی۔ مولانا طباطبائی کے مضامین تعریف سے مستغنی ہیں۔ جناب قمر نے مرزا بیدل کے متعلق جو سلسلہ چھیڑا ہی بہتر ہو کہ وہ نہ صرف انتہا تک پہنچایا جائے بلکہ ہندوستان کے ممتاز شعرا فارسی گو خصوصاً حضرت غالب کے متعلق بھی ایسا ہی سلسلہ جاری کر دیا جائے۔ ہندوستان میں فارسی دانی کا مذاق مردہ ہوا جاتا ہی۔ لیکن اگر ارباب صحائف پوری کوشش کریں تو اس مذاق کا احیا ناممکن نہیں ہی۔ جناب "ادب آموز" کا گلدہ پر ریویو (مئی) جناب محمد ناظم صاحب کا کیوپڈ اور سائکی پر

ریویو (اپریل، اور ایڈیٹر کی انجمن (جون) جناب اکبر شاہ خاں صاحب کا "اسلام ہندوستان میں" (مئی) بہت اچھے مضامین ہیں۔ اسی طرح ایڈیٹر صاحب کا "جوف الارض" (اپریل) ۔ "شبنم کی سرگزشت" (مئی) اور "توہی" (جون) قابل دید مضامین ہیں۔ جناب نیاز فتحپوری کا "اساطیر الاولین" (فروری و مارچ) بھی اچھا ہے۔ قصص میں جناب گمنام کا "علاج بے دوا" (جون) اور "گنگا" (اپریل) منشی پریم چند صاحب کا "بینک کا دیوالہ" (فروری و مارچ) اور "سوتیلی ماں" (جون) پر لطف اور نتیجہ خیز ہیں۔ بنگالی فلاسفر کا "اردو کے نقاد" (جون) اور جناب گمنام کے "خواب پریشاں" (فروری) اور "سدا بہار تا پو کا ہندی" (مئی) معمولی ہیں۔ مسٹر جان بل کا "حاجبیعت" کہکشاں کے افق پرستارہ تفنن کی طرح چمک رہا ہے اور اپنی مثال اپنے آپ ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے اس مضمون کے متعلق فرمایا ہے کہ "گاسے یہاں کے الفاظ تو کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اگر وہ اصلی نام سے بزم کہکشاں میں آئیں تو رسالے کی عزت ہوگی" مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ مضمون میں جوش کا وفور "تلاطم محض" جان بل کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو جناب شیخ عصا محض قلمبردار رہ جائیں!!۔

اپریل نمبر میں جناب تاج کا ایک مختصر سا تخیل "اک کچی" کے نام سے صفحہ ۴۴ کے آخر میں چھپا ہے۔ میں عرض نہیں کرسکتا کہ ان ساڑھے چھ سطروں کو پڑھ کر قلب کی کیا کیفیت ہوئی۔ حضرت بلھے شاہ صاحب کی "کافیاں" اکثر سنی ہیں۔ اُن کی ایک "کافی" "کرکتن وچ دھیان کڑی" ابھی تک لطف دیتی ہے۔ اگر ناظرین کہکشاں میں سے چند حضرات بھی اس "کچی" اور اس کی "صدف اندوزی" کو سمجھے اور اس نتیجے پر پہنچے ہوں کہ حضرت تاج کی ساحل پر سیپیاں (حطام دنیوی) جمع کرنے والی کچی (روح) کو سیپیاں چھوڑ کر گھر (عالم آخرت) جانا ہوگا یا بالفاظ حضرت بلھے شاہ صاحب چرخہ کاتنے والی لڑکی کو کاتا ہوا سوت

(اعمالِ حسنہ ہے) کر سسرال (عالمِ آخرت) جانا ہوگا تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ساحل پر سیپیاں جمع کرنے کو محض طفلانہ فعل سمجھنگے، اور اُن کی نجات کے لیے یہ کافی ہوگا۔

میں صاف کیوں نہ کہوں میرا شمار بہ عنایتِ الٰہی زمرۂ شعرا میں نہیں ہے لہذا حصۂ نظم کے متعلق میں کوئی رائے نہیں دے سکتا ہاں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کہکشاں میں فارسی کی جو دو تین غزلیں شائع ہوئی ہیں یہ اگر نہ ہوتیں تو بہتر تھا۔ مجھے تو ایسی قند پارسی سے ہندی گڑ ہی اچھا معلوم ہوتا ہے!!

نام کی رعایت سے کہکشاں میں اگر "بزمِ انجم" قائم ہوئی تو غنیمت تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ نہیں سارا نظامِ شمسی جلوہ آرا ہوا چاہتا ہے جس کی ابتدا بالفعل "چاند" سے ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کہکشاں کے افق پر بھی چاند کا نکلنا ہر مہینے ایسا ہی یقینی ہے جیسا آسمان کے اُفق پر۔

ملاحظہ ہو:-

اپنے چاند سے .... جنوری صفحہ ۳۲

اپنے یتیم سے (یتیم سے مراد چاند ہے) فروری صفحہ ۲۰

چندا ماموں .... فروری صفحہ ۳۹

خدا سے (چاند کا تذکرہ موجود ہے) .. مارچ صفحہ ۳۲

قمر سے .... اپریل صفحہ ۳۵

چاند اور بچہ .... جون صفحہ ۳۰

ماہ مئی میں اگر بدر کامل (مستقل مضمون) نظر نہیں آتا تو ہلال (چاند کا تذکرہ) کئی جگہ نظر آتا ہے۔ مجھے چاند کی بہتات نے اس قدر بیزار کر دیا ہے کہ جی چاہتا ہے دعا کروں کہ الٰہی ملکِ کہکشاں میں ہمیشہ اٹھائیسویں تاریخ ہی رہے۔ چاند کے تذکرے میں اس

میں آفتاب پرست گروہ کی طرح ایک ماہتاب پرست گروہ بھی پیدا ہوگیا ہے!!

جنوری کے رسالے میں جناب "یلدرم" کا ایک مضمون "جہاں پھول کھلتے ہیں" کے عنوان سے چھپا ہے۔ ستمبر ۱۹۰۸ء میں جسے آج ٹھیک چودہ برس ہوگئے ایک مضمون "علیگڈھ منتھلی" کے صفحہ ۳۴۳ سے شروع ہوکر ۳۴۹ پر ختم ہوتا ہے۔ اس مضمون کا بھی عنوان یہی ہے اور خاتمہ مضمون پر بھی "یلدرم" ہی لکھا ہے۔ اگرچہ مقابلہ کرنے سے معلوم ہوا کہ کہکشاں والے مضمون اور منتھلی والے مضمون میں لفظ تو بڑی بات ہے ایک حرف کا بھی فرق نہیں۔ مگر اس میں اور اس میں کوئی نہ کوئی فرق ہوگا ضرور جسے میں نہیں سمجھ سکتا۔ ورنہ یلدرم صاحب کاہے کو چھپواتے اور تاج صاحب کیوں چھاپتے!!

جناب "ادب آموز" کا مضمون۔ کیفی صاحب کی ایک نظم "جنوری نمبر" میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے جناب کیفی دہلوی نے مولانا طباطبائی کی نظم پر اعتراض کیے تھے۔ یہ مضمون غالباً ان اعتراضات کی سزادہی کے لیے لکھا گیا ہے۔ مجھے نہ کیفی صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل ہے نہ ادب آموز صاحب کی بارگاہ میں رسائی۔ مگر انصاف کا خون ہوگا اگر میں یہ عرض نہ کروں کہ بعض اعتراض محض باد ہوا ہیں "ناگہ" پر اعتراض کیا گیا ہے۔ میں جیسا عرض کرچکا ہوں۔ شاعر نہیں مگر شاید فارسی اردو کے سب شعرا ہر زمانے میں۔ نظم میں "ناگاہ" کو "ناگہ" بہ تخفیف الف لکھتے آئے ہیں اور اب بھی لکھتے ہیں۔ نظم تو نظم کہکشاں کے اسی نمبر میں صفحہ ۳۳ کی چھٹی سطر میں "اے میرے مہ نیم ماہ" چمک رہا ہے۔ کیفی صاحب کی نظم کے عنوان "طلوع سحر" پر اعتراض کیا گیا ہے کہ ترکیب غلط ہے اور وجہ یہ پیش کی گئی ہے کہ عربی فارسی اور اردو میں "طلوع" محض "آفتاب" ہی کے لیے آتا ہے۔ جناب "ادب آموز" مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ عرض کروں کہ عربی فارسی اور اردو میں "طلوع" محض آفتاب

ہی کے لیے نہیں بلکہ سحر صبح آگ۔ نشہ سب کے لیے آتا ہے یہ ایک مختصر سی فہرست ہے جو ادنیٰ توجہ بڑھائی جا سکتی ہے۔ عربی میں سب سے زیادہ زبردست سند قرآن کریم کی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

عربی:۔ فجر کے لیے: سلام ہی حتیٰ مطلع الفجر

آگ کے لیے:۔ نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ

فارسی:۔ کیف نشے کے لیے: کہ غمزہ چین جبیں دو ناں کند للّٰو۔ تر آب را دہد روشنی بشبتر علا (اثر)

اردو:۔ صبح کے لیے:۔ طلوع صبح نشر جاک ہو میرے گریباں کا (ناسخ)

روشنی کے لیے:۔ طلوع روشنی جیسے نشاں ہوش کی آمد کا (شہیدی)

جناب راشد الخیری صاحب آسمانِ ادب کے آفتاب ہیں۔ انھوں نے دنیائے صحافت میں اس درجہ شہرت حاصل کر لی ہے کہ خاکسار ایڈیٹر کی کسی تعریف و توصیف سے محتاج نہیں ہیں۔ ہندوستان کا تقریباً ہر ماہواری رسالہ اُن کے خرمن فیض کا خوشہ چیں اور اُن کے مصلیٰ ادب کا جرعہ کش ہے۔ تاہم سوء ادب نہ ہوگا اگر میں یہ عرض کروں کہ کہکشاں میں جناب موصوف کے نتائج طبع دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ جنوری نمبر میں اُن کا جو مضمون "بزم آخر" کے نام سے چھپا ہے اس کے بعض فقروں میں مجھے اپنی کم علمی کی وجہ سے الجھن ہوئی۔ ممکن ہے کہکشاں اور نقیب کے ناظرین مجھ سے زیادہ سمجھ سکیں۔

"ساجد کے پڑوس میں ایک تھانے دار رہتے تھے خود تو اپنی ذات سے اتنے بُرے نہ تھے مگر بیوی آسیہ ظالمونی کی ستزوج اور سفاکوں کی سردار تھی...... بن ماں باپ کی ایک پھرتی پھراتی بچی چھوٹی سی آگئی تھی۔ سوسن اُس کا نام تھا"

آسیہ کے مظالم اور سوسن کی مظلومی کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سوسن

> ۔۔۔ بیوی تو نے ہزار دفعہ مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ جیل خانے میں سڑا سڑا کر مار ڈالوں گی۔ گئی تو چھپوں گی کہاں۔ جہاں جاؤں گی پکڑی آؤں گی۔ قید اس مصیبت سے بھی سخت ہوگی یہ خیال کر کے دی سے۔ یا خدا کے خوف سے ہرگز نہیں صرف اس واسطے کہ بدگمانی کا کانٹا کسی طرح نکل جائے آہستہ سے اس کا نکاح مسجد کے ملا سے کردیا (ص ۴۲)

سیاقِ عبارت یہہ کہتا ہی کہ مصنف سوسن کی حالت بیان کر رہا ہی کہ وہ ڈرتی تھی کہ بیوی ہزار دفعہ جیل خانے میں سڑا کر رنے کی دھمکی دے چکی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر نکل گئی تو کہاں چھپونگی۔ جہاں جاؤں گی پکڑی آونگی اور جیل میں ڈالدی جاؤں گی اور وہ مصیبت موجودہ ملازمت کی مصیبت سے زیادہ سخت ہوگی۔ یہاں تک ٹھیک ہے مگر "یہ خیال کر" کیا بلا ہی؟ آیا بیوی نے یہ خیال کر کے اس کا نکاح کردیا یا یہ خیال کر کے اُس نے خود نکاح کر لیا۔ اگر اول الذکر صحیح ہی تو بیوی کا خیال ظاہر نہیں کیا گیا بلکہ سوسن کا خیال ظاہر کیا گیا تھا اگر آخر الذکر صحیح ہی تو سیاقِ عبارت سے معلوم ہوتا ہی کہ سوسن نے خود نکاح نہیں کیا بلکہ بیوی نے کردیا۔ "آہستہ" کا لفظ بھی اپنی جگہ چسپاں ہم معلوم نہیں ہوتا کہ "چپ چپاتے" یا "جلدی سے" کی جگہ استعمال ہوا ہی۔ یا بیوی نے خود نکاح آہستہ آہستہ پڑھا دیا!

"منہ خانۂ خدا ہی اور قبلہ کی طرف ہمارا منہ" (ص ۴۳ کالم ۲ سطر ۲)

"ملا کا خیال مساوات تلقینِ اسلام ضرور تھی" (ص ۴۳ کالم ۲ سطر ۱۰)

میرے خیال میں فرطِ انہماک اور کثرتِ مشاغل جناب راشد کو اتنی مہلت نہیں دیتے کہ مضمون پر نظر ثانی فرمائیں ورنہ "چپکے پڑ گئے" کی جگہہ "چھکے چھوٹ گئے" (ص ۴۲ کالم ۲ سطر ۲) "سوسن" کی جگہہ "گلشن" (ص ۴۲ کالم ۱ سطر ۱) اور "پھلروا سالال"

کی جگہ "پھڑوا سے لال" (ص ۲۴ کالم ۱ سطر ۲۲) لکھ جاتے "پھڑو سالا"۔ ماں کا پکھا کلیجہ
کا ٹکڑا۔ آنکھوں کی ٹھنڈک دو جیا عورت۔ پورے دن۔ باپ کا کلیجہ۔ یہ الفاظ نور راشد
صاحب کے اس مضمون کے عناصر ترکیبی ہیں مگر تعجب ہو کہ دہلی کا اردو نگار رضائے وحدہ لاشریک
کی عظمت و جبروت کا اظہار "توحید کے گیت" (ص ۲۴ کالم ۱ سطر ۱۷) گا کر ہی کر سکا!!

دوسرا مضمون فروری میں "اعانت مقصودہ" کی سرخی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی
بعض باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں مثلاً

بکنا "رکلکانا" صفحہ ۲۴ کالم ۱ سطر ۲۲

زبانیں بلک رہی ہیں صفحہ ۲۴ کالم ۲ سطر ۱

دانت ہونٹوں میں بیٹھ گیا صفحہ ۲۴ کالم ۲ سطر ۱۰

نفس قصے کے متعلق یہ گزارش ہے کہ آج کل جبکہ ہر قصہ نویس اور فسانہ نگار یہی کوشش
کرتا ہے کہ جو کچھ وہ لکھے وہ روزمرہ پیش آنے والے واقعات کا سچا اور صحیح اور "نقل مطابق اصل"
بیان ہو قصے کے "کیرکٹروں" کی تصویر ہو بہو (لائف لائک) ہو۔ مگر مصور غم جناب راشد الخیری
روش بینہ بات کی شوخ رنگی دکھانے کے لیے تصویر کھینچتے ہیں۔ وہ جو کچھ تحریر فرماتے ہیں ہمیشہ
ضرورت سے زیادہ اور اصلیت سے بڑھ کر ہوتا ہے جس سے طبیعت کو استکراہ و انقباض سا
ہوتا ہے۔ اگر ظلم کا پہلو دکھانا ہو تو حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں اور اگر مظلومیت کا رخ دکھانا ہو تو
حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ مضامین میں تناسب (PROPORTION.) مفقود ہوتا
ہے۔ گیارہ برس کا غیر تربیت یافتہ بچہ جو آٹھ نو برس کی عمر میں یتیم ہو گیا۔ اپنے واقعات
زندگی جن فصیح و بلیغ چچے تلے جملوں اور سانچے میں ڈھلے فقروں میں بیان کر رہا ہے۔ اپنے
مصائب کی تصویر جس شوخ رنگ میں کھینچ رہا ہے۔ نکاح ثانی کے محاسن و معائب کی تشریح اور

نانکھو الالیاہی" کی تعبیر جس روشن دماغی اور آزاد خیالی سے کر رہا ہو وہ میرے خیال میں یا تو اس تیمی کی بھولی بھالی زبان کا حصہ ہو یا مصور غم کے پختہ کار قلم کا۔ جی چاہتا تھا کہ مصور غم کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تصویر کا خاکہ پیش کروں یعنی اس چھوٹے بچے کی عالمانہ تقریر کے کچھ فقرے نقل کروں مگر تبصرے کی محدود گنجائش اجازت نہیں دیتی۔

جنوری نمبر میں صبح امید کی تنقید کرتے ہوئے ایک مضمون کے متعلق ایڈیٹر صاحب کہکشاں نے فرمایا ہے "اکثر فقروں میں صاف انگریزی طرز بیان کی جھلک نظر آتی ہے گویا یہ ثابت کر دیا گیا ہو کہ اردو میں ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کی قدرت نہیں ہے" مگر تعجب ہو کہ اسی نمبر میں جناب سید احمد صاحب بانی جالسی کا مضمون "انکشافات محبت" اسی صنعت سے مرصع ہے۔ اس مضمون میں انگریزی قواعد نے اردو صرف و نحو کو ہر ہر قدم پر شکست دی ہے اور انگریزی خوانوں کو لطف آتا ہے کہ وہ (بخلاف قول حاجی بغلول) انگریزی کو اردو میں پڑھ رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

۱- ایک صبح

۲- "اچھا میں جاؤں گا" انھوں نے کہا۔"

۳- "ان خیالات پر۔ میں۔ ان کی بات سننے والی ایک سادہ دل لڑکی۔ ہنسنے لگی اور خوب ہنسی۔"

۴- "ہنسو نہیں۔ کہیں تمہارے نازک دل کو اس ہنسی کا خمیازہ نہ اٹھانا پڑے۔ میں ڈرتا ہوں"

۵- "مگر تقاضہ رہتا ہو اس کا بھی یہی کہ رہوں میں اسی عبادت میں مصروف۔"

۶- "ابھی دس گھنٹے پڑے ہیں جن کے بسر کرلے جانے پر منحصر ہو اُن کی دید"

اس کے علاوہ دوسرے مضامین میں فقرات ذیل ملاحظہ ہوں:۔

جنوری صفحہ ۳۲:۔ ۱۔تبسم تمہارے ہونٹوں پہ کھیل جاتا تھا۔

۲۔ میرے کئی رات دن اس کو بکنے والے سے زخمی ہوئے۔

۳۔ ایک بیت تمہارے دریچے کی نب بلند آیا

مارچ صفحہ ۳۰ ۴۔ ننگنیاں کھلتی تھرتی ہیں۔

۵۔ " اسے انکار عشق "

۶۔ مقصد کی ندی ہیں فصاں ہوتی ہے۔

۷۔ ننھے ننھے اچھوتے خیالات

۸۔ ننھی ننھی بوندیں۔

۹۔ ننھا سا تلاطم۔

۱۰۔ ننھے ننھے آنسوؤں سے

صفحہ ۳۳۔ ۱۱۔ "کامل کامیابی ہوئی آپ کو مصور کی طرف خطاب کرکے اس حالت کے دکھانے ہیں کہ تلوے کے ملے جا نے سے ....

صفحہ ۳۷ ۱۲۔ یہ ہے وہ جذبہ عالی جس کا جولانگاہ رہتا ہے ایک صناع کا دل اور یہ ہے وہ راز فطرت جس کا خزینہ ہوتا ہے اہل کمال کا دماغ۔

جون صفحہ ۳۳ ۱۳۔ سایہ دھوپ کی شدت پر مسکرا رہا تھا۔

۱۴۔ اور کوئی کوئی تارا ہنستا ہوا ان لہروں پر جھولا جھول رہا تھا۔

فروری کے کہکشاں میں نقاد پر تنقید کرتے ہوئے ایڈیٹر صاحب نے لکھا ہے "فلسفۂ ازدواج خاصہ مضمون ہے لیکن جہاں بے ضرورت الفاظی اس میں کی گئی ہے اس کے ہم قطعاً خلاف ہیں

مضامین میں بعض غیر مانوس ترکیبیں درج کی گئی ہیں مثلاً وہ بذ اینِ جاذب - واعیات مسرت - نشاطِ تزویج - دقیقہائے رعشہ نگاہی پرمست خرام الاتشام وغیرہ" مگر لطف یہ ہے کہ اس پرچہ میں صفحہ ۲۰ پر "اعیات" کا لفظ جھانک رہا ہے - بے ضرورت لفاظی غیر مانوس ترکیبوں کی نمایش جناب نیاز فتحپوری کے کلام بلاغت التزام میں خصوصاً اور دوسرے مضمون نگاروں کے مضامین میں عموماً پائی جاتی ہیں - کاش کہ موجودہ زمانے کے مضمون نگاروں کا واجب الاحترام گروہ سادہ نگاری میں سرسید علیہ الرحمتہ - مولانا شبلی مرحوم مولانا حالی مرحوم - پروفیسر آزاد مرحوم - مولانا سید ممتاز علی صاحب مدظلہ - مولانا ... مدظلہ کی تقلید کرے - کہکشاں کے صفحات سے اس قسم کے طرزِ ادا کا مختصر نمونہ پیش کرتا ہوں -

جنوری صفحہ ۳ سحر انگیز بیخودی فروری صفحہ ۲۹ - ایک روح ہو کر میرے دل کے اندر سمائی جارہی ہے -

۱۶ سکون فریب آواز ۳۰ لبریز جمال نقاب

اسرار انگیز خفیف روانی مارچ صفحہ ۲۳ التجائے مبہم

۲۳ غبار جلوہ گریز پا ۴۱ خمیازۂ نمائش انگیز

۳۶ بہار و خزاں دل کا کارفرما اپریل ۳۴ تیرا دل خود ایک گریۂ مضطرب

۳۶ دورِ عروج و زوالِ دل جون ۳۷ موت کی شیریں سنسنی

فروری صفحہ ۱۰ امیال و عواطف جون ۳۲ ایک بندکا لر کا کوٹ پہنے تھے جس کے اخلاق و عادات کو دھوبی کے بیجا لاڈ پیار نے مسخ کر دیا تھا -

---

تاج صاحب کا "محبت کی فتح" والا مضمون اچھا ہوتا اگر اس میں پارسی عورتوں کی خصوصیات کا اہتمام رکھا جاتا باوجودیکہ میں بمبئی میں بہت زیادہ رہا ہوں اور پارسی خاندانوں

ہیں میری آمد و رفت رہی ہو مگر میں نے کبھی نہیں سُنا کہ "عشرت" کسی پارسی لڑکی کا نام ہو۔ پارسی لڑکیوں کے نام کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں: شیریں بانو۔ جرباؤ اور تہمینہ وغیرہ۔

پارسی لڑکیاں بچپن میں زری کی گول ٹوپیاں اوڑھتی ہیں اور اس وقت تک بال کُھلے رہتے ہیں۔ مگر جس وقت سے ساری کا آنچل سر پر ڈالنا شروع کرتی ہیں اُس وقت سے بالوں پر ایک رومال باندھتی ہیں۔ سر پر رومال باندھنے کا دستور ہے۔ ایران، عرب و شام میں اب تک ہے۔ ایسی حالت میں یہ فقرہ "اس کی سبز ساری کا آنچل سر پر سے سرک گیا تھا اور اس کے بال ہوا میں نہایت آزادی سے کھیل رہے تھے۔" مضمون نگار کی ناواقفیت پر دال ہو۔ اکثر مضمون نگار انگریزی کے چھوٹے چھوٹے قصوں کو اردو کے قالب میں ڈھالتے ہیں مگر یہ دیکھکر کہ انگریزی عورتوں کا طرز ماند و بود ہندو اور مسلمان عورتوں کے طرز معاشرت پر منطبق نہیں ہوتا وہ اپنے قصے کو پارسی سوسائٹی میں لے جاتے ہیں۔ میری رائے میں اس میں کوئی عیب نہیں ہو بشرطیکہ اُس سوسائٹی کے اطوار و آداب سے واقف ہوکر ایسا کریں۔

آخر میں اُن لفظوں اور فقروں کی مختصر فہرست پیش کرتا ہوں جو میرے خیال میں غلط ہیں۔ جی چاہتا ہو کہ مضمون نگار صاحبان کی طرف سے میں خود یہ عذر پیش کرکے غلطی کو اکثر کاتب کے سر تھوپوں " دریں مضمون کاتب را زیادہ از مصنف دخل است "۔

جنوری: صفحہ ۲۶ آخری سطر قوس و قزح
جنوری: صفحہ ۲۹ پہلا کالم ۱۲ سطر خوفزدہ ہرن کی طرح دوڑتا ہوا اُٹھا۔
۳۵ پہلا کالم تیسری سطر سانحہ
۲۷ پہلا کالم سطر ۲۴ سرخ گلابی رنگ
۳۵ کالم ۲ سطر ۲۴ آنکھوں میں

نقشہ اُترتا جاتا ہی	اپریل: صفحہ ۳۵ کالم ۲ سطر ۸ تو اپنے برقِ
فروری: صفحہ ۳۴ کالم ۲ سطر ۱۶ اُڑتی ہوئی نگاہ	صبیح پہرے سے چادر
۳۵ کالم ۲ سطر ۷ کفو لیتوں	اُٹھاتا ہی۔
مارچ: صفحہ ۲۴ کالم ۱ سطر ۵ وعدہ کیا۔	اپریل آخر صفحہ ۱۵۔ چیل نوحہ روز روشن
۲۵ کالم ۱ سطر ۱۵ فلسفہ مایوس	پتہ چلا رہی تھی۔

لیکن اگر آخر الذکر فقرہ صحیح ہو تو آیندہ سے۔ گھوڑا نعرۂ فتح ہنہنا رہا ہی۔ گدھا اپنی شکست رینک رہا ہی اور کتا آقا کا خیر مقدم بھونک رہا ہی۔ یہ سب صحیح ہوں گے!!

میں نے کہکشاں کے تعلق جو کچھ عرض کیا۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ محض بہ نیک نیتی اور بر بنائے محبت تھا ورنہ جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہکشاں اپنے حسنِ طباعت، خوبیِ ترتیب اور انتخاب مضامین کے اعتبار سے نہایت اونچے درجے کے پرچوں میں ہی اور اس قابل ہی کہ ارباب ذوقِ سلیم اس سے حظِ وافر حاصل کریں۔ حجم ۴۸ صفحے تقطیع ۲۲×۲۹ قیمت سالانہ چار روپیے۔ ایڈیٹر سید امتیاز علی صاحب تاج فرزند مولانا سید ممتاز علی صاحب۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر کہکشاں لاہور

خورشید محشر:۔

حال میں لکھنؤ سے مرزا کاظم حسین صاحب محشر کا دیوان غزلیات شائع ہوا ہی۔ اردو اخبار بیں حضرات غالباً مرزا صاحب سے ناواقف نہوں گے اس لیے زیادہ تعارف کی ضرورت نہیں آپ شاعری کے صحیح مفہوم اور مذاقِ سلیم کے اصلی معنوں سے بہرہ اندوز ہیں۔ صفائی بیان اور جدت بندش آپ کی شاعری کے امتیازات خصوصی ہیں۔ بعض بعض مقامات پر مرزا صاحب

موصوف نے غالب کا تتبع بھی کیا ہے۔ مگر ہر حالت میں صفائی زبان کا لحاظ رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مثلاً عاشقی ہو کر جوارِ حسن تک پہنچا — ہیں تیرا نام لے لیکر دیارِ حسن تک پہنچا
حقیقت مختصر یہ ہے کلیم اللہ کے عشق کی — دیارِ افسانہ کا حدِ وفا حسن تک پہنچا

مختصر روداد اتنی ہے حیاتِ عشق کی — کھیل قسمت کا جوانی میں بگڑ کر رہ گیا

چھیڑ نے حسن و عشق کی دل کو عجب مزا دیا — ہم سے آئے ہنسا دیا، اس نے ہمیں رلا دیا
حسن کے رمزِ باطنی کس میں ہے دم کہ پوچھ لے — شعلۂ برقِ ناز نے طور کو کیوں جلا دیا

دید کے قابل ہے اس کا رنگِ رخ — وقتِ غم جو آہ بھر کر رہ گیا

ملول ہوتا تھا فرقت میں جو تیرا نام آتا تھا — نہ ہنسنا کام آتا تھا نہ رونا کام آتا تھا

نہ ہوا دردِ عشق کا غم وہ بھی بحدِ تکمیل — ورنہ ممکن نہیں سو ٹکڑے جگر ہو جانا
منزلِ عشق میں اللہ رے ضعف اے حشر — بیٹھنا تھک کے جہاں پر وہیں گھر ہو جانا

نظر پھسلی یہ ہے اور جذبۂ دل کام میں اپنے — کدھر جائے کماں سے چھٹ کے تیرا تیر دیکھینگے

شبستانِ عدم کے سونے والو سن لو تم اٹھ کر — قیامت مختصر تمہید ہے میرے فسانے کی

خوشگوار تقریب

ہمارے عزیز دوست سید ابن علی صاحب خلف قبلہ میر محفوظ علی صاحب جن کا ایک مضمون سرگذشت گل طبع ہو چکا ہے کی تقریب کتخدائی کے موقع پر بہت سی نظمیں پڑھی گئیں۔ خاکسار ایڈیٹر خود شریک جلسہ تھا۔ جناب قاضی غلام امیر صاحب کا سہرا جو اپنے طرز کا ایک ہی اور انوکھا ہی نہیں خوب ہے۔ حضرات ناظرین کی دلچسپی کے لیے پیش کیا جاتا ہے اور نہایت خلوص سے قبلہ میر محفوظ علی صاحب کو اس تقریب سعید کی مبارکباد دیجاتی ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

ہے یہ محفوظ کا ارشاد کہ سہرا لکھیے
یہ بھی فرماتے ہیں لکھیے بھی تو اچھا لکھیے

تنگ و تاریک ہے سہرے کی زمین پامال
تھا پس و پیش کہ لکھیے بھی تو پھر کیا لکھیے

غالب کا بھی یہی فتویٰ ہے کہ لکھنا ہے ضرور
سب سے اچھا نہ سہی سب سے نرالا لکھیے

حسن کا جب یہ محافظ ہے تو پھر سہرے کو
قد آدم گہر و لعل کا پردا لکھیے

راحت جان پدر ہے رخ نوشاہ اگر
باپ کے زخم جگر کا اسے پھاہا لکھیے

کوئی تعریف ہے سہرے کی کہ گلدستہ ہے
اک مہکتا ہوا گلزار کا تختہ لکھیے

لوگ سہرے کو اگر کہتے ہیں دام دلکش
لعل و گوہر کو پھر اس دام کا دانہ لکھیے

چشم نوشاہ فسوں ساز ہے تو سہرے کو
دل کی تسخیر کا چلتا ہوا لٹکا لکھیے

ہر لڑی موج ہے ہر پھول ہے ہمرنگ حباب
اس کو بہتا ہوا اک حسن کا دریا لکھیے

آنکھ میں کہتے ہیں بن جاتے ہیں موتی سرمہ
سہرے کو کحل بصر موتیوں والا لکھیے

یہ بزرگوں کی دعاؤں سے پھلا پھولا ہے
اس کو باغیچۂ شاداب تمنا لکھیے

رخ انور کا مصاحب ہے تو زلفوں کا رفیق
اس کے اس اوج مراتب کا قصیدہ لکھیے

مورد فضل ربِ داور ابن علی سہرے کو
سایۂ رحمت اللہ تعالیٰ لکھیے

حسن کو دیکھ کے سہرے کے یہ سب کہتے ہیں
کچھ نہ لکھیے اسے اک شاہد رعنا لکھیے

جان عم جان پدر ابن علی کا سہرہ
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا لکھیے

گلکدہ

از
(حضرت دامن بدایونی)

سنہ ۱۳۰۰ء سے اس وقت تک اردو زبان نے جو ترقیاں کی ہیں وہ کسی آنکھوں والے سے پوشیدہ نہیں ہے یا جانا ہی کہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ سے شروع ہو کر میر محمد تقی کے زمانے میں زبان حد تکمیل کو پہنچ گئی میرے خیال میں اور ہر اس شخص کے نزدیک جو لٹریچر سے کچھ بھی دلچسپی رکھتا ہو آئے دن کی تبدیلیاں اور اختلافات کی ترمیم و تنسیخ سے اردو کسی وقت میں بھی مکمل نہیں ہو سکتی تاہم شاعروں اور انشا پردازوں نے جان توڑ کر جو کوششیں کیں وہ حامیان لٹریچر کے فخر و مباہات کے لئے کچھ کم نہیں میر کی دردانگیزی سودا کی بلند پروازی آتش کی خوش بیانی۔ غالب کی فلسفہ دانی اور نکتہ آفرینی ایسی لازوال اور لافانی چیزیں ہیں جن سے نگارخانہ اردو خالی نہیں ہو سکتا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیے ایک دو نہیں سیکڑوں نام ایسے دکھائی دیں گے جنھوں نے "مسئلہ تو بڑی چیز ہے" ایک ایک لفظ کی تحلیل و تحقیق میں اپنی عمریں صرف کر دیں مگر پھر بھی یہ "ساجھے کی ہنڈیا" پکتی نہیں دکھائی دیتی خدا بھلا کرے اس "غلط العام صحیح" "کالب سڑک" اور فوق البھڑک وغیرہ کے ناقابل برداشت بوجھ سے اردو کو سنبھلنے تک نہیں دیتا۔ حالانکہ ہر زمانے میں نئے نئے ادب نے شاعر اور مصلح پیدا کیے مگر اس معاملے میں وہی لکیر کے فقیر۔

اردو شاعری کے سب سے بڑے مرکز دہلی اور لکھنؤ مانے جاتے ہیں۔ جہاں ان دونوں مقامات پر اردو نے نشو و نما پائی اور نمایاں ترقی کی وہاں آئے دن کے جھگڑوں سے اختلاف بھی اس حد تک پہنچ گیا جس کی اثر انگیزی سے سیکڑوں دواوین ہزاروں رسالے۔ لاکھوں گلدستے بھرے پڑے ہیں دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں جو بین فرق ہے وہ جذبات نگاری اور تصنع سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ تذکیر و تانیث کے مسئلے کو چھوڑ کر دہلی میں روانی و سلاست اور لکھنؤ میں صنائع بدائع اور لفظی رعایتوں کی بھرمار

کہی جاتی ہو مگر حال ہی میں مسور جذبات مرزا محمد ہادی صاحب عزیز کا دیوان غزلیات "گلکدہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہو جس میں اُن اعتراضات پارینہ کا خوب سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر انسداد کیا گیا ہے اور شاعری کے اصلی مفہوم کو ثابت کر دکھایا ہو۔ شعر کا اصلی منشا یہی ہو کہ کہنے والے کی کیفیت سننے والے کے دل پر بھی طاری ہو جائے۔ اسی وجہ سے شاعری۔ موسیقی۔ صنعتگری اور مصوری کو Sister Arts کہتے ہیں کیونکہ ان سب کا ایک ہی اثر پڑتا ہو مگر برخلاف موسیقی صنعتگری اور مصوری وغیرہ کے شاعری کی اثر انگیزی سے تمام قوتیں محظوظ ہو سکتی ہیں۔ چونکہ اس مسئلہ پر بڑی بڑی مبسوط کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس لیے میرا لکھنا نہ لکھنا سب برابر ہو بہرحال مصور جذبات مرزا عزیز صاحب کے دیوان میں یہہ خاص خصوصیت ہو عام اس سے کہ وہ شعر غالب کے رنگ میں ہو یا میر کے مگر شعر پڑھ کر جو کیفیت طاری ہوتی ہو وہ اُن لوگوں سے پوشیدہ نہیں جنھوں نے کہ گلکدہ پڑھا ہو یا خود مرزا صاحب کی زبان سے سنا ہو۔

دنیا کی ہر چیز پر تنقیدی نظر ڈالنے سے دو پہلو نکلتے ہیں ایک ایجابی اور دوسرا سلبی جس سے حسن و قبح کا اندازہ ہوتا ہو۔ اسی سے شاعری کے محاسن و معائب کا بھی پتہ چلتا ہو۔ اساتذہ متقدمین کے ہاں بھی یہہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا کلام نقائص و عیوب سے پاک و مبرا ہو۔ جب نکتہ رس اور خوردہ گیر حضرات نے غالب تک کو نہ چھوڑا تو مرزا عزیز بیچارے کس شمار قطار میں ہیں۔ مگر جہاں تک میری نظر کام کرتی ہو بتذل مضامین اور عامیانہ زبان کا گذر بھی "گلکدہ" کے پاس سے نہیں ہوا ہو۔ گلکدہ پر تنقیدیں دیکھتے ہوئے مجھے ریویو کرنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی بہرحال اور ہمعصروں نے جو اعتراضات کیے ہیں حتی الامکان ان کی صحت نہ کرنا بھی گویا انصاف پسندی کا خون اور شاعر کی دماغ سوزی کو خاک میں ملانا ہو۔

اس وقت "کہکشاں" اور "معارف" میرے سامنے موجود ہیں مگر دونوں کا سطح نظر

اور معیارِ تنقید ایک ہی دکھائی دیتا ہے۔ غالباً معاصرانہ چشمک کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ غور و خوض کی محنت گوارا نہ فرمائی۔ خیر جو کچھ بھی ہو مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔ ذیل میں مرزا صاحب کے کلام پر جو اعتراض ہوئے ہیں ان کا جواب ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں:۔

گل جو گلزار میں ہیں گوش بر آواز عزیز — مجھ سے بلبل نے لیا طرز شیوائی کا

"کہکشاں" کے ادب آموز صاحب شیوائی پر اعتراض کرتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سیکڑوں جگہ صرف مرزا غالب ہی نے اس کا استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "حیات غالب" مرتبہ مولانا الطاف حسین صاحب حالی صفحہ ۳۴۴ سطر ۱۲ "بدعوے گاہے کہ نوانائی قتیل را بفرو ہیدگی فرہنگ (یعنی بہ پسندیدگی روش) مسلّم داشتہ، ولوائے نورالعین واقف بشیوائی شیوہ (یعنی بخوبی طرز) برافراشتہ باشند"

مولانا کی مزید تسکین کے لیے مثال میں مرزا حبیب اللہ قاآنی کا بھی ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

شیوۂ شعر تو قاآنی سحر یست حلال — زانکہ گفتن نتواں شعر بدیں شیوائی

مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

ابھریں گی اور حسن کی سرگرمیاں ابھی — لیتے ہیں کام نالۂ آتش نشیں سے ہم

مجھے سخت افسوس ہے کہ مرزا صاحب کا نالۂ آتش نشیں ادب آموز صاحب کو علمی نکتہ چینی کا معہ اعتراض کی نوبت نہ آتی۔ مگر بدقسمتی سے مرزا عبدالقادر بیدل کے ہاں نالۂ آتش نشیں بھی ایسا ہی صاف دکھائی دیتا ہے جیسے "کہکشاں" میں اعتراض:۔ بیدل لکھتے ہیں ؎

چہ امکان است دل از حلقۂ داغت برآوردن — سپند بزم ما را نالۂ آتش نشیں باشد

مرزا عزیز صاحب کا شعر ؎

تختۂ مشقِ نگہ نا زبنایا جس کو   چشم پُرآب وہ آئینۂ حیراں نکلا

افسوس کہ مولانا ادب آموز صاحب کو تختۂ مشق کی ترکیب اضافت بھونڈی اور غلط معلوم ہوتی ہی۔ علمی ترکیبوں اور لغت کے حوالوں کو چھوڑتا ہوں لکھنؤ کے منشی امیر اللہ تسلیم کا ایک شعر یاد آگیا جو سند کے لیے کافی ہی ؎

زنہار جو کچھ تھا سو سمجھا تاصبح کو سودا ہو گیا   اب وہ میرا تختۂ مشقِ پند بیجا ہو گیا

مرزا صاحب کا شعر ؎

مایوس کب ہوئے دلِ خدسبا فریب ہم   کروٹ ابھی لوائیں گے سطحِ زمیں سے ہم

ادب آموز صاحب کا اعتراض:-

لینا مصدر کا متعدی المتعدی لوانا بنایا ہی اور اس سے کروٹ لوائیں گے لکھا جس میں حد سے زیادہ تکلف اور انتہا سے زیادہ بدنمائی بھری ہی۔

ایک زمانے میں مجھے بھی ایسے ہی اعتراض سوجھا کرتے تھے مگر کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ کی بود و باش نے متعدی المتعدی اور کروٹ لوانے کا اصلی مفہوم سمجھا دیا۔ کروٹ لوانا خاص لکھنؤ کا محاورہ ہی جو ٹکے کے مزدور سے لیکر کھیپتی شہزادے تک بولتے ہیں اگر حقیقتاً یہ غلط ہی تو اس کی تصحیح ادب آموز ہی کر سکتے ہیں اور کس کو جراءت کا موقعہ بھی نہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

ہاں اپنے حریم قدس میں ہنگامہ گرم کن   محفل کا رنگ دیکھ رہے ہیں یہیں سے ہم

ادب آموز صاحب کی نظر میں ہنگامہ گرم کن کھٹکتا ہو مگر وہ صرف مرزا عزیز صاحب کے گلکدہ میں نہ کہ میر محمد تقی میر کے دیوان میں۔ مجھے یہ دیکھ کر ہنسی بھی آتی ہی اور تعجب بھی ہوتا ہی کہ جن چیزوں سے اساتذہ کے دواوین مالا مال ہیں ان پر کس صفائی اور دلیری کے ساتھ اعتراض جڑے گئے ہیں۔ اگر مرزا صاحب گلکدہ تنقید کے لیے نہ بھیجتے تو شاید ان بیجا اعتراضوں کا خیر مقدم نہ کرنا پڑتا۔ میر محمد تقی میر جن کی زبان ہندوستانی شاعری

میں مستند ہی نہیں بلکہ ترقی اور تقلید کا زینہ بھی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا — پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

مصورِ جذبات مرزا عزیز صاحب کا شعر ؎

دیدنی ہے بزم میں دور دور بے خودی — رند ادھر بیہوش ہے ساقی اُدھر بیہوش ہے

مولانا ادب آموز صاحب کا اپنی نظر میں مستحکم اور مکمل اعتراض ہے۔

"دور دور بیخودی" یہ ترکیب سمجھ میں نہیں آئی اگر اس کا مطلب بے خودی کا دور دورہ ہے تو دور دورۂ بیخودی لکھتے مگر وہ بھی فارسی محاورہ کے اعتبار سے غلط ہوا۔ اگر بیخودی کا زمانہ مراد ہے تو دور کا لفظ دو دفعہ استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ دوسرا دور حشو قبیح سے کم نہیں۔

حقیقتاً یہ اعتراض مولانا نے بڑا پکا اور سوچ سمجھ کر کیا ہے مگر تھوڑی سی چوک ہو گئی۔ افسوس تو یہ ہے کہ بہار عجم میں بالکل صاف لکھا ہے "دور دور او ست یعنی حکم اوست از عالم دست دست اُو وایں از اہلِ زبان بتحقیق پیوستہ" مرزا صاحب لکھتے ہیں ؎ عقل و فطرت بجوئے نستانند؛ دور دور تۂ سکم و دستار است

اتفاق سے مولانا صاحب کی ضیافت طبع کرنے کے لیے مرزا عبدالغنی قبول کا بھی ایک شعر یاد آگیا ؎

درنظر آں نرگسِ مستانہ است؛ دور دور ساغر و پیمانہ است۔ مصورِ جذبات مرزا عزیز صاحب کا شعر

یہ مختصر سی ہے میری سوانح عمری؛ ہمیشہ وقفِ ستم ہائے روزگار رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوانح عمری پر کد مصرعے اعتراض جڑ دیا۔ علمی صورت سے اس میں کوئی غلطی نظر آتی ہے اور نہ باعتبار استعمال۔ مگر یہ بھی بہت ممکن ہے کہ مولانا ادب آموز صاحب کی نظر زیادہ نکتہ رس اور وقیق ہو جو بات انھوں نے سمجھی میری سمجھ میں نہ آئی ہو "شملہ بمقدارِ علم" کی مثل مشہور رہی۔ ممکن ہے میں وہاں تک نہ پہنچ سکا ہوں۔

اسکے علاوہ باقی اعتراضات کاف صلہ کے بیجا استعمال کے متعلق ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کاف صلہ کا استعمال مصورِ جذبات نے بہت زیادہ کیا ہے مگر میری نظر میں کہیں اعتراض کا موقع نہیں معلوم ہوتا۔ شاید مولانا صاحب نے یہ کہ ... کے لکھنے کا زحمت گوارا ... غزل ... تعریف ... دکھانے ...

تذکرہ

جناب جوشؔ کے طرزِ تحریر سے جو حضرات واقف ہیں اُن سے مخفی نہیں کہ اُن کے قلم کی کھینچی ہوئی کوئی نہ کوئی تصویر ہر مہینے پیش کرتا رہا ہوں اگرچہ وہ نام جسے سُن کر تحصیل ہردوئی کی ایک ایک اینٹ اپنی جگہہ سے ہل جاتی ہے ہر مضمون کے ساتھ ثبت نہیں ہوتا تھا۔ اب ناظرین یہ سُن کر محظوظ ہوں گے کہ ہماری درخواست پر انھوں نے منظور فرمایا ہے کہ آیندہ ہر مضمون کے ذیل میں وہی نام درج ہوگا جو دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل بہادر الہ آباد کے متفرقہ کے دفتر میں درج ہے۔ اب یقین ہے کہ اس امر کے سمجھنے میں کسی صاحب کو غلطی نہ ہوگی کہ "لیڈر" جناب منشی سلطان حیدر صاحب جوشؔ کے طبع نادوں میں ہے اور اُن کی ظرافتِ معنی جو نہایت آب و تاب سے ظاہر کر رہا ہے۔

ذاتیات دراز ایک اخبار کا پراسپکٹس ہے جو اب سے ۸۳ سال کی مدت قلیل کے بعد شائع ہونے والا ہے۔ چونکہ اڈیٹر نقیب کو رازداری کی عزت بخشی گئی ہے لہذا یہہ گزارش فوری توجہ کے قابل ہے کہ جو صاحب ذاتیات کے خریدار بننا چاہیں وہ اپنا نام فی الفور درج کرالیں۔ دوسری گذارش یہہ ہے کہ خریدار کے انتقال کے بعد وارثوں کو قیمت واپس کرنے کے قاعدے میں ترمیم کر دی گئی اور قرار پایا ہے کہ جو صاحب بعد انتقال اپنے صحیح پتے سے اطلاع دیں گے انھیں طبقۂ اعلیٰ میں جگہہ ملی ہو یا اسفل میں تو وہیں پرچہ بھیجنے کا انتظام کیا جائیگا کیونکہ صوبۂ ہذا کا محکمۂ ڈاک اپنی خوبیِ انتظام سے اب بھی خطوط و رسائل طبقاتِ سافل تک پہنچاتا رہتا ہے۔ آیندہ رسائل علمی کے خریداروں کو جو پرچے وقت پر نہ ملیں سمجھ لینا چاہیے کہ محکمۂ ڈاک کے حسن انتظام کی بدولت انھیں مقامات میں بھیج دیے گئے۔

مطبوعہ نقیب پریس بدایوں - وحید احمد پرنٹر

براہ کرم نقیب کے اگست نمبر میں صحت فرمالیجیے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۷	۲	ناقابلِ محسوس	ناقابلِ احساس
"	۶	قوتِ امعہ	سامعہ
"	۱۲	محفقات	مخفقات
۴۹	۱	مہرحیات	ممدحیات
۵۱	آخری سطر	بخنداں پیشانی	بخندہ پیشانی
۵۴	۹	پہنچا ہو	پہنچاتا ہو
۵۵	"	ناقابلِ محسوس	ناقابلِ احساس

قسم دوم

فہرست مضامین

اکتوبر ۱۹۱۹ء

براہ کرم
مضامین بلا اجازت
نقل نہ کیجیے

قواعد شرح اجرت اشتہارات

۱ ... الہ ہر ماہ کے آخر ہفتے میں شائع ہوا کرتا ہے۔

۲ شائقین کی آسانی کے لیے دو قسم کے کاغذوں پر چھاپا جاتا ہے۔ قیمت حسب ذیل ہے۔

قسم اوّل للعہ سالانہ ۱۲ ششماہی

قسم دوم ۱۲ سالانہ ×

کوئی خاص نمبر جو مطلوب ہو (بلالحاظ قسم) آٹھ آنے پیشگی۔ نمونہ (کوئی سا ایک گذشتہ نمبر ارسال ہوگا) تین آنے پیشگی۔

۳ نمونہ مفت نہیں دیا جائے گا۔

۴ کسی ماہ کا رسالہ نہ پہنچنے کی شکایت دس تاریخ تک آنا چاہیے۔

۵ جواب کے لیے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

صفحہ	سالانہ	ششماہی	سہ ماہی	ماہوار
	روپیہ	روپیہ	روپیہ	روپیہ
ایک صفحہ	۳۵	۱۸	۱۱	۵
نصف	۱۸	۱۱	۵	۳
چہارم	۱۱	۵	۳	۲

۱ اجرت اشتہارات ہر حالت میں پیشگی آنا چاہیے

۲ مختصر اشتہارات بشرح آٹھ آنے فی سطر لیکن دو روپیہ سے کم جس اشتہار کی اجرت ہوگی قبول نہیں کیا جائے گا۔

۳ اشتہار کی عبارت مہذب ہونا چاہیے

۴ یہ اجرت کم سے کم ہے براہ کرم اجرت ٹھہرانے میں تضیع اوقات نہ فرمائیے۔

کیا اس چند روزہ زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے؟ کیا موت اس سلسلے کو جسے ہم حیات کے نام سے تعبیر کرتے ہیں پورے طور پر منقطع کر دیتی ہے یا ایک دوسرے دورِ حیات کی تمہید؟ کیا انسان کا دل اور اس کے جذبات بھی قالب خاکی کی طرح فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں؟ اگر فانی نہیں تو جسم کو چھوڑ کر وہ اپنی ہستی کو کیسے برقرار رکھ سکتی ہیں؟ کیا انسان کی خلقت کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں جو فنا کے ہاتھوں سے محفوظ ہو؟ کیا یہی وہ خاک کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جو آج شہرِ خموشاں کے ایک خاموش کونے میں سینکڑوں من مٹی کے نیچے دبا پڑا ہے اور جو کل کسی رہ گذر کی گردِ راہ ہوگا وہ تبدیل شدہ انسان ہے جس کے ہنگاموں نے دنیا میں دھوم مچا رکھی تھی؟ کیا ایک الواجب الاحترام انسان کی حقیقت بس یہی ہے جو اس کی بے حس لاش سے ظاہر ہے؟ کیا وہ چیز جس پہ زندگی کا دار و مدار ہے جسم سے علیحدہ ہے یا اُس ہی میں شامل ہے؟ اگر جسم میں شامل نہیں تو کیا وہ چیز فانی ہے یا غیر فانی؟ اگر غیر فانی ہے تو جسم میں داخل ہونے سے پہلے اور اُسے چھوڑنے کے بعد اس کی کیا ...

پھر کیا اس غیر فانی چیز کا جسے محاورۂ عام میں روح یا جان بولتے ہیں جسم سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد دنیا و ما فیہا سے کچھ تعلق رہتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کچھ رہتا ہے تو وہ تعلق کس قسم کا ہے اور ہم کس حد تک اس سے واقف ہو سکتے ہیں؟ ....

یہ سوالات بسا اوقات انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور آج سے نہیں بلکہ ابتدائے آفرینش سے۔ اکثر اوقات تو ان کا اثر چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہتا لیکن بعض حالتوں میں اس قدر دیرپا اور راسخ ہوتا ہے کہ جذبات سے گذر کر اس تک پہونچ جاتا ہے اور خیالات میں ایک حیرت انگیز ہیجان پیدا کر دیتا ہے دنیا و ما فیہا کی خبر نہیں رہتی۔ ایک محویت و استغراق کا عالم طاری ہو جاتا ہے جس میں انسانی عقل کا شہباز سرحد ادراک سے اپنے بازوؤں کو سیکڑوں بار مارتا ہے لیکن ہر بار پیچھے ہی کو گرتا ہے یہاں تک کہ اپنی شکست پر نادم ہو کر پسپائی اختیار کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی ایک بڑی حد تک اس کے مستقبل کے زیر اثر ہے مثلاً اس لئے کہ وہ کسی کام کا ارادہ کرے مستقبل کے متعلق خوب غور و خوض کر لیتا ہے اور یہی مستقبل کا خیال اسے زندگی کے بعض دشوار گذار مقامات اور خطرناک حالتوں میں رہنمائی اور دلجوئی کا کام دیتا ہے لیکن یہ بات مایوس کن ہے کہ اس کا مستقبل جس قدر اس کے احاطۂ علم میں داخل ہے بہت محدود ہے اور جس قدر احاطۂ علم سے باہر ہے وہ غیر یقینی اور پُر اسرار ہے۔ موت اس کے لئے یقینی اور لابدی شے ہے لیکن "بعد الموت" ایک معمہ ہے جس کو حل کرنے سے وہ ابھی قاصر ہے۔ اسی حالت میں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اس کا ارادہ متزلزل۔ اس کے کام ناتمام۔ اور اس کی ہمت پست ہو اس مسافر کی طرح جو ایک تنگ و تاریک اور دشوار گذار راستے پر سفر کر رہا ہو اور جس کی منزل مقصود پر ایک پُر اسرار پردہ پڑا ہو

کیا یہ ضروری نہ تھا کہ ہر ایک قدم پر اُس کا پاؤں لڑکھڑائے! پھر وہ کیا چیز ہی کہ اس مایوسی کے عالم میں اسے سہارا دیئے جا رہی ہی؟ وہ کونسا خیال ہی کہ جس نے اس کے آسمان نا امیدی پر ایک امید کی کرن پیدا کر دی ہی؟ وہ کونسے جذبات ہیں جو اسے ایک مہیب اور پر اسرار انجام کے خوف سے بے پروا کیئے ہوئے ہیں؟ ..... وہ چیز مذہب ہی۔ وہ خیال "حیات بعد الموت" کا خیال اور وہ جذبات روحانیت کے تسکین آمیز جذبات ہیں۔ حیات بعد الموت کے خیال نے (جس کا ہر ایک مذہب کسی نہ کسی رنگ میں دعویدار ہی) بنی نوع انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی پر جس قدر گہرا اثر ڈالا ہی۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ جاہل اور اوہام پرست اقوام میں انسانی قربانی کی محرک کونسی چیز تھی؟ وہ کونسا خیال تھا جو ہندوؤں اور اچھوتوں کی کمسن اور حسین لڑکیوں کو کشاں کشاں بھڑکتی آگ کے شعلوں کی طرف لے جاتا تھا؟ جو صلیبی لڑائیوں میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھا وہی خیال تھا کہ اس "ورحیات" کے بعد ایک اور دور حیات بھی ہی جس میں نیک اعمال ابدی خوشی کا صلہ پاتے ہیں وہی خیال تھا کہ مرنے کے بعد بھی انسان زندہ رہ سکتا ہی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اس حقیقت کے چہرے سے نقاب اُٹھنے پر دنیا کا دار و مدار ہی "دنیا بامید قائم" ایک مشہور مقولہ ہی۔ لیکن آخر انسان کی سب سے آخری امید کیا ہی "حیات بعد الموت" یہ امید جو انسانی فطرت میں ودیعت کی گئی ہی زندہ رہنے اور زندگی کو غیر متعین مدت تک دینے کی خواہش پر ہی مبنی کیوں نہ ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ زندگی کو اس سے بقا اور مایوس دلوں کو اس سے ڈھارس ہی۔ کل ایک عورت جو پیشتر بیوہ تھی اپنا اکلوتا بیٹا خدا کے حوالے کر چکی ہی کھانے کو پیٹ بھر کے روٹی میسر نہیں اوڑھنے کو تن بھر کپڑا نہیں۔ ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں بیٹھی ہی بادل گرج رہے ہیں۔ بجلی چمک رہی ہی اور وہی امید اس کے جذبات سے بھرے سینے کو

ایک طوفان خیز سمندر کی طرح ابھار رہی ہے۔ گذشتہ کی یاد حال کی پریشانی اور مستقبل کا خوف
اس کی آنکھوں کے سامنے پورا پورا نقشہ جمائے ہوئے ہے۔ لیکن اس انتہائے مایوسی میں بھی
زندگی کی کشمکش جاری ہے آخر کس بھروسے پر؟ کس امید پر؟ ایک بڈھے شخص کو اپنے بڑھاپے
میں دونوں نوجوان بیٹوں کا صدمہ مفارقت برداشت کرنا پڑا۔ صبح سے شام تک اپنی کبڑی
پیٹھ پر بوجھ اٹھاتا ہے اور پیٹ پالتا ہے۔ اس گھر میں جہاں دو چراغ تھے اب ایک دیا بھی نہیں
کیا رات کی تاریکی، گھر کی ویرانی اور بے چراغی اسے اجازت دیتی ہیں کہ وہ ایک پل بھی چین کر
سوئے؟ مگر نہیں۔ وہ سوتا ہے اور ایک ایسی صبح کی امید میں سوتا ہے جو اسے مدت کے سوئے
ہوئے بیٹوں سے ملا دے۔ ایک عورت اکیلی ساحل سمندر کے قریب ایک ٹیلے پر رہتی ہے اس کے
جھونپڑی کے قریب ایک اونچا سا چبوترہ بنا ہے جس پر وہ رات کو بہت سی آگ جلاتی ہے۔ یہ آگ
جسے اس کی آتش شوق کی ایک چنگاری نے مشتعل کیا ہے۔ گم کردہ راہ جہاز رانوں کو رات کے
تاریکی میں راستہ دکھلاتی اور چٹانوں سے بچاتی ہے۔ اگر اتفاق سے کسی جہاز کو چٹان سے ذرا سا
صدمہ پہنچے تو اس کے زخمی دل کو ایک ٹھیس لگتی ہے جو اس کو اپنے پیارے خاوند کی غرقابی
یاد دلاتی ہے۔ بے تحاشا سمندر کی طرف بھاگتی ہے۔ ڈوبتوں کو بچاتی ہے ان کو اپنی جھونپڑی میں لاتی ہے
اور ہر طرح کا آرام و آسائش بہم پہونچاتی ہے۔ رات کی تاریکی اور سنسناہٹ میں جہاز راں اُسے
دیکھتے ہیں کہ وہ کھڑی رہتی ہے کہ کہیں آگ نہ بجھ جائے اور اس کی غفلت سے کوئی جہاز نہ تباہ
ہو جائے۔ مگر آہ وہ کیا چیز ہے جو راتوں کی سردی اور تنہائی کی وحشت میں اس کے سینے کو گرم اور
دل کو خوش رکھتی ہے؟ وہ کونسا خیال ہے جو اس آگ کی طرح اس کے دل کی آگ کو بھی نہیں بجھنے
دیتا؟ کس کے انتظار میں وہ یوں کھڑے کھڑے راتیں کاٹتی ہے؟ کیا سمندر کی پریشان خاطر موج کا
لب ساحل سے ہم کنار ہونا اس کے دور افتادہ محبوب سے وصل کا پیغام نہیں؟ اگلا سے یہ خیال

ہوتا کہ اس خوفناک سمندر نے اس کے خاوند کو تھوڑی دیر کے لیے نظر سے اوجھل نہیں کیا بلکہ ہمیشہ کے لیے ملیا میٹ کر دیا ہے۔ ہاں اگر اسے یہ خیال ہوتا کہ اس کے خاوند کی ہستی کا کوئی بھی حصہ فنا کے ہاتھوں نہیں بچا اور اُن دونوں کا وصل اُمید موہوم ہے۔ تو یقیناً وہ اسی چٹان سے سر ٹکرا کر اپنے کو ذرات عنصر میں شامل کر دیتی۔

غرضیکہ ایک دنیا روحانیت کی قائل اور حیات بعد الموت پر ایسا ہی ایمان و یقین رکھتی ہے جیسے کسی چشم دید واقعہ پر۔ لیکن ایک مادہ پرست سائنس داں کے لیے یہ ماننا سخت مشکل ہے کہ ہستی انسان کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو طبعی و کیمیائی قوانین کے عملدرآمد سے بالکل مستثنیٰ ہو جو جسم مادی کو چھوڑ کر اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکے۔ جو چل پھر سکے۔ دیکھ سکے۔ سن سکے۔ بول سکے۔ تاہم ایک معمولی آدمی نہ اسے دیکھ سکتا ہو۔ نہ سن سکتا ہو اور نہ محسوس کر سکتا ہو۔ اس کے نزدیک ایک دوسری زندگی کا خیال محض دل کو تشفی و تسکین کے لیے ہے۔ ورنہ بذات خود کچھ حقیقت نہیں رکھتا انسان کی فطرت میں زندہ رہنے کی خواہش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس لیے جب وہ موت کے ہاتھوں رشتۂ حیات کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی حقیقت کے باور کرنے میں پس وپیش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ زندہ رہنے کی خواہش اس کے سامنے حیات بعد الموت کی ایک خیالی مگر دلربا تصویر لا کھڑی کر دیتی ہے۔ اب اس خواہش کو جاری رکھنے کے لیے جس پر اُس کی زندگی کا انحصار ہے وہ اس خیالی تصویر کی طرف جھپٹتا ہے۔ اُسے پیار کرتا ہے۔ اُس پر تصور جماتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ وہ خیالی تصویر حقیقت وجود کے ساتھ اس کی چشم منتظر کے سامنے آجائے۔ اُن قوانین فطرت میں سے کہ جن پر تمام کارخانۂ قدرت کا توازن قائم ہے ایک یہ بھی قانون ہے کہ ہر عمل کے لیے ایک ردّعمل کا ہونا ضروری ہے گرمی کے لیے سردی۔ رنج کے لیے خوشی اور مایوسی کے لیے امید ہے۔ چنانچہ انسان جب اس زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے تو ایک دوسری زندگی کی امید موہوم کا منتظر ہوتا ہے۔ جب زمین کی خوشی سے

محروم کر دیا جاتا ہے تو پھر وہ آسمانوں کی طرف نظر اُٹھاتا ہے۔ جب موت جیسے مہیب انجام سے کسی طرح چھٹکارا نہیں دیکھتا۔ تو تسکین قلب کے لیے اُس میں ایک روحانی زندگی کا آغاز تصور کرتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی زندگی تمام و کمال زمین سے وابستہ ہے۔ آسمانوں سے اُسے واسطہ نہیں

مذکورہ بالا خیالات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ مادہ پرستوں نے سائینس اور موجودہ سائینس کو مکمل اور غلطی سے مبرا سمجھنے میں ایک ایسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے جو نہ صرف روحانیت کے حق میں ضرر رساں ہے بلکہ سائینس کی ترقی میں بھی زبردست رکاوٹ ہے۔ جو شخص ان خیالات کا دعویدار ہے وہ حقیقت میں سائینس اور سائینس کی ترقی کا ایسا ہی دشمن ہے جیسے قرون وسطےٰ میں یورپ کے پادری اور راہب مذہب علیہ موسیٰ کے دشمن تھے۔ اگر موخرالذکر کی ہٹ دھرمی کوتاہ نظری اور تنگ دلی عیسائیت کے لیے سم قاتل ثابت ہوئی تھی تو مدعیان سائینس کی تنگ نظری بھی سائینس کے دائرہ ترقی کو تنگ کرنے میں اس سے کم مہلک ثابت نہ ہوگی تعجب تو یہ ہے کہ یہ لوگ سائینس کی بیجا حمایت اور پرستش میں مذہبی دیوانوں سے کسی طرح کم نہیں۔ مگر اس پر بھی اپنے آپ کو مذہب کی زنجیروں سے آزاد سمجھتے ہیں۔ ان کی تنگ نظری ان کے اس خیال سے واضح ہوتی ہے کہ جس واقعہ یا امر کی سائینس مؤید نہیں وہ اصلیت اور واقفیت سے بالکل خالی ہے یا بالفاظ دیگر انسان کی عقل کامل اور اس کا علم صحیح اور غیر محدود ہے۔ یہ دعویٰ بذات خود جہالت پر دلالت کرتا ہے اور علوم و سائینس کی گذشتہ تاریخ کا ایک ایک حرف اسے جھٹلا رہا ہے کل جس بات کو سائنس خلاف عقل اور ناممکن بتلا رہی تھی آج وہی ممکنات میں شامل ہے۔ گذشتہ صدی کا سائنس جاننے والوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ایک عنصر یا دھات کا دوسرے عنصر میں تبدیل ہو جانا ایک ناممکن امر ہے لیکن موجودہ صدی کے سائنس دان اس تبدیلی عناصر کو نہ فقط ممکنات میں شمار کرتا ہے بلکہ اس کے وقوع کا بھی معترف ہے۔ مگر کیا یہ غلطی سائنس کی وقعت کو کم کر دیتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ فقط انسانی

عقل کی کمزوری اور تجربے کی خامی پر دلالت کرتی ہے۔ سائینس تو اُن علوم کے مجموعے کا ایک

دوسرا نام ہے کہ جس میں ایک ترتیب سلسلہ اور باقاعدگی پائی جاتی ہو۔ باستثنائے چند اس کے

اصول و قواعد تجربہ اور قیاس پر مبنی ہوتے ہیں جو غلطی اور خامی سے مبرا نہیں ہو سکتے۔ اور

تجربے کے ساتھ ساتھ ان میں بھی ترمیم و تنسیخ ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے اگر ان اصولوں کی رُو

سے آج ایک واقعہ انسانی عقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے تو یہ لازم نہیں آتا کہ وہ واقعہ اصلیت

اور صحت کے بالکل خلاف ہے بلکہ ممکن ہے کہ کل تجربہ و تحقیق اس واقعہ کو صحیح ثابت کر دے

جس کی وجہ سے سائنس کے قواعد میں ترمیم کرنا پڑے۔ روزانہ زندگی میں ایسے ہزاروں

غیر معمولی واقعات دیکھنے میں آتے ہیں جن کی تشریح سے سائنس قاصر ہے۔ ایک حقیقی

سائنس داں کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ان کے متعلق تمام عینی شہادتیں جمع کرے بچشم خود اُن کا

مشاہدہ کرے تحقیق کا کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھے اور پھر اس تحقیق سے جو نتائج منضبط ہوں انکو

سائنس کے اصولوں اور قواعد سے تطبیق دینے کی کوشش کرے۔

ابھی تھوڑا عرصہ ہوا یورپ کے سائنس دانوں نے صدیوں کی کامل بے اعتنائی کے

بعد جن میں اِن کی توجہ تمامتر تحقیقِ مادّے کی طرف مبذول رہی ہے مسئلہ نفس یا روح کی طرف

کروٹ لی ہے اور بالآخر وہ غیر معمولی واقعات جو روزمرہ دیکھنے میں آتے ہیں اور جن کی تشریح سے

سائنس قاصر رہی ہے مثلاً مرے ہوئے انسانوں کا ظاہر ہونا۔ خاص انسانوں کو خاص حالتوں

میں گذشتہ و آیندہ واقعات کا علم ہونا چیزوں کا بغیر کسی مادی ذرائع کے حرکت کرنا اور دیگر واقعات

جو حیات بعد الموت کے مسئلے سے پیوستہ ہیں سائنس دانوں کی توجہ و تحقیق کے قابل سمجھے

گئے ہیں۔ میرا روئے سخن اس "مجلس تحقیق علم الیقین" کی طرف ہے جس کی بنیاد ۱۸۸۲ میں انگلستان

کے چند فلاسفہ و سائنس دانوں نے ڈالی تھی۔ اگرچہ اس مجلس کے انعقاد کی اصلی غرض و غایت

تحقیقِ مسائل متعلقہ علم النفس تھی لیکن اس تحقیق کے نتائج سے یورپ میں روحانیت کی تحریک
کو بے حد تقویت ہوئی ہے جس کا ایک ادنیٰ نتیجہ یہ ہے کہ یہ علم (روحانیت) معمولی شعبدہ بازی وغیرہ
کی ذلیل حالت سے نکل کر سائنس کے دائرۂ تحقیق میں داخل ہو گیا ہے۔ اس تبدیلی خیالات کا
قصہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے جسے میں نہایت اجمالی طور پر یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہ خیال
کہ اس دنیا میں علاوہ جسمانی زندگی کے غیر جسمانی زندگی بھی ہے اور علاوہ معمولی جسمانی ذرائع کے
بعض غیر معمولی اور غیر جسمانی ذرائع بھی موجود ہیں جن کے ذریعے سے ماضی و مستقبل کے حالات
معلوم ہو سکتے ہیں ایک ایسا خیال اور اعتقاد ہے جو ابتدا سے بنی نوع انسان میں رائج چلا آتا ہے
تاریخ کا کوئی زمانہ اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کم و بیش اس عجیب و غریب عقیدے کی موجودگی
ثابت نہ ہو۔ اگرچہ جاہل اور وحشی اقوام بھوت چڑیل وغیرہ سے زیادہ متاثر دکھائی دیتی ہیں
لیکن مہذب اقوام بھی اس سے بچی نہیں۔ یونانی۔ ایرانی۔ رومن چینی اور ہندی سبھی اقوام
کسی نہ کسی صورت میں اس خیال کی موید نظر آتی ہیں۔ یورپ میں بھی زمانۂ جاہلیت میں یہ
خیال زوروں پر تھا۔ اس کے بعد عیسائیت کے اثر نے اس کے زور کو کسی حد تک کم کر دیا
لیکن جب سائنس کے دور دورے نے عیسائیت کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اور مادی ترقیات کا
افتتاح کیا تو یہ خیال کچھ عرصے کے لیے قریباً معدوم ہو گیا۔ لوگ دنیاوی مشاغل اور مادی ترقی
کی تگ و دو میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ غیر مادی ہستیوں اور غیر جسمانی ارواح کا خیال تک
بھول گئے بالآخر دو سائنس دانوں کی بدولت اس خیال نے ایک نئے رنگ میں دوبارہ
تقویت حاصل کرنی شروع کی۔ ان میں سے ایک ویانا کا ڈاکٹر مسمی مسمر MESMER تھا اس
ڈاکٹر نے پیرس میں آ کر ایک جدید طریق پر علاج کرنا شروع کیا۔ وہ مریض کو مقناطیسی اثر سے
بے حس کر دیتا اور اس حالت میں اس سے کہتا کہ وہ خود اپنی دوا تجویز کرے نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ

مریض جس نے اپنی عمر بھر میں میٹریا میڈیکا کی صورت بھی نہ دیکھی تھی ایک اچھے خاصے ڈاکٹر
کی صورت میں اپنی دوا تجویز کرتا اور اکثر حالتوں میں وہ دوا انتہا درجہ مفید ثابت ہوتیں یہ
طریق علاج آناً فاناً یورپ اور امریکہ میں پھیلتا گیا اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ایک حساس
شخص عالم بیخودی میں آ کر دوسرے مریض کے متعلق تشخیص مرض اور دوا تجویز کرتا اور اس
واقعہ کی تشریح یوں کی جاتی کہ دوا تجویز کرنے والی شخصیت اس آدمی کی شخصیت نہیں۔ بلکہ
کسی متوفی ڈاکٹر کی روح ہے جو عارضی طور پر اس شخص پر قابض ہے۔

وہ شخص جو یورپ میں روحانیت کا محرک ہوا ۱۶۸۸ء میں پیدا ہو کر SWEDEN BORG
تھا قریباً ۵۰ برس کی علمی زندگی بسر کرنے کے بعد اس شخص کو الہام شروع ہوا۔ عظیم الشان
متوفی انسانوں کی ارواح بڑے بڑے صوفی فلاسفر، بادشاہ اور پوپ جو عرصہ ہوا جسم خاکی کو
چھوڑ چکے تھے اس عجیب وغریب سائنس داں کو نظر آتے اور اس سے گفتگو کرتے
اس کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ بغیر ارادے کے اس کا ہاتھ وہ وہ باتیں لکھ دیتا جس کا اس کو
وہم بھی نہیں ہوتا۔

غرض کہ ان دونوں اشخاص کے عجیب وغریب دعووں نے اس وقت یورپ کی غیر
مطمئن پولیٹیکل حالت سے مل ملا کر روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا کر دی جو ایک قلیل عرصے میں تمام
یورپ و امریکہ میں پھیل گئی۔ امریکہ میں اسکی خوب آؤ بھگت ہوئی جہاں سے اس نئی تحریک کے
مشنری یورپ میں آنے شروع ہوئے۔ ان سب میں سے قابل ذکر ایک شخص مسمی ڈی ڈی
ہوم تھا جو ۱۸۵۵ء میں انگلستان پہنچا تھا۔ اس شخص نے تمام یورپ کا دورہ کیا اور بادشاہ و
بیگم فرانس اور زار روس کے سامنے بھی اپنے کرتب دکھلائے۔ یہ شخص بہت سی غیر معمولی،
طاقتوں کا مالک تھا جنھیں وہ غیر جسمانی ارواح کی طرف منسوب کرتا۔ ان میں سے چند

یہ تھیں :- (۱) وہ حاضرینِ مجلس کے متوفی دوستوں اور رشتہ داروں کی ارواح کو
بلاتا۔ ان سے گفتگو کرتا اور اُن کے پیام جو بالکل درست ہوتے حاضرینِ مجلس کو سناتا۔
(۲) بیخودی کی حالت میں وہ ایسے ایسے وعظ وتقریر کرتا جو اس کے احاطۂ علم سے باہر ہوتی
اور جنہیں وہ غیر جسمانی ارواح کی طرف منسوب کرتا (۳) ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کے
موجودگی میں بغیر ہلائے یا چھوئے میزیں اپنی جگہ سے ہوا میں اٹھتیں۔ کرسیاں حرکت کرتیں
اور پھول خود بخود گلدستہ سے نکلکر حاضرین کے ہاتھوں میں پہونچ جاتے۔ ان تمام واقعات
کے متعلق نہایت معتبر، عالم اور قابلِ اعتبار لوگوں کی شہادتیں موجود ہیں اور مؤخر الذکر واقعہ
کے بارے میں تو ایک ایسے شخص کی شہادت موجود ہے جس کا نام سائینس میں ایک بے مثال
شہرت و وقعت رکھتا ہے۔ وہ شخص سر ولیم کرکس (SIR WILLIAM CROOKES) ہے جو علم کیمیا
کی تاریخ میں ایک بہت بڑے پائے کا عالم ہے اس سائینس داں نے ڈی ڈی ہوم اور اس
کے کرتبوں کا ایک نہایت ہی آزاد بے غرض اور غیر طرفدار نقطۂ نگاہ سے امتحان لیا تھا
اور اس تحقیق کے متعلق ایک تفصیلی بیان تحریر کیا تھا۔ اس بیان میں وہ مشہور سائینس داں
لکھتا ہے "کہ ان واقعاتِ غیر معمولی کا اصلی باعث چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن مجھے اس میں ذرا
شک وشبہ نہیں کہ ان میں اصلیت ضرور ہے۔ اور دھوکہ فریب نہیں"

بالآخر جب سائینس دانوں نے ڈی۔ ڈی۔ ہوم اور اس قماش کے دوسرے لوگوں
کی وجہ سے یورپ کی دلچسپی ان معاملات ومسائل میں بڑھتی ہوئی پائی تو قدرتی طور پر ان کی
توجہ بھی اس طرف مبذول ہوئی۔ بلاشبہ ان کے لیے یہ ایک قابلِ افسوس امر تھا کہ جن معاملات
و واقعات کے بارے میں نامی گرامی اور قابلِ اعتبار لوگوں کی شہادت موجود ہو وہ ابتک بغیر ثبوت
یا تردید کے پڑے رہیں۔ چنانچہ انگلستان کے علمی حلقے میں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان واقعات

کی سائنٹیفک اصولوں پر تحقیق کی جائے اور اسی سلسلے میں پروفیسر ہبرٹ مجوک اور مائیرز کی کوششوں سے وہ سوسائٹی بنی جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

اگر اس سوسائٹی کا بحیثیت مجموعی کوئی خاص مذہب نہیں لیکن تاہم اُس کے بہت سے سربرآوردہ رکن جن میں سراولیورلاج SIR OLIVER LODGE کا اسم گرامی قابل ذکر ہے ذاتی اور مجموعی تحقیق سے مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچے ہیں:-

(۱) انسان جسم خاکی کو چھوڑ دینے کے بعد اپنی روحانی ہستی کو برقرار رکھتا ہے (۲) حیات بعد الموت تقریباً ہر لحاظ سے موجودہ زندگی کے بہت مشابہ ہے (۳) آیندہ زندگی کا اچھا ہونا یا بُرا ہونا اُن اعمال پر منحصر ہے جو انسان سے اس زندگی میں سرزد ہوتے ہیں (۴) مرنے کے بعد انسان کی روح اپنے پسماندوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور ان کی حالت سے واقف ہوتی ہے (۵) دل را بہ دل رہیست کا واقعہ بالکل درست ہے یعنی ایک دل پر ہزار کوس کے فاصلے سے ایک دوسرے دل کے خیالات منعکس ہو سکتے ہیں اور یہ سب روحانی ذرائع سے ہوتا ہے (۶) بعض لوگوں میں فطری طور پر یہ قابلیت پائی جاتی ہے کہ وہ ارواح کے ساتھ تعلق پیدا کر سکیں یا غیر جسمانی ارواح ان کی وساطت سے دوسروں سے ہمکلام ہو سکیں۔ اور اس حالت میں جبکہ معمول کا کام کرتے ہوتے ہیں ان کی اپنی شخصیت عارضی طور پر موقوف ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "معمول" کو ان واقعات کا علم نہیں ہوتا جو حالتِ بیخودی میں اُس سے سرزد ہوتے ہیں

ایک تجویز

انشاءاللہ العزیز میں "نقیب" کی کسی دوسری اشاعت میں ان تجربات کا مختصراً ذکر کرونگا جو یورپ میں مسئلہ حیات بعد الموت کے متعلق کیے گئے ہیں۔ مگر فی الحال میں ہندوستان کی اس چھوٹی سی علمی دنیا کے سامنے جنہیں علوم کی ترقی میں عموماً اور اس مسئلے کے حل میں خصوصاً

دلچسپی ہے۔ ایک تجویز پیش کرتا ہوں مختصر الفاظ میں وہ تجویز یہ ہے کہ اس ملک میں بھی ایک ایسی مجلس قائم کی جائے جس کا مقصد عظیم یہ ہو کہ اُن تمام واقعات و حادثات کی جو مسئلہ روح یا حیات بعد الموت سے تعلق رکھتے ہیں اور جو اس ملک میں اس قدر عام ہیں کہ تقریباً ہر ایک شخص ان سے متعلق کچھ نہ کچھ ذاتی واقفیت رکھتا ہے نہایت ہی منصفانہ اور ناقدانہ نقطۂ نگاہ سے سائنٹیفک طور پر تحقیق کی جائے اور اس تحقیق سے جو نتائج مترتب ہوں ان کو پبلک کے سامنے سوسائٹی کے ایک جرنل کے ذریعے سے پیش کیا جائے۔

افکار آزاد سبحانی

ہے زباں والوں میں چرچا کہ کوئی دل نہ رہا	اہلِ دل کہتے ہیں باقی کوئی بیدل نہ رہا
اُٹھ گیا خلق سے اب لطفِ محبت افسوس	آپ کی تیغِ محبت کا وہ گھائل نہ رہا
حشر میں نامۂ اعمال سے عقدہ یہ کھلا	ایک بھی جرم مرا عذر کے قابل نہ رہا
سُن کے یہ طعن کہ ہے قحط کرم کا۔ بولے	دینے والے تو بہت ہیں کوئی سائل نہ رہا
رسمِ ظاہر پہ نہیں اصلِ تعلق موقوف	تجھ کو بھولا رہا لیکن کبھی غافل نہ رہا
حشر انگیز ہیں ہر سمت زبانی دعوے	صفحۂ ارض پہ شاید کوئی عامل نہ رہا
لگ گئی فتوے تعزیر پہ مہر آخر کار	کیا زمانے میں کوئی مفتیِ کامل نہ رہا
معرکے سخت پڑے ہیں سر و تن کے کتنے	شکر۔ شرمندہ کہیں خنجرِ قاتل نہ رہا
آبرو رہ گئی اک بھیڑ تماشائی تھی	زیرِ تیغ آپ کا سر باختہ بسمل نہ رہا
مجمعِ بلبل و گل تھا کبھی سامانِ نشاط	دلِ افسردہ اب ان قصوں پہ مائل نہ رہا
مٹ گیا امنِ تسکیں میری امیدوں کا	کدو موجوں سے ابھریں کہ وہ ساحل نہ رہا
اب میں آزاد ہوں سچ ہے کہ کوئی قید نہیں	پردۂ وہم بھی اب بیچ میں حائل نہ رہا

مقدمہ "جولیس سیزر"

از قلم معجز رقم جناب سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

میرے کرم فرما منشی تفضل حسین صاحب ناشر "تسخیر فرانس" کے نام سے شکسپیر کے ایک ڈراما کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ اسے کافی قبولیت حاصل ہوئی اور اُن کے ادبی ذوق نے اس مرتبہ ترجمے کے لیے "جولیس سیزر" انتخاب کیا جسے بعض نقاد شکسپیر کا سب سے اچھا تاریخی ڈراما کہتے ہیں۔

شاعر کے پُر اثر بیان کا لطف ناظرین کو کتاب کے مطالعہ سے ہوگا لیکن چونکہ یہ قصہ **پلوٹارک** یونانی کی کتاب سیر (مشاہیر یونان و روما) سے ماخوذ ہے لہذا مترجم صاحب موصوف نے خاکسار راقم الحروف سے فرمائش کی کہ چند صفحے بطور مقدمہ لکھ دوں جس میں اُس پر آشوب عہد کے تاریخی واقعات اجمالاً بیش کر دیے جائیں تاکہ ناظرین کی آنکھوں میں اُس زمانے کا کوئی بھی ایک دھندلی تصویر پھر جائے جہاں روما کے نامور ایکٹروں نے یہ عبرتناک تماشا دکھایا تھا۔

رومیولس کے شہر میں چار صدی سے جمہوری حکومت قائم ہے۔ اُس کی آبادی کو سات سو برس گذر چکے۔ اب وہ گاؤں نہیں۔ شہر ہے۔ کسی معمولی رئیس کا مستقر نہیں، قدیم دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا صدر مقام ہے:-

براعظم یورپ کا سب سے آباد و زرخیز "جنوب مغربی ثلث" اس کے قبضے میں ہے۔ فرانس پر تسلط قائم ہو چکا برطانیہ کو لینے کی فکر ہے۔ "برِ سیاہ" کے سب سے اچھے ٹکڑے اس کے پاس ہیں اُس کے بچے اپنی جاگیر تیونس کے انجیر، الجیریا کی کھجور، مصر کا گیہوں کھاتے ہیں۔*

---

* پہلی صدی قم میں اس کثرت سے یہاں کا گیہوں روما جانے لگا تھا کہ اگر اس کی یہ آمد کبھی بند ہو جاتی تو شہر میں قحط پڑ جاتا تھا۔

غربی مراکش کی دھوپ میں رومی پیادوں کے خود چمکنے لگے۔ چند روز میں یہاں کے ہر گوشے میں اُس کا پھریرا لہراتا نظر آئے گا۔ "ایشیا کے "ساعد سیمیں" تک رومیوں کا ہاتھ پہنچ گیا۔ شام تمدن کا گہوارہ دولت کی کان ہے۔ ایشائے کوچک میوے کا گھر، معادن کا خزانہ ہے۔ اِن دونوں کا مالیہ رومی عمال وصول کرتے ہیں اور اب عراق وارمینیہ پر نظر ہے۔ سلطنت پارتھیہ[1] کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ فوج کشی کے سامان ہیں۔

طرفہ تر یہ کہ جنگ کسی حملہ آور سے اپنی مدافعت کرنے کے واسطے نہ تھی۔ کشورستانی اس کا مقصود نہ تھا۔ بلکہ اس کی تہ میں صرف رومی سرداروں کا جذبۂ خود نمائی انھیں حرکت دے رہا تھا بہادروں کے دل ہنگامۂ رستخیز و برن کے بغیر قرار نہیں پاتے۔ خون کا صیقل نہ ہو تو سپاہی کی تلواریں زنگ آجاتا ہے تاکہ رومی علاقوں میں فساد ہوتے رہتے تھے، فوج والوں کو شمشیر زنی کا سپہ سالاروں کو اپنی جنگی قابلیت دکھانے کا اور ہم وطنوں سے داد پانے کا موقع مل جاتا تھا لیکن "باغی رعایا" کی لڑائی کیا اور جو بغاوت ناکام ہو اُس کی وقعت کیا؟ دوسرے بار بار ایسے واقعات پیش آنے سے اہلِ رومہ کو مساوات ہو گئی تھی۔ باغیوں کے سرغنہ مشکیں باندھ کر جلوس فتح کے ساتھ شہر میں لائے جاتے تو اب "مرحبا" اور "جزاک اللہ" کا اتنا غُل نہ ہوتا تھا کہ چند روز تک ان کے کانوں میں گونج، اور سینوں میں نازش رہے۔ پھر یہ کہ جب سے قرطاجنہ تباہ ہوا (۱۴۶ ق م) اس وقت سے

---

[1] "پارتھیہ" درحقیقت اُس ایرانی صوبے کا نام ہے جسے اہلِ عرب جبال کہتے تھے۔ مگر اشکانیوں نے جو سلطنت یہاں تیسری صدی میں قائم کی اس میں زیادہ تر موجودہ "خراسان" کا علاقہ داخل تھا۔ افسوس ہے مشرقی مورخوں نے جن کا ماخذ "شاہ نامہ" یا "خدائے نامہ" ہے اشکانیوں کے بہت کم حالات لکھے ہیں۔ حالانکہ وسعت و قوت میں ان کی سلطنت ساسانیوں سے کم نہ تھی اور چار صدی تک نہ صرف ایران و عراق بلکہ ہندوستان کے بعض اقطاع پر بھی اسی خاندان کے بادشاہ فرمانروائی کرتے رہے۔

اِدھر تو رومی سپاہی اپنے مقابلے میں ہر دشمن کو کمزور سمجھنے لگے اور اُدھر ان کا ایک ایک سپہ سالار سکندر اعظم ثانی اور سپیو اعظم ثالث بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ دلوں میں سکندر کی مشرقی میراث فتح کرنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ ملک گیری کے لیے نہیں بلکہ محض اس لیے کہ اُن کا نام بھی بڑے بڑے فاتحین کی فہرست میں داخل ہو جائے ؂

شہرت ذاتی کی یہ ہوس جس میں دوسروں کی اغراض و منافع سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ حقیقت میں اُس خود پسندی کی بالائی سطح ہے۔ جو آخر میں تا بو یافتہ اہل ہوس کو مطلق العنانی و جبر کی راہ پر لگا لاتی ہے اور جس قوم میں اس قسم کے افراد نظر آئیں سمجھ لینا چاہیے کہ اُس کا زوال قریب ہے کم سے کم جمہوری حکومت کے حق میں جذبۂ خود پسندی زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے ؂ مگر جمہوری حکومت کی خصوصیات کا ذکر آیا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس حکومت نے کسی غیر ملک پر حاکمانہ قبضہ کر لیا ہو اُس پر "جمہوری" کا اطلاق بھی درست ہے؟ "جمہوریت" میں سب کے حقوق مساوی، ہر شخص کی رائے آزاد اور دوسروں کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ اور اگر یہ تعریف صحیح ہے تو وہ سلطنت جمہوری ہونے کا دعویٰ کس طرح کر سکتی ہے جس میں کسی علاقے کے باشندے آزادیٔ رائے سے محروم اور دوسروں کے محکوم ہوں؟

یونان کی قدیم ریاستوں نے حکومت کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ اپنے گھر میں آزادی، مساوات مگر باہر جا ستانی، شہنشاہی اور جبراً محکوم بنانا جائز کر دیا۔ انھیں زیادہ کامیابی نہ ہوئی کیونکہ وہ بہت چھوٹی رہیں تھیں۔ اور وہاں کے تنگدل باشندے اپنی حدودِ بلدی کے باہر کسی کو جمہوری اور شہری حقوق میں شریک کرنا گوارا نہ کرتے تھے خواہ وہ اُن کے ہم نسل اور ہم زبان ہی کیوں نہ ہوں ؂

اہل رومہ ایسے تنگ ظرف نہ تھے اور بیرونی معرکوں میں انھیں اپنے قریبی مقبوضات سے مدد لینی پڑی تو ان محکوم ہمسایوں کو انھوں نے خوشی سے اپنا حلیف بنا لیا تھا۔ بلکہ پہلی صدی (ق م) میں جبکہ رومہ کی جمہوری سلطنت بظاہر عین عروج پر تھی، اِن حلیفوں نے لڑ جھگڑ کر قریب قریب

وہ ان حقوق حاصل کر لیے تھے جو خاص روما کے آزاد باشندوں کو حاصل تھے۔ لیکن یہ رعایت صرف اطالیہ کے وسطی اور بعض جنوبی شہروں کے لیے تھی۔ ورنہ موجودہ اطالیہ کا شمالی صوبہ اس وقت "ماورائے ایلپس" اور غیر علاقہ شمار ہوتا تھا۔ اسی طرح صقالیہ یا اور صوبوں کے باشندے حکومت میں کوئی دخل نہ رکھتے تھے بلکہ اہل روما کے فرستادہ نائبوں کے محکوم تھے۔ گویا جمہوریہ روما ایک شہنشاہی سلطنت بن گئی تھی۔

اس شہنشاہی میں خاص روما کا ہر آزاد و بالغ شہری حصہ دار تھا اور وہاں کی مجلس عوام کو نہایت وسیع اختیارات حاصل تھے لیکن آبادی کی کثرت اور سیاسی کاروبار کی زیادتی کی وجہ سے ناممکن ہو گیا تھا کہ ہر معاملے میں "عوام کی رائے" دریافت کی جائے۔ لہٰذا یہ خدمت مجلس اعیان (سینٹ) انجام دینے لگی تھی اور اعلیٰ عہدہ دار اس کے رکن ہوتے تھے۔ شروع میں ان سب عہدوں پر سوا شرفا (پیٹریشینز) کے سوا کوئی منتخب نہ ہو سکتا تھا لیکن کئی صدی سے حسب نسب کی قید اٹھ گئی تھی اور جو زمانہ ہمارے پیش نظر ہے اس وقت روما میں نسبی شرافت کو کوئی نہ پوچھتا تھا "شرافت منصبی" نے اس کی جگہ لے لی تھی......

غور کرنے والوں پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ نوع انسان کی سرشت ہی میں نقص و خامی ہے اس کی شہادت میں دنیا کی تاریخ گویا حدیث متواتر کا پایہ رکھتی ہے کہ والعصر ان الانسان لفی خسر (گزرنے والے) زمانے کی قسم۔ شاید اسی تاریخ گذشتہ کی طرف اشارہ ہے........ رومیوں نے سخت جد و جہد کے بعد شرفائے خاندانی کا ناواجب امتیاز مٹایا تھا لیکن عوام کے گروہ سے جو لوگ اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے ان کی اولاد کچھ اپنی استعداد اور کچھ اپنے بزرگوں کی شہرت و وجاہت کے اثر سے ان عہدوں کی زیادہ حقدار سمجھی جانے لگی اور جب عہدہ داروں کا انتخاب عملاً مجلس اعیان کے ہاتھ میں آگیا تو اس کے ارکان زیادہ تر اپنے اہل خاندان یا متعلقین ہی کو

سلطنت کی خدمات جلیلہ پر مقرر کرنے لگے۔ وسعتِ سلطنت کی وجہ سے جس قدر ان عہدوں
کی قدر و منزلت بڑھی اُسی قدر مجلسِ اعیان کو یقین ہوتا گیا کہ عوام الناس ان مناصب کے
اہل نہیں ہو سکتے بلکہ صرف وہ لوگ یہ بارِ اُٹھانے کی قابلیت رکھتے ہیں جنھیں بچپن سے
عمدہ تربیت اور فرائض ملک داری کی تعلیم ملی ہو۔ ان اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری صدی
ق م سے روما کی سیاسی حالت پھر اسی قسم کی ہوگئی جیسی کہ جمہوریت کے آغاز میں تھی یعنی
دولت مند خواص اور عوام الناس کے الگ الگ دو گروہ بن گئے اور اُن میں قریب قریب ہی
بیگانگی نظر آنے لگی جیسی کہ قدیم "شرفا" اور "انفار" (پلیبینز) میں تھی۔ بلکہ اس عہد کے
عوام الناس کو ہم اول اول بہت غضب ناک پاتے ہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ اپنے تئیں
سلطنت روما کا حقیقی مالک جانتے تھے۔ اور قانون بھی یہی کہتا تھا۔ مگر عملاً حکومت، اعلیٰ طبقے
کے قبضے میں تھی اور اس کے افراد عوام الناس کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے تھے۔

بنی نوع کو حقیر سمجھنے کا یہ جذبہ ممالک مفتوحہ میں پرورش پاتا تھا جہاں رومی صوبے دار
قریب قریب مطلق العنان ہوتے تھے، جہاں رعایا کو اُن کے احکام کے خلاف چون و چرا کی
مجال نہ تھی اور جہاں نہایت معزز افراد بھی رومی عمّال کی مصاحبت اور غاشیہ برداری کو
اپنا فخر جانتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ جب یہ رومی عمّال بے شمار دولت اور غلاموں کی فوج
کی فوج لے کے اپنے وطن میں واپس آتے اور عالیشان مکانات بنا کے شاہانہ کر و فر کے ساتھ
زندگی بسر کرتے تو اپنے غریب ہموطنوں کی اُن کے دل میں کوئی وقعت نہیں رہتی تھی اور وہ لوگ
اُن کے ساتھ میل جول اور برابری کے تعلقات رکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ پہلی صدی قبل
مسیح میں یہ فرقِ مراتب بہت نمایاں ہوگیا تھا۔ اس فرق کو مٹانے کی جو کوششیں عوام الناس کے
طرفداروں نے کیں اس میں اول اول وہ ناکام رہے اور جمہور کی قوت کو ایک نقطے پر متحد

نہ کر سکے لیکن جب نومیدیا (افریقیہ) کی جنگ میں طبقۂ امرا کے سپہ سالاروں کی رشوت ستانی اور نااہلی کی بدولت رومیوں کو اپنے ایک باجگزار کے ہاتھ سے شکستیں کھانی پڑیں تو مجلس اعیان کے خلاف جوش عام پیدا ہوگیا اور عوام الناس نے امرا کے علی الرغم اپنے گروہ کے ایک شخص (ماریوس) کو سپہ سالار بنادیا۔ اس نے افریقیہ اور پھر اطالیہ کے شمال میں یادگار فتوحات حاصل کیں اور بڑی شہرت و ناموری پائی لیکن جب اس ناموری کے بل پر اس نے وطن کے اندرونی معاملات میں امرا کا زور توڑنا چاہا تو مجلس اعیان کے ارکین اس کے خلاف متحد ہوگئے اور کئی سال کی جد و جہد اور سخت خونریزی کے بعد آخر کار انھوں نے میرئیوس اور عوام الناس کے دوسرے حامیوں کو مغلوب کرلیا۔

دنیا میں تلوار کا فیصلہ آخری فیصلہ سمجھا جاتا ہے یعنی پھر فریق غالب کو اپنے غلبے اور مغلوب کو اپنی کمزوری کا یقین کرنے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ "رومی عوام" کو بھی خواہ مخواہ سلا کی فتح (۸۲ قم) کے بعد مجلس اعیان کے سامنے سر جھکا دینا پڑا اور اس اندرونی کشمکش اور خانہ جنگی کا بظاہر خاتمہ ہوگیا۔ لیکن اس بات کو زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اسی نفسانیت اور اقتدار پرستی کا جو بیج پہلے "جمہور" میں تفرقہ ڈالا تھا خاص امرا کے گروہ میں ظہور ہوا بعض دلوں میں اختیار مطلق حاصل کرنے کی تمنا جوش مارنے لگی اور مجلس اعیان یا گروہ خواص کا تختہ الٹنے کے لیے خود امرا میں ساز باز ہونے لگی۔ کاتلین کی سازش انقلاب (۶۳ ق م) اور بعد میں کلوڈیئوس کی وحشیانہ حرکات (۵۸ ق م) گویا انھی امنگوں کا بُری طرح ظاہر ہونا تھا۔ ورنہ درحقیقت ان دشمنان ملک سے کہیں

لہ (متعلق صفحہ ۱۴۷) یعنی ٹائی بے ریئس اگریکوس اور اس کا بھائی گائیوس جو زمینوں کی از سر نو تقسیم چاہتے تھے تاکہ قدیم قوانین کے مطابق کوئی شخص ایک معین رقبے سے زیادہ زمین پر قبضہ نہ رکھ سکے اور امرا نے جو بڑی بڑی جاگیریں بنا رکھی تھیں وہ ان سے واپس لے لی جائیں۔ روم کے غیر زراعت پیشہ عوام الناس کو ان اصلاحات سے چنداں دلچسپی نہ تھی اور یہ دونوں بھائی ناکام ہوئے ۱۲۔

زیادہ طاقتور ہاتھ اندر ہی اندر جمہوریت کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ سنہ ۶۰ ق م میں چالاک جولیس سیزر نے روما کے قارونِ وقت کراسوس کو اور سب سے نامی سپہ سالار پمپی کو ایک زنجیر اتحاد میں وابستہ کر لیا تھا اور پانچ سال بعد جب اس خفیہ معاہدۂ اتحاد کی تجدید ہوئی تو ان تینوں میں سلطنت کے باقاعدہ حصے بخرے ہو گئے۔ یعنی کئی سال کے لیے ممالک ایشیائی حکومت کراسوس کو ملی۔ اسپانیہ اور افریقہ کے وسیع صوبے پمپی کے حصے میں آئے۔ غالیہ (گال) یعنی موجودہ فرانس اور "ایں روئے الپس" سیزر کے حوالے کر دیا گیا (۵۵ ق م)۔ تم تاریخ میں دیکھیے کہ یہ سب تجویزیں مجلس اعیان میں پیش ہو کر بالاتفاق منظور ہوئیں۔ کیونکہ سیزر کی زبان، دوا فی کراسوس کی دولت اور پمپی کی فوجی قوت و شہرت کے مقابلے میں کسی مخالف کو دم مارنے کی ہمت نہ تھی اور جس نے آواز اونچی کی اسے جبراً چپ کر دیا گیا۔

کراسوس یہ حکومت پا کر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ ہوس شہرت اسے سکندرِ ثانی بننے کے خواب دکھا رہی تھی۔ شام کے ملک میں پہنچتے ہی اس نے پارتھیہ سے وہ لڑائی چھیڑ دی جس کا اس مضمون کے شروع میں ذکر آچکا ہے۔ مگر جنگ میں جا بجا شکستیں کھائیں اور بے کسی کی موت مارا گیا۔ قریب قریب تمام رومی لشکر جو اس مہم پر گیا تھا ہلاک ہو گیا۔ سنہ ۵۳ ق م

پمپی نے صوبوں پر اپنی طرف سے نائب مقرر کر دیے تھے۔ خود شہر میں شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ رہتا اور وقت کا زیادہ حصہ عیش و عشرت میں گذارتا تھا۔ اس کے برخلاف جولیس کا کوئی دن جنگی تیاری سے خالی نہ تھا۔ وہ غالیہ اور برطانیہ کی جنگجو قوموں سے لڑ کر اپنا "زور بڑھا رہا" تھا اور کوئی مہینہ ایسا نہ گذرتا ہوگا جس میں اس کی تازہ فتوحات کی خبریں روما نہ آتی ہوں۔ ان تیاریوں کا حال سن کر پمپی کو کسی قدر خوف و حسد پیدا ہوا۔ مجلس اعیان کے سربرآوردہ اراکین اسی بات کی تاک میں تھے کہ کسی طرح ان طاقتور سپہ سالاروں کو آپس میں

لڑا دیا جائے جنھوں نے مجلس کی طاقت گویا سلب کر لی تھی اور اب اُن پر مجلس کا کچھ زور نہ چلتا تھا۔ بعض دور اندیش ارکین اس بات کو بھی پہلے سے تاڑ گئے تھے کہ مذکورۂ بالا "اتحادِ ثلثہ" کا سب سے خطرناک رُکن سیزر رہے۔ پس اُنھوں نے خوشامد پسند پمپی کو ملا کر سیزر کا زور توڑنے کی کوشش کی اور ۵۰ قم میں مجلس کی طرف سے احکام جاری کر دیے گئے کہ میعاد ختم ہوتے ہی سیزر اپنے عہدے سے دست بردار ہو جائے۔ اِن احکام کو منسوخ کرانے کے لیے سیزر نے بہت سی رشوتیں دیں۔ مگر جب اس قسم کی "قانونی تدابیر" سے کام نہ چلا تو اس نے قانون پسندی کا مصنوعی نقاب الٹ دیا اور "مادرِ وطن پر چڑھائی کی"۔ وہ اس قدر تیز بڑھا تھا کہ پمپی کو اطالیہ میں اس کا مقابلہ کرنے کی جرات نہ ہوئی کیونکہ یہاں کے عوام الناس طبقۂ امرا سے بیزار تھے اور مجلسِ اعیان کی خاطر جان دینے پر خوشی سے آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ غرض مجلس کے اعزا اور اُن کا سپہ سالار پمپی اطالیہ چھوڑ کر یونان بھاگ آئے۔ دار السلطنت پر سیزر کا قبضہ ہو گیا اور ہسپانیہ میں پمپی کے نائبوں کو مغلوب کرنے کے بعد اُس نے خود پمپی کو فرسالیہ (تھسلی) میں شکست دی۔ یہ شکست خوردہ سپہ سالار فرار ہو کر مصر آیا تھا وہیں ذلت اور کس مپرسی کی موت مارا گیا۔ مجلس اعیان کے رہے سہے ارکین افریقہ میں گھر کر کام آئے یا انھوں نے فاتح کی اطاعت قبول کر لی۔ تمام سلطنت رومہ میں سیزر کا کوئی مدِ مقابل نہ رہا اور ۴۵ قم میں اُس نے دوبارہ ہسپانیہ جا کر پمپی کے بیٹوں کا قلع قمع کر دیا۔ یہی واقعہ ہے جہاں سے شکسپیر کا ڈراما شروع ہوتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ رومہ کی جمہوری حکومت کا خاتمہ اُسی وقت ہو گیا تھا جبکہ سلّا کی فوجوں نے عوام الناس کے حامیوں کو مغلوب کیا اور عوام کے بہت سے حقوق چھین کر مجلس اعیان کو "قانوناً" سلطنت کا مالک بنا دیا (۸۲ قم) پھر ۲۲ برس بعد سیزر نے کراسوس و پمپی کے مل کر ممالک مفتوحہ کی تقسیم کی تو خود مجلس اعیان کی حیثیت ایک میونسپل کمیٹی یا بلدیہ کی سی

رہ گئی جس کا خود شہر کے بدمعاشوں پہ زور نہ چلتا تھا اور خاص روما کے اندرونی امن و انتظام کے لیے بھی وہ سپہ سالار پمپی کی دست نگر ہو گئی تھی۔ دنیا میں صرف خدا یا "برابر والوں" کے انتقام کا خوف انسان کو ظلم و جبر کرنے سے باز رکھ سکتا ہے۔ سیزر نے برابر والوں کو مغلوب و مقہور کر لیا۔ خدا اور آیندہ سزا جزا کا اسے یا اس کے معاصرین کو اعتقاد نہ تھا۔ پھر کیا چیز تھی جو اس کے جبر و مطلق العنانی میں مانع آتی۔ مگر اہل ہوس کی خود نمائی نے اکثر کامیابی کے باوجود انھیں نقصان پہنچایا ہے۔ سیزر کو بھی اس شیخی کی سزا ملی یعنی صرف بادشاہی کی قوت لیکر اس نے بس نہ کی بلکہ اس کے لوازم ظاہری بھی مہیا کرنے چاہے وہ "امیر فوج (امپراطور) "مختار مطلق" (ڈکٹیٹر) اور نہ معلوم کیا کیا خطاب و اختیارات حاصل کر چکا تھا لیکن اس کی طفلانہ ... اپنے فوجی لباس میں تاج کا اور اپنے خطابات میں سلطان کا اضافہ کرانے پر مچل گئی اور یہ باتیں نہ صرف امرا بلکہ رومی عوام کو بھی گوارا نہ تھیں۔ چنانچہ اسی اوپرکال کے تہوار کے دن جس کا شکسپیر نے سین دکھایا ہے۔ اس عام ناگواری کا اظہار ہو گیا تھا۔ اس کے خلاف شاعر نے جو کچھ لکھا ہے وہ بروئے تاریخ غلط ہے، البتہ جب اُن امرا نے جو میدان جنگ میں اسے مغلوب نہ کر سکتے تھے، سازش کر کے اسے خاص ایوان مجلس میں قتل کیا تو عوام الناس نہایت رنجیدہ ہوئے کیونکہ سیزر نے حکومت حاصل کرنے کے بعد اُن کے بعض قدیم حقوق بحال کر دیے تھے اور اس کے ذاتی مصالح کا مقتضا ہی یہ تھا کہ امرا کے مقابلے میں عوام الناس کی تالیف قلوب کر کے انھیں اپنا طرفدار بنائے رکھے۔ غرض یہی "عوام کالانعام" تھے جو اس کی نعش دیکھ کر بیتاب ہو گئے اور سیزر کے قاتلوں کو اُن سے بچ کر بھاگنا پڑا، انھیں کے جوش انتقام سے انٹونی نے فائدہ اٹھایا ورنہ درحقیقت وہ سیزر کے قاتلوں سے مصالحت کر چکا تھا اور جب سیزر کے جنازہ پر محض رسمی تقریر کرنے کھڑا ہوا تو لوگوں کو اشتعال دلانے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا مگر جب لوگوں میں سخت ہیجان ہوا...

اس کو فوراً یہ طمع پیدا ہوئی کہ سیزر کے بجائے خود بادشاہی حاصل کرنے کا اس سے بہتر موقع نہ ملے گا۔ کیونکہ سیزر کے قاتلوں کو مغلوب کرنا گویا مجلس اعیان کو دوبارہ مغلوب کرلینا تھا۔ جو اب تک مطلق العنان حکومت کی سنگِ راہ تھی؛

انٹونی کا خیال بالکل صحیح تھا۔ مگر خواہ اس میں بادشاہی کرنے کی قابلیت نہ تھی اس منصبِ جلیل کا اہل دوسرا شخص تھا اور چند سال کی خونریزی کے بعد وہی روما کا پہلا "قیصر" بنا

الا ان الارض للہ یرثہا العباد الصالحون

نالہ تاثیر آشنا ہونے کو ہے

الفت زلف دوتا ہونے کو ہے	سر پہ نازل اک بلا ہونے کو ہے
حسن و آرائش تقاضا سن کا ہے	دو چشم سرمہ سا ہونے کو ہے
اللہ اللہ یہ شباب فتنہ جو	چشم بد دور آج کیا ہونے کو ہے
کہہ رہی ہیں اُن کی آنکھیں برملا	اب قضا کا سامنا ہونے کو ہے
وصل کی رات آپ جاگے بھی تو کیا	جب سحر اے مہ لقا ہونے کو ہے
صحن گلشن سے چلی بادِ بہار	موسم گل اب ہوا ہونے کو ہے
آدم و حوا پہ گذرا جو کبھی	آج پھر وہ ماجرا ہونے کو ہے
اشک شبنم کی طرح آنسو ہیں خشک	نالہ تاثیر آشنا ہونے کو ہے
صبحدم چھایا کچھ اس طرح	دم عنادل کا فنا ہونے کو ہے
پتیاں گرنے لگی ہیں خاک پر	باغ دشتِ کربلا ہونے کو ہے
چاہیے زخم جگر کا اندمال	کچھ سے تدبیر بقا ہونے کو ہے
تا کجا بادہ پرستی اے سفنیر	رند ہر اک، پارسا ہونے کو ہے

کلام اکبر پر ایک نظر

از جناب قمر الدین احمد صاحب بی۔ اے

فاسفہ

فلسفہ ایک یونانی لفظ ہے۔ اس کے پہلے بڑے فلاسفہ کے زمانے ... ت اور دوسرے فلسفوں کے ہاتھ میں پہنچتے رہے ہیں۔ اس لفظ کے معنی ہر شخص اور ہر زمانے کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ اندازاً فلسفی اس شخص کو کہا جس کی نظر حقیقتِ اشیا کی تہ تک پہونچ سکتی ہو ... دنیا کے تمام علوم و فنون سوائے علم ہندسے کے فلسفے میں داخل کر لیا ہے۔ ہمارا مطلب یہاں لفظ فلسفے سے اس حکمت سے ہے جو انسان کو موجوداتِ عالم کی پیچیدہ گتھی کے سلجھانے میں مدد دے۔ جب انسان کائنات کی اشیا پر نظر ڈالتا ہے تو اس کے دل میں خود اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کی اصلیت کیا ہے یہ کیونکر وجود میں آئیں۔ ان میں کوئی باہمی تعلق ہے یا سب بے ربط و بے سلسلہ ہیں اگر ان میں کوئی باہمی رشتہ ہے تو کس قسم کا وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات کا جواب دینا فلسفہ ہے۔

فلسفیوں کا ایک گروہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ہم کو حقائق اشیا کا سچا ادراک ہو سکتا ہے۔ سر ڈبلو ہیملٹن کا قول ہے کہ فطرت خدا کو چھپاتی ہے اور انسان خدا کو دکھاتا ہے مراد یہ کہ نیچر بذات خود خداوند عالم کے نمایاں کرنے سے قاصر ہے اگر انسان اپنی عقل کی مدد سے سلسلۂ علل و معلول پر غور نہ کرے تو رموز ذات باری پردۂ خفا کے باہر آ ہی نہیں سکتے۔ لیکن دوسرے دقیق النظر حکما کا یہ مذہب ہے کہ انسان کو کسی شے کی حقیقت کبھی نہیں معلوم ہو سکتی یوں کہنے کو لوگ سمجھا کریں کہ ہم کائنات کی حقیقت سے واقف ہو گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی شے کی سچی ماہیت

کو پورے طور پر بھی نہیں جان سکتا۔ سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی بھی اسی گروہ کے ہم خیال

ہیں اور بآواز بلند کہتے ہیں کہ "ہم کو کچھ نہیں معلوم"

فلسفہ مذہب کی شان میں اکثر گستاخیاں کرتا رہا ہے لیکن سید صاحب ایسی خود فراموشی کے

روادار نہیں۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب دریائے عشق الٰہی جوش میں آتا ہے تو شرع

کی بندش نہیں مانتا منصور کے منہ سے "انا الحق" اور سرمد کی زبان سے "لا الٰہ" کی شکل میں

ابال بھی پڑتا ہے لیکن ان کے یہاں ؎

عرفان خدا فگن ہے شریعت کی آڑ سے
آتش فشاں زمین دبی ہے پہاڑ سے
(اکبر)

وہ صاف طور پر کہتے ہیں کہ ؎

ہے پاسِ شریعت بھی ہم کو اور عشق کی لہریں بھی دل میں
پابند ہیں ساحل مذہب کے دریا کی طرح سے بہتے ہیں

عقائد حنفیہ کے مطابق پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ خدا کو لاشریک اور عالم الغیب جانتے ہیں ؎

مری ہستی ہے خود شاہد وجودِ ذاتِ باری کی
دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر رد ہو نہیں سکتی

نبی کریم کے سچے اور آخر الزماں رسول ہونے کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کو افضل ترین

موجودات جانتے ہیں ؎

مسلمانوں کو فیض اس بزم سے حاصل نہیں اکبر
کہ جس میں عزتِ نامِ محمد ہو نہیں سکتی

تقدیر اور احکام قضا و قدر کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں ؎

بدن میں روح جب آجاتی ہے دبے گوری رنگت کے
تو بے انگلش پڑھے روٹی بھی مل سکتی ہے بیٹی کو

اس بات پر اُن کا یقین ہی نہیں بلکہ ایمان ہے کہ خدا تمام سببوں کا سبب ہے۔ یونانی حکما کا پہلے خیال تھا کہ کسی شے کے اوپر سے نیچے گرنے کا سبب زمین کا مرکز ہے جو ہر چیز اس مرکز کی طرف کھینچتی ہے۔ بعد کو نیوٹن نے اس خیال سے اختلاف کیا اور کہا کہ ہر جسم میں جذب کی قوت ہے۔ بڑے جسم میں قوتِ جذب زیادہ ہوتی ہے۔ زمین ایک بڑا جسم ہے اس لیے یہ بڑا جسم ہر چھوٹی شے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اب اسپنسر اور عمر خیام کے ہمخیال حکما کہتے ہیں کہ اگر نیوٹن کا یہ خیال صحیح بھی مان لیں تو ہم کو کسی بات کی حقیقت یا ماہیت کیا معلوم ہوئی کیونکہ اس وقفیت کے بعد بھی ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ اس قوتِ جذب کا کیا سبب ہے۔ اس کے جواب میں صرف یہی کہا جاتا ہے کہ ہم نے قوتِ جذب کی وجہ بتا دیا اب یہ خدا جانے کہ کیوں ہے اور کس سبب سے ہے اسی کو سید اکبر حسین صاحب کہتے ہیں کہ انسان کی فہم رسا کسی شے کے خواہ کتنے ہی اسباب یکے بعد دیگرے دریافت کرلے مگر آخری سبب کو خدا کی قدرت پر محمول کرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں سے

ہزار بحثیں ہوں فلسفے کی عیاں بصد آب و تاب تو ہے
ہزار توجیہ کے ہوں دفتر اخیر کیوں کا جواب تو ہے

ان کا تمام کلام اس قسم کے دقیق خیالات اور باریک فلسفیانہ نکات سے پر ہے۔ یاس لکھنوی کی طرح سے ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ مولانا اکبر حسین الہ آبادی کے فلسفے کے سامنے غالب طفلِ مکتب ہیں یا خاقانی زانوئے ادب خم کرتا ہے۔ ہم مولانا کے چند فلسفیانہ خیالات ضروری تنقید کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ پبلک خود فیصلہ کرے کہ سید صاحب موصوف کی پایۂ گی

خیالات تعمق نظر اور جدت بیان کو ایشیائی شاعری بالخصوص اردو شعرا کے کلام کے مقابلے میں کیا رتبہ امتیاز حاصل ہے۔ اُن کے فلسفیانہ اُصول ملاحظہ ہوں:۔

(۱) معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

یعنی بحث مباحثہ اور علوم ظاہری سے انکشاف رموز قدرت نہیں ہو سکتا۔ اگر کچھ اطمینان ہو تو کشف و ریاضت کے ذریعے سے جو قلب کو جلا دے تاکہ اُس میں ادراکات پیدا ہوں۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں

ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

سقراط نے بھی اپنی تمام عمر کی کوششوں کے بعد یہی کہا تھا۔ ؎

تا بدانجا رسید دانش من

کہ بدانم ہمیں کہ نادانم

اس پر لوگوں نے کہا کہ تمہاری محنت صد سالہ پر افسوس ہے کیونکہ اُس کے بعد بھی تم نے وہی کہا جو جہلا پہلے سے کہتے ہیں کہ "خدا کی باتیں خدا ہی جانے" لہذا نتیجہ نہ نکلتا ہے کہ خداوند عالم کو فہم و فراست کی حد میں لانے کے لیے اس دنیا میں جاہل و عالم سب برابر ہیں۔ کہنے لگا نہیں میرا رتبہ جہلا سے بالاتر ہے اس لیے کہ اب مجھے اس ذاتی تجربے سے ایک کافی سبق ہو گیا میں اب جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا اور تم پورے طور پر یہ جانتے کہ تم سب جانتے ہو۔ عمر خیام کہتا ہے

کس را پس پردۂ قضا راہ نہ شد   وز سِرِّ خدا ہیچ کس آگاہ نہ شد

ہر کس بخیالِ خویش چیزی گوید   معلوم نگشت و قصّہ کوتاہ نہ شد

(۲) پلٹیں یہ نگاہیں لالہ طرح خود اپنی مشاہد ہو نہ سکیں

کیا اصل حقیقت ہے میری ادراک کو خود ادراک نہیں

ہم اظہارِ خودی سے ایک دم ساکت نہیں ہوتے

مگر جب غور کرتے ہیں تو خود ثابت نہیں ہوتے

(۳) جلوۂ ارض و سما دکھلا کے تو چپ ہو رہا ہے

لا الہ اور فعل ہوا الله کہہ کے پیمبر بھی چپ

بحث اُس کی ذات میں کیوں کر رہا ہے فلسفی ایسے ایسے چپ ہیں تب یہ ہونا ہے بری چپ

ان دو بڑی مثالوں سے سبق لیکر اگر فلسفی فہم ہے تو آیندہ خاموشی ہی [illegible]

کریگا۔ عرفی بھی یہی کہتا ہے

چنداں کہ دست و پا زدم آشفتہ تر شدم ساکن شدم میانہ دریا کنار نیست

قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی تیرنا نہ جانے اور تیر کر دریا کو عبور کرنا چاہے تو جس قدر کوشش

کریگا اوتنے ہی غوطے کھائیگا۔ اس لیے اگر انسان ضعیف البنیان کو دریائے معرفت پار کرنا

تو تواُسے چاہیئے کہ خیالات کو جنبش نہ دے اپنے کو تختہ بنا کر پانی پر چھوڑ دے لہریں خود ایک

کنارے لگا دیں گی۔

(۴) نہیں ہے خضر کی حاجت جو شوقِ دل محرک ہو

کوئی حامی نہیں میرا تو خیمہ اللہ مالک ہے

صائب کا شعر ہے

دریا ہاں طلب راہبر ننگیست مرا سرپرواز بیاں وکرے نسبت مرا

(۵) کیا ہے جس نے اس عالم کو پیدا اُس کو کیا کہیے

خرد خاموش ہے اور دل یہہ کہتا ہے خدا کہیے

یعنی عقل کی مدد سے خداوند عالم کی حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرنا ایک فضل
بحث ہے۔ یہ عاقلہ بیگم جب خود اپنی ذات کا صحیح تصور اب تک نہ کر سکیں تو اپنے تخلیق
کنندہ کو بھلا کیا سمجھینگے۔ اُس ذات باری کے متعلق عقل وفہم کی ایک نہ سنو۔ جو دل گواہی
دے اُس پر یقین کر لو۔ پھر کہتے ہیں ؎

خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے
خدا کیا ہے۔ خدا ہے اور کیا ہے؟

(۲) ذات باری کا جلوہ ہر ذرہ میں موجود ہے چشم بصیرت چاہیئے:۔

آئیگی تجھ کو نظر صانع عالم کی جھلک
سامنے کچھ نہ رکھ آئینۂ فطرت کو سوا

صائب کہتا ہے

چشم بر صنع الٰہی باز کن لب را بہ بند
بہتر از خواندن بود دیدن خطِ اُستاد را

۲ جمال صورت کا ذرہ ذرہ جمال معنی کا آئینہ ہے
مگر انھیں کو جو دیکھتے ہیں جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

بالکل سچ کہا ہے ؎

دل گواہ است کہ در پردہ دل آرائی ہست
ہستیٔ قطرہ دلیل است کہ دریائے ہست

۳۔ جمال دلکش کا محو ہونا نہیں ہے ہرگز خلاف طاعت
خدا کی قدرت کی قدر کرنا صواب ہے کافری نہیں ہے

زاہد خشک حسن بتاں سے رہیں بد نصیب
آنکھیں خدا نے دی ہیں مگر دیکھتے نہیں (اکبر)

۴۔ اگر دیکھو تو ہر گل ایک دفتر ہے معانی کا

گر سمجھو تو ہر شے بیان راز کرتی ہے

شیخ سعدی کی طرح ایک انگریزی شاعر ورڈسورتھ بھی یہی کہتا ہے کہ خواہ آجکل کی سائنس میرے خیال کی تردید کرے لیکن اس پہ میرا ایمان ہے کہ ہر شے میں فوراً احساس ہے۔ یہ وہ خیال ہے جس کو ڈاکٹر بوس کی سائنس اب عملی طور پر ثابت کرتی ہے کہ نباتات میں جان ہے اور ہر شے کو خوشی اور غم کا ایسا ہی سچا احساس ہوتا ہے جیسا کہ انسان کو۔ کیوں نہ ہو

ہر ذرہ چمکتا ہے انوار الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے (اکبر)

(باقی آیندہ)

ذوق جنوں

بیگانۂ عقل و ہوش ہو جا
دیوانۂ پر خروش ہو جا

آنکھوں میں نہاں ہوں دلکے نالے
مینا مغاں کا جوش ہو جا

ہو خون جگر سے لذت اندوز
اور تارک ناؤ نوش ہو جا

دامن میں سنبھال دلکے ٹکڑے
یعنی کف گل فروش ہو جا

کر تازہ جہاں میں رسم منصور
ہاں دار در سن بدوش ہو جا

ہے ذوق جنوں لطف کا ضامن
حق مشرب و حق نیوش ہو جا

لازم ہے کہا میں سخن نوازی
قربان لب سروش ہو جا

تصویر درد

میں سراپا درد یعنی درد کی تصویر ہوں — عفو رونا ہی جسے وہ عذرِ بے تقصیر ہوں
جس میں استغنائے گویائی ہو وہ تحریر ہوں — دہر کے اوراق میں خونی کفن تحریر ہوں

آسماں کو مجھ سے نفرت اور زمیں کو بیر ہے — میرا کعبہ بھی تو اب کعبہ نہیں ہے دیر ہے
دوسرے الفاظ میں ٹوٹا ہوا ساغر ہوں میں — تیغِ زنگ آلودہ کا بگڑا ہوا جوہر ہوں میں

آسماں کی جو کبھی زینت تھا وہ اختر ہوں میں — آبرو روتی ہے جس گوہر کو وہ گوہر ہوں میں
بڑھ گئی ہے بوئے گل سے بھی پریشانی مری — کب سما سکتی ہے آئینے میں حیرانی مری

حسرتوں کی پوٹ ہے پہلو میں میرے دل نہیں — جس کو اطمینان کہتے ہیں مجھے حاصل نہیں
شمعِ کشتہ کی طرح میں دخورِ محفل نہیں — ہستیاں مجھ سی بھی دنیا میں کسی قابل نہیں

ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو گر کے وہ پیمانہ ہوں — یعنی ماضی کی حقیقت حال کا افسانہ ہوں
سرگذشتِ شاخِ گل بالکل ہے میری داستاں — اس لیے اس کی زبانِ حال ہے مجھ نوحہ خواں

میں سمجھتا تھا بہار اپنی بہارِ جاوداں — تھیں خزاں کو موت کا پیغام میری شوخیاں
میری ہر ہر شاخ پر سو سو گلِ صد برگ تھا — میرا پتہ پتہ اشکِ سبزۂ گل مرگ تھا

فخرِ گلشن تھیں مرے ہر گل کی عنبر بیزیاں — تھیں حریفِ دستِ گلچیں خارِ نو کی تیزیاں
غنچے پہلو میں لیے تھے ولولہ انگیزیاں — یاد ہیں وقتِ سحر شبنم کی گوہر ریزیاں

ایک مرجھاتا تھا دل کھلتے تھے اس اک کی جگہ — اس قدر نعم البدل ملتے تھے اس اک کی جگہ
سروِ آزاد چمن تھا اور نرگس رانی مری — کرتی تھی بادِ صبا گہوارہ جنبانی مری

عندلیبِ زار تھی ہر وقت دیوانی مری — چومتے تھے خوش جبیں آ آ کے پیشانی مری
موسمِ گل کا گذرنا تھا کہ آفت آ گئی — گل تو گل میری کلی تک بن کھلے مرجھا گئی

پھول اب بھی ہیں مگر سیرت نہیں صورت نہیں — ان کی اگلی سی نہیں بو باس اور نکہت نہیں
کثرتِ گل ہے جو تھی وہ شان وہ شوکت نہیں — بلبلوں کو بھی تو مجھ سے آج کل الفت نہیں

متنفر ہیں آج کل جو میرے غمخوار ہیں — منحرف ہیں آج کل مجھ پر نثاروں جو تھے

نسوانی چولی اور اُردو کا دامن

از جناب مریم احمد عارف بسام صاحبہ

فلک کی کج ادائی کا کریں کیا ہم گلہ شکوہ
کہ اپنے دست و بازو ہم پہ کیا کم قہر ڈھاتے ہیں

زبان اردو کی تاریخ کوئی ولی دکنی سے شروع کرتا ہے کوئی خسرو کے سر اس کی ابتدا کا سہرا رکھتا ہے کوئی ان سے بھی پہلے جاتا ہے۔ عام لوگ صرف اتنا جانتے یا کہا کرتے ہیں کہ شاہجہاں کے زمانے میں لشکریوں کے بازار میں ایک زبان پیدا ہوئی جس کا نام اردو پڑا (کیونکہ اردو ترکی میں لشکر کو کہتے ہیں) اور جس نے آہستہ آہستہ دیار ہند کی علمی اور قومی زبان بننے کی صلاحیت اپنے میں پیدا کرنا شروع کی۔ اس کی مقبولیت اور خوش آیند بھولی بھولی شکل دیکھ کر ملک کے سپوت نے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم اسے اپنی آغوش عاطفت و محبت میں بڑے لاڈ و پیار سے پالنا شروع کیا۔

المختصر قوم ہنود اور فرقۂ مسلم کی اس متفقہ کوشش نے اپنی چاشنی اور شیرینی سے کس قدر وقار اور ہر دلعزیزی حاصل کی اور کس درجہ امتیاز کو پہونچی اُس سے مجھے بحث نہیں۔ مدعائے تحریر یہ ہے کہ اپنی قوم و ملت کے اُردو تذکرہ نویسوں کو اور اُن بزرگانِ ملک و ملت کو جنھیں زبان اردو کی تاریخ سے خاص دلچسپی ہے مخاطب کر کے پوچھوں کہ انھوں نے اردو کے شاعروں اور اردو کے ادیبوں کی تذکرہ نویسی اور واقعاتِ زندگی لکھتے کے وقت کبھی ایک لمحہ کے لیے یہ بھی سوچا ہے کہ اردو کی رفتار ترقی میں اردو کو پروان چڑھانے میں طبقۂ نسواں کا بھی کچھ حصہ رہا ہے یا سراسر طبقۂ ذکور ہی کا۔ لکھنؤ میں کلکتہ میں دہلی میں علی گڈھ اور نہ جانے کہاں کہاں جلسے ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی اسپیچیں ہوتی ہیں بی اے بھی

تقریریں کی جاتی ہیں۔ طول طویل خطبے پڑھے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ کہیں بھی کسی نے صنف نازک کی چولی اردو کے دامن سے باندھی ہے؟ یا بندھی ہوئی گرہ کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر کسی صاحب قلم نے ضمناً یا مضمون کی روانی میں "قلعہ معلیٰ کی بیگمات" یا اودھ اور فیض آباد کی "امیر بیگم اور بہو بیگم" . . . . . . کا کچھ حال لکھ دیا تو وہ یا بطور سرپرستی کے ذوق ادب کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ یا اگر کسی کی بابتہ شتے نمونہ از خروارے پر عمل کر کے کچھ کہیں لکھا بھی گیا ہے تو اس کی ہستی عدم سے بدتر ہے۔ یہ کہیں بھی نہیں دکھائی دیتا کہ طبقۂ اناث کی اُن قابلِ پرستش ذاتوں کے تذکرے بھی تفصیل کے ساتھ ہوں جن کو ادب میں مذاقِ سلیم رہا ہو۔ جن کے تخیلات اور جذبات نے موزونی کلام میں خوبی پیدا کی ہو یا جن کی ادب نوازی کچھ اہمیت رکھتی ہو بہت کم کتابیں آپ نے دیکھی ہونگی جن کا تعلق زبان اردو کی تاریخ یا بحث سے ہو۔ یا جس میں زبان اردو کے شعرا کا تذکرہ ہو اُن کے حالات ہوں ان کے کلام کے انتخابات درج ہوں اور جن میں قلعۂ معلیٰ کا مبارک ذکر نہ آیا ہو زبان بنی کہاں؟ قلعہ معلےٰ میں۔ اردو منجھی کہاں؟ قلعۂ معلےٰ میں۔ ٹکسالی مانی کہاں گئی؟ قلعۂ معلےٰ کی (قلعۂ معلےٰ میں رہتا کون تھا۔؟ بیگمات ہی تو تھیں) اس میں شیرینی کس نے بھری؟ صنف نازک نے۔ اس میں اس قدر چاشنی کہاں سے آئی؟ طبقۃ النسواں کی روز مرّہ سے شستگی کس نے پیدا کی؟ گروہ اناث نے غرضکہ اس کی جس ادا کو لیجیئے اُس میں بانکپن پیدا کرنا جس قدر بیگمات کے حصے میں آیا، شاہوں اور نوابوں کے حصے میں نہ آیا ہوگا۔

میں مانتی ہوں کہ جس مرکز کی طرف ناظرین کو میں لے جانا چاہتی ہوں اور جن دلیلوں سے اپنا مرکوز خاطر مطلب دکھانا چاہتی ہوں۔ انھیں یہ سیدھے سادے دعوے اور یہ مذکورۂ بالا سیدھی سادی باتیں زیادہ مضبوط نہیں بنا سکتی ہیں لیکن ان سے اتنا ضرور ہوگا کہ بہت سے حضرات کے

سکان نکل جائیں گے کہ اردو کو پروان چڑھانے میں جہاں مردوں کا ہاتھ رہا ہو وہاں عورتوں کا ہاتھ بھی ضرور رہا ہے۔ اگر باہر کے نکلنے بیٹھنے والے مردوں کو کافی موقعہ اس کا ملا کہ وہ اپنی دماغی قوتوں کو، اپنے تخیلات کو، اپنے جذبات کو، اپنے زور قلم کو آزادی کے ساتھ منظرِ عام میں لاتے رہے ہیں تو جب سے سرزمین ہند پار دو نے اپنی تخلیق جانا شروع کی ہیں ضرور ہے کہ ان محفلوں میں کنج قفس جب رہنے والی بلبلوں نے بھی کچھ آواز بلند کی ہونگی۔ اگر آوازیں بلند نہ کی ہونگی تو انھوں نے کم سے کم اپنی نجع گذ نہایت ٹھیں اور سرلی آواز پروں کو قفس کے اندر جھاڑ کر خواہ دھیمی ہی کیوں نہ پیدا کی ہونگی۔ ان ہی کی کیا جنتے کی ند۔ اور ضروری ہے۔

آج ہر علم کی ہر شاخ کی چھوٹی سے چھوٹی ٹہنیاں اور پتیاں اکٹھی کی جاتی ہیں علم اللسان والے زبان کی پیدائش اس کی ترقی و تنزلی کی کھوج میں ہیں۔ ان ہی میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو صرف اس کے زمانہ پیدائش کی کھوج میں لگے ہیں۔ کچھ لوگ عروج اور حالت شباب کی زمانت میں، سرگرداں ہیں۔ کچھ اس زبان کے گوناگوں شعرا اور ادبا کے سوانح جمع کر رہے ہیں۔ زبان اردو پر بھی کوششیں ہو رہی ہیں مختلف پہلو سے اس پر بھی ملک کے گذشتہ اور موجودہ ماہرین زبان اردو نے بہت کچھ لکھ ڈالا ہے دہلی کا ایک انشا پرداز ہو خواہ لاہور کا ایک پروفیسر لکھنو کا ایک ادب نواز ہو خواہ عظیم آباد کا مضمون نگار عالی گہر غرضکہ اردو شعرا کا تذکرہ لکھنے والا خواہ پرانے رنگ ڈھنگ کے اسکول کا پڑھا ہوا پایا جائے اور انگریزی والا عالم اکمل ہو خواہ طرز جدید کا تعلیم یافتہ بوٹ سوٹ والا ماسٹر کوئی ہو۔ اضلاع ہند میں سے کسی ضلع کا ہو جب کبھی کسی نے اردو شعرا کی لائف لکھنے کو قلم اٹھایا ہے تو اس نے صرف ایک حصہ ملک کے شعرا کا تذکرہ اور ان کے سوانح لکھ کر قلم نہیں روک لیا ہے بلکہ اپنے تذکرے کو مکمل بنانے کے لیے

اس نے پوری طرح چھان بین کر کے ہر صوبے ہر ضلع ہر شہر بلکہ ہر قصبے اور ہر قریہ اور زمانہ قدیم سے لیکر آج تک کے شعرا کے حالات و واقعات زندگی جمع کیے ہیں اور انھیں اپنی کتاب میں نمو جگہ دی ہو لیکن میں نہیں سمجھ سکتی کہ ان کی حمیت نے کیونکر گوارا کیا کہ ان کے پہلو بہ پہلو چلنے والی صنف نازک کیوں اپنے حقوق ناموری سے محروم رکھی جائیں اردو کی ابتدائی زندگی کو چھوڑیے میں پوچھتی ہوں کہ کیا زمانہ شاہجہاں سے آج تک ایسی عورتیں نہیں ہوئی ہیں جن کے کلام کا ذکر یا جن کے ادبی نکات کا تذکرہ اُن تذکروں میں درج فرمایا جاتا۔ [illegible] کیا [illegible] اردو میں نے ختم [illegible] اردو خوانوں کو [illegible] جاوید بنایا جا — لیکن اس زمانہ [illegible] پیدا کرنے کے [illegible] اردو کے [illegible] صنف نازک کے [illegible] ہوئے ہاتھوں کو ایک جام بھی بخشا جائے

۱۹۱۱ء میں لکھنو میں جلسہ منعقد ہوئی تو ہر زمانے کے شاعروں کی چٹکیاں گدگدیاں دکھائی جاتی ہیں کہ کوئی شاعرہ یا کوئی ادب نواز بیگم صاحبہ کی زندہ دلی داستان اردو کی تاریخ میں نہیں دکھائی دیتی۔

سال میں ایک محفل عجلت میں قرار پائی۔ بھلا جہاں مہینوں پہلے سے سامان آرائش ہو وہاں آرائش والیاں بھلا دی جائیں تو اس عجلت میں ماکیاں راکہ می پرسد۔

اس سمع خراشی سے مجھے یہ نتیجہ نکالنا ہو کہ جس طرح مردوں کے سوانح لکھے گئے ہیں، تذکرے رقم ہوئے ہیں واقعات اور حالات زندگی قلمبند ہوئے ہیں کیا وجہ ہو کہ عورتوں کو بھی خصوصیت کے ساتھ پوری تحقیق اور تدقیق کے بعد علیحدہ رقم نہ ہوں۔ اگر علیحدہ نہ ہو سکیں اور ہمعصری کا لحاظ رکھا جائے یعنی ہمعصر شعراء سے ادب نوازوں کے کلاموں سے موازنہ کرنا منظور ہو تو پہلو بہ پہلو ہی سہی مگر ہو ضرور۔ اور آج اردو کے سرپرستوں سے عموماً اور ان حضرات

سے خصوصاً جو اب سے تذکرہ لکھیں میری یہ درخواست ہے کہ اس بات کو ضرور ملحوظِ خاطر رکھیں کہ وہ لازمی طور سے دکھا دیں کہ اردو کا طبقۂ نسواں سے کیا تعلق رہا ہے ورنہ اردو کی تاریخ میں ایک بہت بڑی کمی رہ جائے گی جس کی تلافی بعد کو مشکل ہوگی۔

کاش دربارِ ادب میں صدقۂ حضرتِ بتول
میری آئیں ہوں رسا میری دعا ہو مقبول

تصویرِ جذبات

اے سوزِ عشقِ پنہاں اب قصہ مختصر ہے — اکسیر ہو چلا ہوں اک آنچ کی کسر ہے
تیغوں کی دھار پر ہوں کورانہ راہ چلنا — یہ جادۂ وفا ہے اے دل یہاں خطر ہے
غیرت کی بات ہے یہ تیرا مریضِ الفت — منت کشِ دوا ہو محتاجِ چارہ گر ہے
بے مایہ اس سے ہوتا اے کاش دل ہمارا — ہر نالہ نارسا ہے ہر آہ بے اثر ہے
معلوم ہو چکا ہے دنیا کا راز پھر بھی — ہم ہیں کہ مستِ غفلت دل ہے کہ بے خبر ہے
ہے دل میں اک تمنا کہنا ہے جو تمہیں سے — سن لو مری زبانی اب وقت مختصر ہے
دنیا کی عمر ہی کیا گھبرائیں کس لیے ہم — یہ داستانِ ہستی دم بھر میں ختم پر ہے

اللہ رے ناشناسی اس دورِ بے وفا کی
میت عزیز میری محتاجِ نوحہ گر ہے

گرامی نامہ جناب پروفیسر نواب علی صاحب ایم اے

مکرمی السلام علیکم ۔ نقیب نے اپنے دلوں میں ایسی زندہ دلی کا ثبوت دیا کہ اب مجھ کو بھی مجبور ہو کر کچھ بھیجنا پڑا ۔ چند اشعار حاضر ہیں

(۱)

قید غم سے کوئی اس دہر میں آزاد نہیں
تیرے عاشق کے سوا اور کوئی شاد نہیں

مدعی سب ہیں مگر کوئی بھی مجنوں نکلا
آج تک نجد بیابان ترا آباد نہیں

بے قرار اتنے ہیں شیریں کے بھی ہزاروں عاشق
سب ہیں القصہ مگر ایک بھی فرہاد نہیں

فصلِ گل اور قفس - خیر نہیں غم کچھ بھی
نالہ پابند اسیری کبھی صیاد نہیں

غُل ہے دنیا میں نہ اب ہوگی کبھی جنگ و جدال
چپ ہیں عشاق کہ راضی ستم ایجاد نہیں

کشورِ حسن نہ جمہوریہ ہو جائے کہیں
تو جو عشاق کی سنتا کبھی فریاد نہیں

چرخ کے جور سے تو آب نہ تڑپیں کیونکر
دل ہیں کنکر نہیں - پتھر نہیں فولاد نہیں

اِنشاپردازی

پر

جرمنی ادیب و فلسفی "شوفن ہو" کے خیالات

از

جناب مولوی مسعود علی صاحب وارثی اسسٹنٹ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات

انشا پردازی کیا ہی؟ دماغ کی تشریح ہی! جس طرح صورت دیکھنے سے انسان کے اخلاق اور عادات کا پتہ چلتا ہی- اسی طرح تحریر بھی آدمی کے دماغی کیفیات دکھانے میں قیافہ کے کرشموں سے کہیں زیادہ فوقیت رکھتی ہی- کسی دوسرے شخص کی عبارت کا رنگ اُڑا لینے کے بالکل وہی معنے ہیں جو ایک نقاب پوش چہرے کے سچ تو یہ ہی نقل اصل نہیں ہو سکتی اور دونوں میں بہت بڑا فرق ہی اسی وجہ سی یہ کہا جاتا ہی کہ کچھ عرصے کے بعد پڑھنے والے ایسی عبارت سے یقیناً اُکتا جائینگے- اور اُس کو چشمِ حقارت سے دیکھنے لگینگے- حقیقتہً کسی کی انشا پردازی کی تقلید ایک فعلِ عبث ہی کیونکہ کسی مکروہ سے مکروہ صورت کو لے لیجیے اور دیکھیے تو وہ بھی نقلی اور مصنوعی صورت سے بدرجہا اچھی ہوگی- اس لیے کہ اُس میں ایک بات ہی "وہ نیچرل ہی" اس میں اصلیت پائی جاتی ہی!!-

جو حضرات متقدمین اور اعلیٰ درجے کے انشا پردازوں کی نقل کرنا چاہتے ہیں اُن کی نسبت ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی اور بھیس میں ہیں- گویا بھیڑیے نے شیر کی کھال پہن لی ہی- اس میں کلام نہیں کہ ایسے انشا پردازوں کی تحریر ناظرین پڑھتے اور سنتے ضرور ہیں لیکن

بھی کرتے [illegible] وہ اس سے مصنف کی اصلی دماغی کیفیت کا بھی پتہ چلا لیتے ہیں۔ اور اس کا رنگ
دیکھ لیتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ انشا پردازی میں تصنع سے کام لینا گویا منہ چڑھانا ہے۔

جب کوئی شخص کسی زبان میں کچھ لکھتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے ملک اور قوم کی دماغی حالت کی تصویر کھینچتا ہے اور مختلف اقوام اور مختلف زبانوں میں امتیاز کرنے کے لیے [illegible] فرق ہوتا ہے۔ مگر کسی کی تصانیف کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے [illegible] عنوان پر مصنف نے دماغ سوزی کر کے اس کے متعلق کچھ بیان کیا ہے [illegible] حاصل کیا جائے۔ ورنہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کسی محنت اور مشقت کو [illegible] اس کی تمام تصانیف پڑھی ہی جائیں۔

انشا [illegible] کے لیے سب سے بڑی بات غور کرنے اور سمجھنے کی یہ ہے کہ مصنف نے کس حد تک غور و فکر سے کام لیا ہے۔ مگر یہ بات کہ اس کے دماغ کی عام خوبی اور اس کا اصلی رنگ کیا ہے۔ اندازہ [illegible] لگایا جاسکے گا۔ لیکن انشا پردازی کسی شخص کے خیالات کی اصلی فطرت پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ وہ اصلی فطرت اور حقیقت ہوتی ہے جس میں کسی قسم کا تغیر یا انقلاب قطعی ناممکن ہے۔ انشا پردازی کا مضمون یا اس کے خیالات کسی نوعیت کے ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اس کی تحریر اس کے دماغ کی اصلی کیفیت کی ضرور شاہد ہوتی ہے۔ کسی نے یولن سپیگل سے پوچھا کہ فلاں گاؤں تک جانے میں کتنی دیر لگے گی تو اس نے جواب دیا کہ پہلے چل کر دکھاؤ، جس طرح وہ اس کی رفتار کا اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ دریافت کرنے والا اس قدر مسافت کتنی دیر میں طے کریگا۔ اسی طرح ہم بھی کسی کتاب کے چند صفحات پڑھنے کے بعد یہ امر بخوبی محسوس کر سکتے ہیں کہ اس کا مصنف اپنی دلچسپ عبارت سے ہم کو کہاں تک لے جا

سے

ہر اوسط درجے کا لکھنے والا اپنے خاص اور قدرتی طرز تحریر پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے
کیونکہ اس کے دماغ میں دوسرے مصنفین کی عبارات کے خط و خال دیکھ کر اس کا دل چاہتا ہے
کہ وہ بھی رنگ آمیزی سے کام لے۔ ورنہ صاف عبارت لکھنے کو جی چراتا ہے۔ صفائی اور سادگی صرف
اُسی شخص کی تحریر میں آسکتی ہے جس کو اپنی قابلیت اور اعلیٰ دماغی کا احساس اور اعتبار کلی ہو۔ میرا مقصد
اس سے یہ ہے کہ آج کل کے عام انشا پرداز اپنے خیالات کو صاف صاف نہیں اور اچھی طرح ادا نہیں
کر سکتے۔ وہ ایک بات کو جس طرح سمجھتے ہیں اس کا اظہار اس طرح نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے
اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہماری تصنیف بالکل عامیانہ اور لغو ثابت
ہوگی مانا کہ اُن کا خیال صحیح ہے لیکن اگر وہ صفائی اور سادگی اختیار کریں تو اس کی ضرور قدر و قیمت
ہوگی اور اگر لکھنے والے ایمان داری کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کر دیا کریں جس طرح خود
انھوں نے اس مضمون کو سوچا ہے تو اُن کی تحریریں نہ صرف پڑھنے کے لائق ہونگی بلکہ مفید ہونگی
لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات قارئین کو اس امر کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اُن کی فکر نہایت عمیق
اور اُن کے خیالات بہت وسیع ہیں۔ حالانکہ یہ محض اُن کا خیال ہے اسی لیے جب اُن کو کچھ کہنا یا
لکھنا ہوتا ہے تو اُس کو بڑے بڑے جملوں میں اور توڑ مروڑ کر ایک خاص انداز سے ادا کرتے ہیں۔
جس سے عبارت بے ربط ہو جاتی ہے اور طبیعت کے اصلی رنگ پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ یہ حضرات
الفاظ کو نئے نئے قالب میں ڈھالتے ہیں اور مطالب کو عجیب طریقوں سے پیچ دے دے کر
ادا کرتے ہیں خواہ اُن کا طرز بیان ادائے مطالب میں کامیاب ہو یا نہ ہو لیکن سمجھتے یہ ہیں کہ اُن کی
تحریر قابلیت کا پیرایہ اور بلاغت کا پہلو لیے ہوئے ہے وہ لوگوں کے دلوں پر یہ نقش بٹھانا چاہتے ہیں
کہ جو کچھ اُن کی نظر کے سامنے ہے وہ اُن کی تحریر اس سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے وہ اپنے خیالات کو ٹکڑے
ٹکڑے کر کے چھوٹے اور شستہ جملوں میں ادا کرنے کی سعی اور عبارت آرائی کی کوشش کرتے ہیں۔

بعض کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ انھیں بیان کرنا ہے اس سے ان کی تحریر زیادہ بلند مرتبہ رکھتی ہے
یعنی وہ موٹے موٹے الفاظ کی بھرمار کر کے عبارت میں "غرابت" اور "ثقالت" پیدا کر دیتے
ہیں جس سے کہ پڑھنے سے جی گھبراتا ہے اور پڑھنے والا لا کہ طبیعت پر زور دیتا ہے مگر مطلب میں
نہیں آتا۔ کوئی صاحب کسی خاص رنگ کو اختیار کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ یہ عبارت اعلیٰ درجے
کی بلیغ اور نہایت ہی جامع و پر مغز ہے مگر پڑھنے والے بیچارے کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ پیچیدہ
مطالب کی رسی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانا چاہتا ہے۔ مگر اس کے سرے کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کیونکہ
فی الحقیقت عبارت بے ربط اور کلام مہمل ہوتا ہے۔ بعض اصحاب اس امر کی کوشش کرتے ہیں۔
کہ ان کی تحریر نہایت فصیح و بلیغ اور ان کا خیال زبردست و فلسفیانہ معلوم ہو لیکن جب پڑھیئے تو
معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجذوب کی ایک بڑ ہے جس کا سر نہ پاؤں، نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کا منشا کیا ہے
اور آپ فرماتے کیا ہیں۔ لفظ کے لفظ اور جملوں کے جملے بالکل بے معنے ہوتے ہیں جن کا
کوئی مطلب ہی نہیں۔ مگر لکھنے والا یہ ضرور سمجھ لیتا ہے کہ پڑھنے والا اس کا کچھ نہ کچھ مطلب سمجھ ہی لیگا
اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بجائے اظہار خیالات کے الفاظ فروشی کرتے ہیں اور اپنی اس
تجارت کو نئے نئے انداز سے رونق دیتے ہیں۔ غریب و مہمل الفاظ، نئی نئی تراش خراش کے
فقرے، جدید الفاظ یا الفاظ کے نئے معنے لا کر اپنی ذہانت اور جدت آفرینی کا ثبوت دیتے ہیں
پھر یہ امر بھی لطف سے خالی نہیں کہ ایسے حضرات پہلے ایک رنگ اختیار کرتے ہیں اور جب وہ
پھیکا پڑ جاتا ہے تو قابلیت اور جدت آفرینی کا دوسرا نقاب بدلا جاتا ہے۔ جو کچھ دنوں تک تو ناتجربہ کار
اور خام طبع لوگوں کے لیے نظر فریب ہے بعد کو اس کا بھی رنگ اڑ جاتا ہے اور پردہ فاش ہو جاتا ہے اور
پھر وہی لوگ جو پہلے مداح ہوتے ہیں مضحکہ اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش،   من انداز قدت را مے شناسم

کبھی تو ایسے حضرات کی تحریر میں ایک طرح کا متوالا پن ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ایک صفحے یا دوسرے صفحے پر پہنچنے میں معلوم کرتا ہے کہ عبارت میں قیامت کا زور ہے اور مصنف بلا کی قابلیت رکھتا ہے اور کبھی موٹے موٹے الفاظ بھاری بھاری پتھروں کی طرح برستے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی کسی طریقے سے مرعوب کیا جاتا ہے اور کبھی کسی رنگ سے قابلیت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان سب نقابوں میں سب سے بڑی اور دبیز نقاب اُس عبارت کی ہوتی ہے جس کا کچھ مطلب ہی سمجھ میں نہ آئے اور اکثر یہی نقاب کارگر بھی ثابت ہوتی ہے۔ اور ایسی مہمل عبارت کا لکھنا بھی نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے سب سے زیادہ اہم اور مشکل یہ امر ہے کہ دقیق سے دقیق اور سخت سے سخت مضامین کو اس صفائی و سادگی سے ادا کیا جائے کہ اُس کا مطلب ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آجائے۔

اگر فی الواقع مصنف کے دل و دماغ میں کچھ قوت ہے تو اُس کے سامنے انشا پردازی کے یہ تمام موانع اور عیوب ہیچ اور بالکل بے کار ہیں۔ صرف ایک صفائی اور سلاست وہ چیز ہے جو مصنف کے جوہر قابلیت کو ظاہر کرتی ہے اور ایسے مصنف پر ”ہوریس“ کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ ”اصلی انشا پردازی کا سرچشمہ اور منبع عقل و ذوق سلیم ہے“۔

ایسے تمام لکھنے والوں کی حالت اُن کیمیاگروں کی سی ہے جو مختلف دھاتوں کو ترکیب دے کر سونا بنانا چاہتے ہیں۔ اور سونا وہ چیز ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ ایسی ہی تحریر دیکھ کر یہ تمیز ہوتی ہے کہ کھرا کھرا ہی ہے اور کھوٹا کھوٹا۔

مصنف کو اپنی قابلیت اور ذہانت زیادہ نمایاں کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے پڑھنے والے کی نگاہ میں اس کی وقعت نہیں رہتی۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس شخص کے دماغ میں شے لطیف کا حصہ بہت کم ہے۔ تصنع سے ہمیشہ مصنف کی خامی اور کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔

مصنف کو اپنا خاص رنگ کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب تک طبیعت کو معین ومدگار نہ بنایا جائے، اثر پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہمیشہ یہی دیکھا گیا ہے کہ اعلیٰ درجے کے تمام انشا پرداز اپنے خیالات بیحد صفائی، اختصار، جامعیت، وضاحت، سلاست اور صحت سے ادا کرتے ہیں۔ اور سادگی کو نہ صرف سچائی بلکہ عقل و دانش کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ طرز تحریر حسنِ خیالات پر مبنی ہے لیکن جو لوگ خود نما اور بدمغ ہیں، ان کے خیالات کے مطابق انشا پردازی محض لفاظی کا نام ہے جسکو پاکیزہ خیالات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ دراصل انشا پردازی خیالات کا جوہر ہے اور دماغی افلاس یا قلت فراست اس کے دشمن ہیں۔

جب کسی مصنف کی تحریر سے یہ معلوم ہو کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت ضروری ہے۔ اور سامعین یا ناظرین کے دل پر اثر کرنے والا ہے۔ تو کہا جائیگا کہ وہ ایک عمدہ انشا پرداز ہے۔

فلسفیانہ تحریر میں اس قاعدے سے انحراف کرنا ایک اصولی چال ہے۔ اور اسی طرح اُن تحریروں میں بھی جن سے دماغی طاقت اور زور تخیل کا اندازہ ہو سکے اسی پر عملدرآمد ہوتا ہے۔ اس قسم کی تمام تحریروں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ کہا تو بہت کچھ گیا ہے لیکن غور کیجیے تو کچھ بھی نہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ آجکل علی العموم بڑے بڑے انشا پرداز اس بلا میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کی انشا پردازی کا یہ انداز ہے کہ ایک ایک جملے کے دو دو معنے نکلتے ہیں۔ عبارت دقیق ہوتی ہے جس میں الفاظی غرابت اور بھی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خیالات کی کمی کو فضول بکواس سے پورا کیا جاتا ہے جو ہر وقت پن چکی کی طرح چلتے رہنے سے دیکھنے والے کو گھبرا دیتی ہے۔ صفحے کے صفحے دیکھنے پر بھی کوئی خیال ایسا نہیں ملتا جو پوری طرح اور وضاحت کے ساتھ ادا کیا گیا ہو۔ ایسی عبارت کے پڑھنے والے بھی عجیب انداز کے ہوتے ہیں کہ وہ ورق کے ورق چٹ کر جاتے ہیں مگر کبھی یہ خیال نہیں کرتے کہ آخر اس سے مصنف کا منشا کیا ہے۔ ان کی سطحی نظر کے سامنے جو کچھ ہوتا ہے اسی کو کافی

سمجھتے ہیں گویا وہ سمجھتے ہی نہیں کہ لکھنے والا محض انشا پردازی کے شوق میں خامہ فرسائی کر رہا ہے جس کا مطلب کچھ بھی نہیں ایسے حضرات چونکہ کمزور خیالات کے ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنے مافی الضمیر کو پوری طرح ادا نہیں کرتے۔ تاکہ اس میں اگر کوئی نقص ہو تو پڑھنے والے کو اس کا کچھ پتہ ہی نہ چلے

اب ایک اچھے مصنف کو دیکھیے وہ اپنے نتیجہ خیز خیالات سے بہت جلد ناظرین کو مسخر کر لیتا ہے۔ وہ ایک بات کہتا ہے اور سمجھدار پڑھنے والا اوس کو غور و خوض سے دیکھتا ہے ایسا مصنف نہایت ہی سادگی اور بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ ناظرین کے دل میں بھی ہو بہو وہی خیال پیدا ہو جو میرے دل میں ہوا ہے ایسے انشا پردازوں کی تحریر روز روشن کی طرح ہوتی ہے جس سے ہر کس و ناکس مستفیض ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ہر ایک ہوشمند انشا پرداز ہمیشہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن سے قطعی طور پر مطلب کا انکشاف ہو جائے۔ ایسے لکھنے والے لکھتے نہیں بلکہ اپنے ناظرین سے باتیں کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے خیالات ناظرین کے دلوں میں جاگزیں ہو جائیں اور اُن کو پڑھنے میں دلچسپی ہو۔ ایسے مصنف اپنی تصانیف میں الفاظ کا استعمال بہت سمجھ بوجھ کر کرتے ہیں۔ ان کا لفظ لفظ، فقرہ فقرہ بامعنے ہوتا ہے اور جس طرح ایک اعلیٰ موسیقی داں "کمال احتیاط سے اصول موسیقی اور تال سُر کو ہمیشہ پیش نظر نظر رکھتا ہے۔ اسی طرح ایک اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز اپنے پاکیزہ خیال کے ادا کرنے میں موثر اور عام فہم الفاظ سے گریز نہیں کرتا۔

بہت کم ایسے مصنف ہیں جو کسی کتاب کے تحریر کرنے سے پہلے مکان تعمیر کرنے والے کی طرح اپنی تخیل کا ایک نقشہ ایسا تیار کرلیں جس پر تمام تر تعمیر کا انحصار ہو اور جس میں اس کا ہر ایک چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی دکھا دیا گیا ہو۔

آج کل کے مصنفین کی حالت ان چند لڑکوں کی طرح ہے جن کے سامنے بساطِ شطرنج بچھی ہو اور اس پر وہ مہرے نو ترتیب کے ساتھ جماتے ہیں۔ مگر ایک آدھ ہی مہرہ حسنِ اتفاق سے صحیح چال پر ہوتا ہے۔ بعینہٖ یہی شان ان کے جملوں اور فقروں کی ہے کہ شکوہِ الفاظ اور تصنع تو زیادہ مگر اصلی حالت کی جھلک بہت کم بلکہ ندارد بہت سے حضرات تو اس گر سے بھی واقف نہیں ہوتے اور ان کی اکثر تحریریں لایعنی اور سطحی ہوتی ہیں۔

غزل کی شاعری کا جواب[1]

جناب آملیر بدایونی سے خطاب

شاعر جو آپ سا ہو لکھنے والا — کوئی اُسے کس نے کہے کیا لکھیے

جو نام کو بھی کسی سے حل ہو نہ سکے — کس کام کا ہے اگر معمّا لکھیے

ٹھمری ٹپے کا کس کو آئے گا خیال — مطرب بھی ہو مست وہ ترانہ لکھیے

اشعار ہوں نعت کے تو سبحان اللہ — یا مدح میں پنجتن کے خمسا لکھیے

جب قصۂ عمر ایک کہانی ٹھہرا — پیری و شباب کا ڈراما لکھیے

مانا کہ لسان عصر اک اور ہی — اکبر کے رنگ میں قصیدا لکھیے

چاہیں گے جو لفت ایک پیسہ ہے محال — مدح صوفی کی ہجو ملّا لکھیے

دل کش اشعار میر و غالب پڑھیے — کیا عرض کروں غزل میں کیا کیا لکھیے

ہو رنگِ مجاز میں حقیقت روپوش — ایسے معشوق کا سراپا لکھیے

تشبیہ میں گیسوؤں کی اُلجھن کیسی؟ — طولِ شبِ ہجر و شامِ یلدا لکھیے

[1] جنابِ ممدوح دام مجدہٗ کی نظم مطبوعہ نقیب جلد ۲ نمبر ۱ ماہ اگست صفحہ ۵ کو پیشِ نظر رکھ کر یہ نظم ملاحظہ کی جائے تو ناظرین لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر بیت کے بالمقابل ابیات بالا پڑھ لیے جائیں۔ تو ردیف و قوافی کے باہم دست و گریباں ہونے کا مزہ بھی آئے گا۔

مشک ختنی اُنھیں جو کہتا ہے خطا — مجنوں نہ کہے گا کوئی لیلا لکھیے
مضمون کمر کی ہے جو منزل باریک — اقلیم عدم کا اُس کو رستا لکھیے
معدوم بھی ہیں ایک وہی ہے موجود — مضمون وجود یا عدم کا لکھیے
تہذیب نہ دے سکے اجازت جس کی — مصرع کیوں بے حجاب ایسا لکھیے
پردہ نہ کھُلے حیا کا [illegible] — بے ربط نہوں وہ نام اعضا لکھیے
چشم و ابرو کو کیا بتاؤں قبلہ — اِس کو محراب اُس کو کعبہ لکھیے
نشتر کی خلش ہی جب نہیں ہے دل میں — جاروب مژہ کو نہ نشتر کا لکھیے
بلبل کیا اب چمن میں وہ گل ہی نہیں — پھولوں سے بھی ہے کھٹک تو کانٹا لکھیے
گلچیں کے ستم کی داد دینے والا — کوئی نہیں ظلم کا فسانہ لکھیے
اب ہوگئے سارے ظرف خالی خالی — خم شیشے کو جام کو کٹورا لکھیے
اب ہے نئی روشنی کی ظلمت پھیلی — ہاں کعبے کو طور کا تجلا لکھیے
دیوانہ تھا قیس بن گیا کیوں مجنوں؟ — تعریف کے بدلے آج لیلا لکھیے
سادے ہی سہی نہ لکھیے مشکل اشعار — سمجھیں نہ عوام وہ معما لکھیے
غالب کی روح پر خدا کی رحمت — کیوں اُس کے جواب میں حریفانہ لکھیے
راقم کی یہ عرض ہے جو فرمائیں قبول — سمجھا سکیں جس کو شعر ایسا لکھیے
قاتل کوئی اور ہے مسیحا کوئی اور — اچھا کسی اور کو مسیحا لکھیے
عاشق کی ہے درد کی دوا وہ بے درد — معشوق کو چارہ ساز اپنا لکھیے
مے کی نہ سہی اگر ہو کوثر کی ہوس — ساقی پہ نہ کوئی حرف بیجا لکھیے
نشے میں خبر نہ لے کہیں پیر مغاں — اپنے کو نہ میکشوں کا قبلہ لکھیے
ہے دیر میں کون گھر حرم ہے کس کا؟ — کس کے ہیں یہ کعبہ و کلیسا لکھیے
مذہب کے ساتھ رکھیے مشرب کا لحاظ — لکھیے لیکن نہ بے محابا لکھیے

آسان نہیں شفق غزل کا لکھنا
لکھ ہی نہ سکیں تو بار دعوے لکھیے

جواب امیر

مولانا شفق رضوی عماد پوری کی تحریر کے بموجب "غزل کی شاعری کا جواب" حضرت امیر بدایونی کو دکھا دیا گیا تھا۔ گزشتہ ماہ میں یہ نظم شائع ہونے سے رہ گئی۔ اب حضرت امیر کا جواب اس کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ناظرین مطائبۃ الاحباب سے محظوظ ہوں:-

شفق نے دی عجب انداز سے داد سخن مجھ کو — نہ میری نظم وہ سمجھے نہ اُن کی نظم میں سمجھا
ذرا انصاف ہے فہم و خرد کی بھی ضرورت ہے — دوبارہ سنیے پھر میری زباں سے مدعا میرا
نہ تھی ہر شاعری کی ہجو نظم مختصر لیکن — غزل کے پہلوئے تاریک کا کھینچا تھا اک نقشا
ہوا کوئی جس رنگ میں کہا ہے غزل لکھے — پر اُس رنگِ غزل سے دیدیا تھا میں نے استعفا

یہ حسنِ ظن ہے مجھ کو آپ کہتے ہیں اگر شاعر — نہ شاعر ہوں نہ مجھ کو شاعری کا تھا کبھی دعویٰ
نظارے نیو لائٹ کے جنھیں ظلمت نظر آئیں — پھر اُن آنکھوں کو نابینا کہیں ہم۔ یا کہیں بینا
غزل لکھیے قصیدہ لکھیے اور جو چاہیے لکھیے — بہت اچھا ہے جاری کیجیے ناک اور گلدستا
نقیب' ایسی غزل ایسے قصیدے کا نہیں شائق — جسے ظلمت سمجھتے ہو یہ اُس لائیٹ کا ہے جلوہ
اگر تشبیہ سے یا رسیہ کی آپ ڈرتے ہیں — تو لکھیے زلف و گیسو کو شبِ ہجر و شبِ یلدا
غزل کی شاعری مشکل تھی مشکل ہو چکی آسان — اب آسانی سے جو چاہے کرے تقلید کو رانا
یہ تشبیہیں خیالی۔ فرق کچھ باہم نہیں رکھتیں — پھر آخر آپ کی اس کد و کاوش کا نتیجہ کیا
کہ موجود ہیں سب۔ وہم لکھنا اک حماقت ہے — عبث ملکِ عدم کا راستہ ناپے سے کیا ہوگا
انوکھی آپ کی تہذیب ہے ہم لوگ کیا جانیں — کلامِ حضرت جامیؔ سے کیجے فیصلہ اس کا
اجازت دے اگر تقلید کی یہ آنجہ تو لکھیے — جو مے خانہ لکھا کرتے ہیں اُن سے کیجیے جھگڑا
نہیں ہے تنگ تشبیہات کا کچھ دائرہ یاں بھی — مگر ہم ایسی تشبیہات پر ہرگز نہیں شیدا
کہ تر یا کیجیے یا جادو۔ یا اک گھاس کا پولہ — ثمرہ اپنی ہے۔ یار اپنا ہے دوات و قلم اپنا
جہاں تک ہو سکے غرضیکہ کا درد دی کیجیں — بہت کچھ دیجیے دادِ ستم اس میں تکلف کیا
غزل میں جام کیجیے۔ پی جیے پانی کٹورے سے — یہ کم ظرفی ہے بالکل جام سے قطع نظر کرنا
ہمیں کانٹوں پہ ناحق کھینچتے ہیں مشورہ دیکر — گل و بلبل کا لکھیے مرثیہ یا چھوڑیے قصہ
غضب ڈھایا ہے حضرت آپ کی تخلِ طبیعت نے — گراں قیمت ہے باطن سے زیادہ ظاہر طلا
بحمد اللہ نعت و منقبت کثرت سے لکھتا ہوں — نقیب اس کی اشاعت کے لیے موزوں نہیں قبلہ
نہ تھا ہرگز کوئی تعریض کا پہلو بجز لیفیے ملیں — کیا ہے روحِ غالب کی طرف سے کچھ نیا شکوا
یہ کس کا تذکرہ تھا اور کوثر کی طلب کس سے — کجا وہ ساقیٔ کوثر کجا یہ بہرہ ساغر و مینا
خبر پیرِ مغاں کیا لے ہواسوں کی خبر لیجیے — یہ کیا تہذیب ہے۔ بد مستیاں ایسی نہیں بیجا
حرم۔ دیر و کلیسا۔ ایک ہیں شاعر کے مشرب میں — تو کعبے کو کلیسا لکھیے اور اس دیر کو کعبا

کبھی شام سیہ کی تیرگی جاتے نہیں دیکھی
شفق کے پھولنے سے رات کا دن ہو نہیں سکتا

ایک لائبریری کے جلسے میں مسئلہ یہ پیش تھا کہ کون کون سے رسالے منگوائے جائیں کسی نے کہا "نقیب" اور کسی نے کہا "معارف" مگر ایک رائے بہادر صاحب نے پریسیڈنٹ سے جو انگریز تھے اس طرح اظہار رائے فرمایا۔

"حضور بہو بیٹیاں ہمارے بھی ہیں رسالے کی ہمارے یہاں ضرورت نہیں ہے۔ حضور منع لکھ بھیجیں۔ یہ لوگ بڑے شریر اور بدمعاش ہوتے ہیں۔"

تلوّن

"منشی جی" صاحب

رات کے بارہ بجے۔ خالی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنی قسمت پر غور کرتا ہوا عجب اگر بیس ریسٹوران کی طرف سے اپالو بندر کی طرف جا رہا تھا۔

عموماً اس کی بے پروائی اور بے فکری۔ آئے دن کے مصائب و نوائب کا کوئی دیرپا اثر اس کی طبیعت پر نہیں رہنے دیتی تھی اور اس لڑائی میں جو روزانہ اسے قسمت کے ساتھ لڑنی پڑتی تھی۔ اگر وہ غالب نہیں ہوتا تھا تو کم از کم غیر مغلوب ضرور رہتا تھا۔ مگر آج کی سردی اور گرسنگی کی شدت۔ اس کی بے پروائی اور خوش مزاجی پر فی الجملہ فتحیاب ہوئیں اور ہم جنس کے ابنائے جنس کے ساتھ ایک فوری جذبۂ مبغضت نے۔ اس کی چشم و ابرو کو ڈراؤنا بنا دیا۔

آخری چوّانی جو گذشتہ شام کو اس کے پاس موجود تھی۔ کچھ دیر بعد ہی اس کی جیب سے مفارقت کر کے ایرانی چائے فروش کے صندوقچے میں پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے آج معدے کو صبح کی چائے، اور چاشت کے ناشتے اور شام کے کھانے سے قطعاً محروم ہونا پڑا۔ شام کو غم بالائے غم یہ ہوا کہ پچھلے مہینے کا کرایہ نہ ملنے سے مکان دار نے اُسے مکان سے بھی نکال باہر کیا۔ ایسی حالت میں زمانے کی اس سفلہ نوازی اور سوسائٹی کی اِس خارج از اعتدال روش پر اُسے جس قدر غصہ نہ آئے تھوڑا ہے کہ جس وقت بمبئی کے دولتمند سیٹھ ساہوکار جو الف کے نام لٹھ بھی نہیں جانتے۔ تاج محل میں ڈنر اُڑا کر موٹروں میں جا رہے ہوں تاکہ اپنے پُرتکلف منازل عیش میں مخملی گدّوں والی مسہریوں پر محوِ استراحت ہوں بمبئی یونیورسٹی کا ایک گریجویٹ اور فلسفہ و اقتصادیات کا ماہر گلیوں میں بے آب و نان اور بے خانماں پھر رہا ہو جیسے حضرت عیسیٰ

کی طرح پڑ رہنے کو جگہہ بھی نہیں۔

انہیں تاریک خیالات کے پیچ و تاب میں اس کے قدم آہستہ آہستہ اُسے منزل غیر مقصود کی طرف لیے جا رہے تھے۔ کہ اپالو بندر کا "ہیو بلین" آ گیا۔ خدا جانے وہ یہاں کھڑا ہوا اپنی حالت پر کب تک غور کرتا رہتا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی اور وہ ذرا تاریکی میں ہٹ گیا۔ ایک شخص نہایت آہستہ آہستہ آیا اور اُس سے کوئی دو گز کے فاصلے پر منڈیر کے قریب کھڑا ہو گیا۔ طبیب کو اُس نے بالکل نہیں دیکھا۔ یہ شخص اپنے خیالات میں اس درجہ مستغرق تھا اور سمندر کی طرف اس طرح ٹکٹکی لگائے دیکھتا تھا کہ طبیب اپنی گرسنگی اور بے خانگی سب بھول گیا اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔ طبیب کی نگاہ تیز تھی اس لیے اُس نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا کہ وہ ایک خوش پوش متوسط القامت اور خوب صورت نوجوان ہے۔ طبیب تعجب و دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھ منڈیر پر رکھ دیے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سمندر میں کودنے کے لیے طیار ہے۔ مگر ایک منٹ ایسی حالت میں رہنے کے بعد وہ منڈیر پر چڑھ گیا اور اس طرح بیٹھ گیا کہ ایک پاؤں سمندر کی طرف لٹکا ہوا اور ایک پاؤں اپالو بندر کے چبوترے کی طرف۔

طبیب نے اس سے زیادہ تاریکی میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور قریب آ کر اجنبی کی خشکی کی طرف والی ٹانگ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"معاف کیجیے۔ اجازت ہو تو میں دریافت ......"

اجنبی۔ "ایں تو کون ہے؟ اور یہ میری ٹانگ کیوں کھینچتا ہے"

طبیب۔ "جناب عالی! اس وقت جس شخص کو جناب کی پابوسی کا فخر حاصل ہوا ہے وہ طبیب ایم۔ اے ہے۔ ممکن ہے کہ جناب نے خاکسار کا نام نہ سُنا ہو یقین فرمائیے کہ میں جناب کی ٹانگ

کھینچنے کی گستاخی کا مرتکب نہیں ہوا ہوں بلکہ میں نے صرف ایک سوال پوچھنے کے
لیئے جناب کو متوجہ کرنے کی جسارت کی ہے"

اجنبی "سوال؟ مجھ سے؟ اچھا کیا سوال ہے؟"

طبیب "محض اتنا کہ کیا آپ خودکشی کرنا چاہتے ہیں؟"

اجنبی "اور اگر میں کرنا چاہتا ہوں تو کیا آپ مجھے روک دیں گے؟"

طبیب "خدا نہ کرے کہ میں روکوں۔ بھلا آپ نے کیا گناہ کیا ہے جو میں آپ کے خانگی معاملات
میں دخل دینے والا کون؟ مگر بات یہ ہے کہ میں ایک غریب آدمی ہوں"

اجنبی "غریب؟ تمہاری غریبی کو میری خودکشی سے کیا تعلق؟"

طبیب "جی کچھ نہیں مگر ایک اعتبار سے بہت کچھ ہے"

اجنبی "بہت کچھ کس اعتبار سے؟"

طبیب "اس اعتبار سے کہ جب جناب سمندر میں غوطہ زن ہوں گے تو میری رائے
ناقص میں جناب کی جیب کا زر نقد، جناب کی عینک، جناب کی گھڑی۔ جناب کی انگوٹھی
یہ سب چیزیں جناب کے ساتھ سمندر میں چلی جائیں گی۔ جو وہاں بالکل غیر مطلوب اور بے مصرف
ہونگی یہ اسراف کی ایک ایسی شکل ہوگی جسے میں بحیثیت ماہر اقتصادیات کسی طرح جائز
نہیں سمجھتا۔ جناب ملاحظہ فرمائیں کہ سمندر کے اندر جناب کو نہ تو چیزیں خریدنے کیلیئے
روپے پیسے کی ضرورت ہوگی نہ وقت دیکھنے کے لیے گھڑی کی۔ نہ دور کی چیز دیکھنے کے لیے
عینک کی۔ اور نہ نمائش کے لیے انگوٹھی کی۔ آپ تو ایسے عالم میں پہنچ جائیں گے جہاں
بغیر صرف کیئے ہر چیز ملے گی لیکن یہ خاکسار ابھی تک عالم مادی اور دنیائے اسباب میں گھرا
ہوا ہے اور فلاکت نصیبی سے آج کل نانِ شبینہ کو محتاج ہے۔ ایسی حالت میں ان اشیاء کا

بمقابلہ بحر عرب کے میں زیادہ حقدار ہوں"

اجنبی کا طبیب کی باتوں میں ایسا جی لگا کہ اُس سے رُو در رُو ہونے کے لیے اُس نے

وہ پاؤں بھی جو سمندر کی طرف لٹکا ہوا تھا چبوترے کی طرف کر لیا اور طبیب سے کہنے لگا۔

"تو تم غریب ہو؟"

طبیب "غریب اور بہت غریب۔ میں بھوکوں مر رہا ہوں۔ اور آج شام سے رہنے کو مکان بھی

نہیں۔"

اجنبی "تب تم ایک کام کیوں نہیں کرتے"

طبیب "جناب وہ کیا؟"

جنبی چلو ہم تم ساتھ ڈوب کر خودکشی کریں"

طبیب جناب معاف فرمایئے۔ ڈوب کر خودکشی کرنا آپ کو پسند ہو۔ مگر میں ابھی اور زندہ رہنا

چاہتا ہوں۔ اگرچہ ہر چیز نے میرا ساتھ چھوڑ دیا مگر امید کی ایک ہلکی سی شعاع نے ابھی تک

میرا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔

اجنبی میری رائے میں تو تمہاری مشکلات کا خاتمہ اس سے بہت جلد ہو جاتا مگر چونکہ تم اس کو

پسند ہی نہیں کرتے لہٰذا مجبوری۔ اور اگر سچ پوچھو۔ پسند تو میں بھی نہیں کرتا۔

طبیب مگر آپ کے لیئے تو شاید خودکشی ناموزوں نہ ہوگی۔ کیونکہ آپ کے پاس خودکشی کرنے کے

توی وجوہ ہوں گے۔

اجنبی مگر اب تو تم نے میرے خیالات کی رو کو ایسا روک دیا کہ اب میں اس کے لیے تیار

نہیں۔ اگر تم اُس وقت میرا پاؤں پکڑ کے باتوں میں مشغول نہ کر لیتے تو اب تک تو .....

طبیب جناب تو ابھی وقت ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اپنے جسم پر سے غیر ضروری اشیاء ہٹا

جیب میں منتقل فرمادیں اور اس کے بعد یہاں سے وہاں تک ..... راستہ"......

(طبیب کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر) "بھئی خدا کے لیے رہنے دو"

یہ کہہ کر اور طبیب کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اجنبی دھم سے چبوترے کی طرف کو دوڑا اور قریب ہی ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ طبیب بھی پاس آگیا۔

اجنبی بھئی بات یہ ہے کہ میں ایک متلون مزاج آدمی ہوں اور اپنے جذبات سے جلد مغلوب ہو جاتا ہوں۔ مگر اب وہ جذبہ اور غلبہ فرو ہو گیا۔ کچھ سمجھ گئے؟ میں بڑا آدمی تھا جو آج جان عزیز ایک عورت کی بے اعتنائی ......

طبیب۔ عورت؟ لاحول ولا قوۃ! میں سمجھتا تھا کوئی نہایت اہم معاملہ ہوگا جس کی وجہ کر آپ دنیا کو خیر باد کہنا چاہتے تھے۔

اجنبی مجھے نہایت خجالت کے ساتھ اعتراف ہے کہ خودکشی کی وجہ تو ایک عورت کی بے اعتنائی ہی تھی۔ بھائی صاحب! کبھی آپ سے بھی کسی عورت نے بے اعتنائی کی ہے؟

طبیب۔ جی ہاں۔ مگر صرف ایک ہی عورت نے جو اکثر بے اعتنائی کرتی ہے اور جس سے آپ کی بھی شناسائی ہے۔

اجنبی میری شناسائی ہے! اور آپ سے بے وفائی کرتی ہے؟ وہ کون عورت ہے؟

طبیب خاتونِ دولت۔ اگر آج آپ اپنی جیب کے غیر ضروری بوجھ کو میری جیبوں میں منتقل فرما کر خلوت گاہ بحر میں آرام فرماتے تو یقیناً آج مجھ سے خاتون صاحبہ ہمکنار ہوتیں مگر اب تو......

اجنبی ارے بھئی میں بھول گیا۔ چلو۔ گرینیس ریسٹران میں پہلے تمہارے معدے کی مرمت کرائیں پھر دیکھا جائے گا۔

طبیب اس میں شک نہیں کہ آج میں دن بھر کا بھوکا ہوں مگر ابھی ایسی حالت نہیں ہے کہ میں بھیک مانگنے کے لیے مجبور ہو جاؤں۔ اب حالت بدل گئی ہے۔ جب تک یہ سوال درپیش تھا کہ آئندہ

عینک۔ گھڑی۔ انگوٹھی اور پاکٹ بک کا مالک ہمند رہو یا میں۔ تو میں اپنو عادی کو ترجیح دیتا رہا

لیکن اب جناب میں گرسنہ ہوں گا اگر نہیں ہوں۔

اجنبی اے بھائی۔ تمہاری وجہ مایوسی بنی میرے لیے وجہ ممنونی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں

کہو۔ اگر تمہارے آج کے کھانے کی قیمت میری زندگی کی قیمت تھی تو کم از کم میں اس شے

کی قیمت کے بقدر تمہارا مقروض ہوں جسے آج تم نے بچایا ہے۔ اسے بھی جانے دیجیئے میں

آپ کی اس وقت دعوت کرتا ہوں اور بہ حیثیت ایک جنٹلمین کے آپ کو اسے قبول

فرمانا چاہیئے،،۔

طیب خاموش ہو گیا۔

سامنے سے ایک وکٹوریہ نکلی جسے اجنبی نے روک لیا اور دونوں سوار ہو کر "مالابارہل"

کی طرف چلے۔ راستے میں اجنبی نے بتایا کہ اس کا نام سہراب جی۔ فردوں جی پالکی والا ہے۔

مکان پر پہنچ کر سہراب جی نے طیب کو پہلے تو خوب کھانا کھلایا اور اس کے بعد دونوں باتوں

میں مشغول ہوئے۔ سہراب جی نے اپنی ناکامی محبت کا قصہ چھیڑ کر "مینٹل پیس" پر سے ایک

فوٹو اٹھا کر طیب کو دکھایا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی بے اعتنائی نے آج مجھے آبی قبر میں سونے کے

لیے مجبور کیا۔

طیب۔ بھائی سہراب جی جب آپ نے مہربانی کر کے مجھے اپنے ذاتی حالات سے مطلع کیا ہے تو

مجھے یہہ سوال کرنے کی اجازت دیجیئے کہ آپ کی محبوبہ نے کن الفاظ میں آپ سے انقطاعِ

محبت کیا۔

سہراب جی۔ اُس نے آج کے خط میں جو کچھ لکھا اس کا ملخص یہہ تھا کہ وہ ایک شخص مہربان جی کی محبت

کے علاوہ اپنے باقی عشاق کی محبت پر میری محبت کو ترجیح دیتی تھی اور چونکہ مہربان جی کے

حقوق محبت کے تقدم و ترجیح کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتی لہذا افسوس کہ وہ میرے ساتھ شادی نہ کرنے پر مجبور ہے۔

طیب اب دو تین باتیں اور بتا دیجیے۔ اس لڑکی کا نام اور مہربان جی کے تفصیلی حالات جو جہاں تک معلوم ہوں۔

سہراب جی لڑکی کا نام تہمینہ ہے یہ کسی دولتمند خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ گرانٹ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے اور اس سال امتحان میں شریک ہونے والی ہے۔ مہربان جی کے متعلق میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ اس کا نام مہربان جی ہنجی موٹر والا ہے۔ کیمپس سٹریٹ میں نوکر ہے۔

طیب۔ اب جبکہ آپ اس خاتون سے مایوس ہو چکے ہیں۔ کیا آپ مجھ پر اتنا اعتبار کریں گے کہ اس کا آخری خط کسی دن تھوڑی دیر کو مجھے دیں۔

سہراب جی جب چاہو لے لینا مگر شرط یہ ہے کہ واپس دیدینا۔

طیب کو چونکہ علم تھا کہ آج بھی جیسے غدار شہر میں کوئی چھت نہیں ہے جس کے نیچے وہ رات بسر کر سکے لہذا سہراب جی کی اس دعوت کو کہ آج کی رات وہ اُسی کے پرتکلف مکان میں بسر کرے اُس نے بڑی خوشی سے قبول کیا اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں اپنی اپنی چارپائیوں پر سو رہے۔

×× ×× ※ ×× ××

صاحب "مہربان جی۔ بصرے سے کلرکوں اور اسسٹنٹوں کی جو مانگ آئی ہے اُس کا متعلق ماتحت دفتروں کے کلرکوں سے دریافت کرو کہ وہاں جانے کے لیے کون کون شخص رضامند ہے۔ ہماری رائے میں تنخواہ اس قدر زیادہ ہے کہ بہت سے آدمیوں کو وہاں جانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے۔ اگر تم خود جانا چاہو تو ہم بڑی خوشی سے تمہاری

سفارش کر سکتے ہیں۔ تنخواہ بہت معقول ہے۔ اور آیندہ ترقی کے لیے تمہارا استحقاق بہت زیادہ ہو جائے گا۔ تمہاری غیر حاضری میں یہاں کا انتظام اس طرح ہو سکتا ہو کہ تمہارے اسسٹنٹ کو تمہاری جگہ پر مقرر کر دیا جائے گا اور اُس کی جگہ اُس سے نیچے درجے والے کو دی جائے گی جب تم واپس آ جاؤ گے تو تمہاری مستقل جگہ تمہارے لیے خالی کر دی جائے گی۔ جنرل صاحب نے مجھ کی چٹھی میں لکھا ہو کہ اگر تم وہاں آ گئے تو بہت اچھا ہو گا۔ اگر تمہاری مرضی ہو تو ہم تمہاری سفارش کریں مگر یہ سب تمہاری مرضی پر ہے۔

مہربان جی۔ حضور کی پرورش ہو مگر میں اپنی خوشی سے تو بالفعل ہندوستان سے باہر جانا چاہتا نہیں ہوں۔

صاحب۔ "کیوں ؟"

مہربان جی۔ حضور میری شادی ہونے والی ہو۔ میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے وعدہ کر لیا ہو کہ بہت جلد وہ مجھ سے عقد کر لے گی ایسی حالت میں میں اپنی مرضی سے تو ابھی باہر جانا نہیں چاہتا۔ اگر حضور مجبور کریں گے تو میں نہیں جانتا کہ میں کیا کرونگا۔

صاحب "نہیں ہم تمہیں مجبور نہیں کرتے۔

مہربان۔ تو حضور میں بالفعل ہندوستان سے باہر جانا نہیں چاہتا" مہربان جی یہ کہہ کر اپنی میز پر آ بیٹھے اور دفتر کے کام میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چٹھی رساں نے اُن کی ذاتی ڈاک دفتر ہی میں جا کر دی۔ مہربان جی سرکاری کام کو اپنے ذاتی کام پر ترجیح دینے کی وجہ سے اپنے خانگی خطوط ہمیشہ سرکاری کام سے فارغ ہونے کے بعد فرصت کے وقت میں یا مکان جا کر پڑھا کرتے تھے۔ مگر آج کی ڈاک میں ایک

خط تھا جس کی شان تحریر پر نظر پڑتے ہی انھیں محسوس ہوا کہ جب تک وہ اس خط کو نہ پڑھ لیں دفتر کا کام کرنا محال ہے۔ لہذا کچھ دیر سوچنے کے بعد انھیں اپنا اصول توڑنا ہی پڑا اور خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ چونکہ دفتر کے صیغۂ مراسلت کا کام مہربان جی کے سپرد تھا لہذا کثرت مزاولت کی وجہ سے وہ ہمیشہ طویل سے طویل مراسلے کو صرف ایک ہی مرتبہ پڑھ کر اس کا مسودۂ جواب تیار کرتے تھے۔ مگر اس مختصر سے خط کو انھوں نے کوئی تین چار مرتبہ پڑھا اور دیا معلوم ہوتا تھا کہ پھر بھی مفہوم ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

ناظرین سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ خط مس تہمینہ کا تھا جس کا ملخص یہ تھا کہ وہ ایک شخص سہراب جی کی محبت کے علاوہ اپنے باقی عشاق کی محبت پر مسٹر مہربان جی کی محبت کو ترجیح دیتی ہے اور چونکہ سہراب جی کے حقوق محبت کے تقدم و ترجیح کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتی لہذا افسوس کہ وہ مہربان جی کے ساتھ شادی نہ کرنے پر مجبور ہے۔

کئی مرتبہ اس خط کے پڑھنے کے بعد مہربان جی سر پکڑ کر اپنی کرسی کو تکیہ لگا کر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر تک سوچتے رہے آخر کار وہ اپنی کرسی پر سے اٹھے اور سید ھے صاحب کے کمرے میں گئے۔

صاحب ۔ ول مہربان جی"

مہربان جی۔ حضور میں نے اب یہ طے کیا ہے کہ میں خود بھی بصرہ چلا جاؤں۔ لہذا دفتر کا انتظام فرما کر مجھے وہاں جانے کے لیے سبکدوش فرما دیجیے۔

صاحب ۔ مگر ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے اور بالفعل تم ہندوستان سے باہر جانے کے لیے تیار نہیں ہو

مہربان جی۔ مگر اب میں نے اپنی رائے تبدیل کر دی ہے

صاحب۔ اس کے اسباب ہوں گے

مہربان جی جی ہاں حضور اس کے اسباب ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد وہاں

چلا جاؤں۔

صاحب یہ سچ ہے کہ غالباً شادی ابھی عرصہ کی اور مہربان جی چاہتا ہے کہ بمبئی کی ملازمت

میں ست کافی رقم میں اندازکرے تب شادی کرے۔

صاحب جنرل صاحب نے لکھا ہے کہ جو کلرک شرائط مندرجہ پر آنے کو تیار ہوں وہ بلا تاخیر

فوراً ہندوستان سے روانہ ہو جائیں لہٰذا اگر تم چاہو تو جہاز ڈھونڈ لائیں جو

آج سے چوتھے روز جانے والا ہے سوار ہو جاؤ۔

مہربان جی۔ چار روز کیسے میں تیار ہوں کہ آج ہی چلا جاؤں۔

×× ×× ×× ✲ ×× ×× ××

اپالو بندر پر تیج اور لیڈیاں اور جنٹلمین دریا کنارے کھڑے اور بنچوں پر بیٹھے سیر کا لطف

اٹھا رہے ہیں۔ گذرگاہ عام سے علیحدہ طیب اور سہراب جی ایک بنچ پر بیٹھے سرگرم گفتگو تھے

کہ سہراب جی کی نظر دفعتاً اٹھ گئی۔ اس نے طیب کو اشارہ کیا کہ "یاٹ کلب" کی طرف سے جو

گاڑی آ رہی ہے اس میں تہمینہ ہے۔

طیب نے سہراب جی سے کہا "آپ میری فہم و فراست کے بڑے مداح ہیں اگر واقعی

آپ کو میری عقل پر بھروسہ ہے تو جو میں عرض کروں اس پر عمل کیجیے"

سہراب جی۔ "کہیے!"

طیب آپ فوراً یہاں سے تشریف لے جائیے اور ممکن ہو تو سیدھے اپنے مکان کو جائیے

مہربانی کرکے اس کی وجہ مجھ سے نہ پوچھیے۔

مراب جی بیچارہ بہت اچھا کہکر چلا گیا۔

تہمینہ آکر ایک بنچ پر بیٹھی ہی تھی کہ طیب اپنے ایک دوست کو لیکر اس کے قریب والی بنچ پر جا بیٹھا اور پیسی آواز میں اُس سے باتیں کرنے لگا کہ تہمینہ بخوبی سُن سکے۔

طیب۔ ارے یار پیسی! تم نے مہر جی کا واقعہ سنا؟

پیسی۔ کون مہر جی؟

طیب۔ وہی مہربان جی جو پہلے تمہارے ساتھ "سینٹ زیویرز" میں تھا۔

پیسی۔ وہ تو کلکتہ چلا گیا تھا۔

طیب۔ ہاں وہی بیچارہ۔ اسے تو ایک دم پلٹن کے ساتھ جانے کا حکم ملا تھا۔ اب اس کی موت کی اطلاع ملی ہے۔

پیسی۔ کیسے مر گیا؟

طیب۔ لڑائی میں جانا موت کے منہ میں جانا تو ہے ہی یہ کیا پوچھنا کیسے مر گیا؟

پیسی۔ بہت افسوس ہوا۔

پیسی طیب کے اشارے سے یا خود بخود وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اور طیب نے بظاہر اپنی نظر اور توجہ ایک کشتی کی طرف پھیر لی جو بمبئی قلعے کی طرف سے گذر رہی تھی۔

تہمینہ نے طیب اور پیسی کی گفتگو کا حرف حرف سنا تھا۔ لاکھ ضبط کرنا چاہا مگر نہ ہو سکا۔ مجبور ہو کر اُس نے طیب سے بلا معرفت سابقہ گفتگو شروع کی۔

تہمینہ:۔ کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کس مہربان جی کا ابھی ذکر کر رہے تھے۔

طیب۔ مہربان جی بہمن جی موٹر والے کا

تہمینہ:۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ۔۔۔۔۔۔

طیب ۔ میرے ایک دوست نے جو اس کے ساتھ مکسٹریٹ میں نوکر ہو لکھا ہو کہ بیچارہ مارا گیا ۔

تہمینہ ممکن ہو کہ آپ کے دوست نے کچھ غلطی کی ہو ۔

طیب بھلا ایسا ہو سکتا ہو ۔ ہر وقت کا ایک جگہ رہنا سہنا ۔ اس میں غلطی کا احتمال کیا ؟

معاف کیجیئے آپ کو مہربان جی سے کیا واسطہ ؟

تہمینہ (ٹھنڈی سانس لیکر) میں بھی اُسے جانتی ہوں ۔

طیب مجھے معلوم ہو کہ بیچارے کی شادی ہونے والی تھی ۔ اگر وہ دفعتاً نہ چلا جاتا تو شاید ہم بھی چلی ہوتی ۔

تہمینہ نہایت افسوس ہو ۔

طیب میں نے سُنا ہو کہ وہ لڑکی گرانٹ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہو اور امسال امتحان میں شریک ہونے والی ہو اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ایک مرتبہ مہربان جی نے اُسے دور سے مجھے دکھایا بھی تھا ۔ لانبا قد ہو بڑی سیاہ آنکھیں ہیں ۔ پتلے ہونٹ ہیں ۔ میدے اور شہاب کی سی رنگت ہو

تہمینہ اپنا حلیہ سُن کر شرمندہ ہوگئی اور شرم سے آنکھیں نیچی کرلیں ۔

طیب مجھے اُس بیچاری لڑکی سے دلی ہمدردی ہو ۔

تہمینہ جس کے دل و دماغ کا اندازہ ناظرین خود فرما سکتے ہیں ۔ اس کا بھی کچھ جواب نہ دے سکی ۔

طیب معاف کیجیئے میں ایک سوال کروں ۔

تہمینہ فرمایئے ۔

طیب۔ آپ کی رائے میں اس لڑکی کو کیا کرنا چاہیئے۔

تہمینہ۔ میں کیا بتا سکتی ہوں؟

طیب۔ آپ قیاساً بتایئے کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔؟

تہمینہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ آپ ہی بتلایئے کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔

طیب (جو اسی موقعے کا منتظر تھا) میری رائے میں تو اُسے اپنی زندگی تباہ نہ کرنی چاہیئے اور کسی ایسے شخص سے جس سے اُسے مہربان جی کے بعد سب سے زیادہ محبت ہو شادی کر لینا چاہیئے۔

تہمینہ نے یہ سُن کر پہلے ایک آہ سرد بھری اور گردن جھکا لی

طیب۔ مجھے اگر وہ لڑکی ملے تو میں اُسے یقیناً یہی صلاح دوں کہ فہرستِ عشاق میں جس کا نمبر دوسرا ہو اور جس سے اُسے دوسرے درجے پر محبت بھی ہو شادی کر لینی چاہیئے اگر آپ اس قابلِ ہمدردی لڑکی سے ملیں تو مجھے امید ہے کہ آپ اسے یہی صلاح دیں گی بلکہ آپ اُس سے یہ کہہ سکتی ہیں کہ یہ ایک بڑے تجربے کار شخص کی رائے ہے۔

دوسری صبح کو ڈاک سے سہراب جی کے پاس تہمینہ کا
خط پہونچا۔ جس میں لکھا تھا کہ آج شام کو مجھے "بینڈ اسٹینڈ" پر ملو

xx xx xx ❁ xx xx xx

سہراب جی۔ یار طیب جانتے ہو میں اس وقت کہاں سے آرہا ہوں۔

طیب۔ (زمین پر لکیریں کھینچ کر) میرا نجوم یہ کہتا ہے کہ تم بینڈ اسٹینڈ سے آرہے ہو

سہراب جی۔ ارے اچھا بتاؤ کس سے مل کر آرہا ہوں۔؟

طیب (زمین پر اور زیادہ لکیریں کھینچ کر، اور انگلیوں پر کچھ گن کر) مس تہمینہ سے ملکر۔

سہراب جی۔ ارے یار۔ تو تو بڑا جادوگر ہو! یقیناً تو نے بنیڈ اسٹینڈ پر مجھے تہمینہ سے باتیں کرتے دیکھا ہوگا

طیب: بلیو میں تو "جیکیبس سرکل" سے ابھی سیدھا آرہا ہوں۔

سہراب جی: اچھا تناؤ۔ وہاں کیوں گیا تھا؟

طیب۔ (پھر لکیریں کھینچ کر اور کچھ حساب کر کے) نجوم تو یہ کہتا ہو کہ تہمینہ نے خط بھیج کر تمہیں بنیڈ اسٹینڈ پر بلایا تھا

سہراب جی: ۔۔۔ تو تو نجومی ہو

طیب۔ اور میرا نجوم اس سے بھی زیادہ بتاتا ہو۔

سہراب جی: وہ کیا؟

طیب: وہ یہ کہ تم ۔۔۔ آج کیا تاریخ ہو؟

سہراب جی: پچیس۔ ہاں تم کیا کہہ رہے تھے کہ اگر تم۔

طیب: اگر تم اصرار کرو تو اگلے مہینے کی دس تاریخ کو مس تہمینہ تمہاری بھابی جان ہو جائیں

سہراب جی: یار۔ یہ راضی کیسے ہوئی۔

طیب: آپ بڑے گدھے ہیں

سہراب جی: کیوں

طیب۔ یوں کہ آپ کی عقل اس کے سمجھنے سے قاصر ہو کہ تہمینہ کیسے راضی ہوگئی۔ کچھ تم نے اُس سے پوچھا بھی؟

سہراب جی۔ مجھ سے اس نے جس وقت یہ کہا کہ اُس نے اپنے فیصلے پر نظرثانی کی ہو اور اب وہ خیال کرتی ہو کہ میرے ساتھ شادی کرکے وہ زیادہ خوش رہیگی تو مجھ پر ایک ایسی مسرت

طاری ہوئی کہ میری زبان بند ہوگئی ... [illegible] ... جب
کیا موقع تھا کہ اُس نے اپنی رائے یوں بدلی۔

طیب۔ اب تو یار لوگوں کو مٹھائی کھلاؤ

سہراب جی اس میں آپ نے کیا کیا ہی جو مٹھائی کھلاؤں

طیب۔ ہم نے یہ کیا کہ تہمینہ کو تمہارے ساتھ شادی کرنے پر راضی کرلیا۔

سہراب جی سچ بتاؤ تم نے راضی کرلیا؟ کیسے راضی کرلیا؟

طیب تمہیں یاد ہی کہ تم نے اپنی ناکامی کا حال بیان کرتے ہوئے اپنے رقیب کا نام مہربان جی بتایا تھا؟

سہراب جی ہاں بتایا تو تھا

طیب بس اسی وقت میں نے سمجھ لیا کہ اب طیب کا دماغ سہراب جی کی شادی تہمینہ سے کرادیگا۔

سہراب جی وہی تو بتاؤ کیسے؟

طیب۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ آپ کا رقیب ایک شخص مہربان جی ہمن جی موٹر والا ہی جو کمشریٹ میں نوکر ہی اُس کا صحیح پتہ لگانا کیا مشکل تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ سے بس تہمینہ کا آخیر خط مانگ لیا تھا۔

سہراب جی۔ ہاں یاد ہی۔

طیب۔ آپ کو یہ سُن کر پُر لطف حیرت ہوگی کہ جس روز مجھے آپ نے وہ خط دیا اُس سے چوتھے پانچویں روز قریب قریب اسی مضمون کا ایک خط مہربان جی کے نام پہنچا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تہمینہ کو اطلاع کیے بغیر فوراً بصرے کو روانہ

ہوگیا پھر یاروں کے دماغ نے وہ کام کیا جس کا نتیجہ آج کی ڈاک نے آپ کے سامنے پیش کیا

اس کے بعد نقیب نے سہراب جی سے وہ واقعات بیان کیے جو اپالو بندر پر پیش آئے تھے۔

×× ×× ×××× ×× ××

اگلے مہینے کی نو تاریخ کے بمبئی سماچار کے لوکل کالمز میں یہ خبر درج تھی کہ آج شام کو بمبئی کے پارسی لکھ پتی مسٹر سہراب جی فردون جی پالکی والے کی شادی مس تہمینہ نرامجی کے ساتھ "آل بلیس" باغ میں ہوگی +

آرزوئے دل

اظہار نہیں ممکن فطرت کے کرشموں کا ۔ مشکل ہے بیاں کرنا قدرت کے تماشوں کا
تشریح ہی ناممکن ہے حسنِ مکمّل کی ۔ جذبات حقیقی کی تصویر نہیں کھنچتی
قدرت کا تقاضا ہے۔ خاموش زباں رکھیے
بہتر ہے یہی دل کی دل ہی میں نہاں رکھیے

خوش رنگ شفق دلکش۔ رنگینیٔ گل دلبر ۔ آواز میں پوشیدہ موسیقیٔ جاں پرور
جب صنعتِ صانع میں اِک جذب کی طاقت ہے ۔ پھر فکر ہے لایعنی کیوں تم سے محبت ہے
لیکن مجھے حسرت ہے معلوم یہ ہو جاتا
کچھ دل میں تمہارے بھی ہے دھیان مرا آتا

نقیب

مرتبہ

وحید احمد

قسم اول

مطبع اشاعۃ العلوم نقیب پریس بدایوں

قواعد

۱ - یہ رسالہ آخر ماہ میں شائع ہوتا ہے

۲ - سالانہ قیمت قسم اول چار روپیہ

قسم دوم ڈھائی روپیہ

۳ - کسی خاص نمبر کی قیمت بلا لحاظ قسم ۸ر

۴ - نمونے کے لیے ۳ر کے ٹکٹ پیشگی -

۵ - خریداری کی فرمائش کے ساتھ رسالے کی قسم

اور چار دستور لکھنا چاہیئے ورنہ قسم اول کا پرچہ

چھ ماہ کے لیے وی پی کیا جائے گا -

۶ - مضامین اور شکایتی خطوط بنام ایڈیٹر آنا چاہئیں

۷ - اشتہارات کا نرخنامہ دفتر سے طلب کیجئے

مینیجر - نقیب - بدایوں

دسمبر کا نقیب قومی نمبر ہوگا

جو صاحب خریدار نہیں ہیں وہ اپنا پتہ ابھی درج کرا لیں

قیمت دس آنے ہوگی

۱۰

فہرست مضامین

نومبر ۱۹۱۹ء

جلد ۲ نومبر ۱۹۱۹ء نمبر ۴

سائنس اور آرٹ کی جنگ

از
جناب محمد محفوظ الحق صاحب احسن عظیم آبادی

۱۹۱۹ء کا گیارہواں مہینہ تھا اور میں کھانا کھا کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ میرے دوست مرزا "ا ب ت" صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے "آج کا اخبار آپ نے دیکھا؟" میں نے کہا "نہیں"۔ بولے "تو آپ نے ایک نئی جنگ کا حال نہیں سنا؟" میں نے کہا "کونسی جنگ"؟ اس سوال کا جواب دینے کے بجائے انھوں نے جیب سے اخبار نکال کر میز پر ڈال دیا اور خود پاس کی آرام کرسی پر لیٹ گئے۔ میں نے اخبار اٹھایا اور تار کا صفحہ نکال کر پڑھنے لگا

"عظیم بدامنی"

"سائنس نے آرٹ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا"

"اقلیدس کی معرکتہ الآرا تقریر"

"اس سے پہلے بھی سائنس اور آرٹ کے تعلقات بہت کچھ کشیدہ رہ چکے تھے لیکن سُفرا کے بیچ بچاؤ سے معاملہ دب جاتا تھا۔ مگر موجودہ جنگ یورپ کی کامیابیوں نے سائنس کے دماغ چڑھا دیے اور اُس نے بزورِ بازو "طاقت" منوانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ 'انتہا پسند' عملی سائنس والوں نے یہہ دیکھ کر کہ مناظرہ میں 'انتشارِ قوت' اور تضیعِ اوقات کے سوا کوئی عملی نتیجہ 'مترتب' نہیں ہوتا بہتر سمجھا کہ 'طاقت' کا استعمال کر کے آرٹ کی قوتِ مدافعت 'کو درہم برہم کر دیا جائے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گلیلو۔ کیلون۔ نیوٹن۔ ڈارون اور دوسرے سائنس دانوں کی ایک مجلس بیٹھی اور ان وزراء کے صلاح اور مشورے اقلیدس کی معرفت آرٹ کے نام الٹیمیٹم بھیجا گیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر آرٹ سائنس کی بزرگی و برتری اور اس کی پیشوائی کو مان لے ورنہ بہت جلد اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی اور ڈائنامیٹ کا ایک گولہ اُس کی بنیاد کو پست و منہدم کر دے گا۔ اقلیدس یہہ الٹیمیٹم لے کر آرٹ کے دربار میں پہونچا اور وزیر خارجیہ کے دفتر میں جا کر اُس نے یہہ اعلان جنگ پیش کیا۔ فوراً پارلیمنٹ کا جلسہ طلب کیا گیا اور چار بجتے بجتے جب ہال ممبروں سے بھر گیا تو صدرِ جلسہ ہومر نے پارلیمنٹ کی افتتاحی تقریر کے بعد سفیر سائنس کو اس طرح مخاطب کیا:۔

'ہے عرش جہاں فرش یہ کاشانہ ہے کس کا ... ہر سو ہے تجلی یہ جلوہ خانہ ہے کس کا
جلتا ہے دلِ شمع یہ افسانہ ہے کس کا ... سرگشتہ ہے مہتاب یہ پروانہ ہے کس کا
یہ اوج یہ رتبہ مری محفل کو ملا ہے ... اس آرٹ کے قربان عجب باغ کھلا ہے

" صدر کے جواب میں مسٹر اقلیدس فرض سفارت ادا کرنے کھڑے ہوئے اُن کا سر دائرے کی طرح گول، ناک زاویہ قائمہ، پیٹ مربع۔ ٹانگیں قائمۃ الزاویہ اور ایڑی مساوی الساقین تھی۔ اُنھوں نے چشمہ اپنی آنکھ پر درست کیا اور تقریر اس طرح شروع کی۔

" آرٹ وہ ہے جس کی پوزیشن تو ضرور ہے لیکن اس کی ہستی کالعدم ہے اُس میں طول ہے لیکن عرض کا پتہ نہیں۔ یہ ایک زاویۂ سادہ ہے جو زاویۂ منفرجہ سائنس میں ضم ہوگیا ہے گرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس اور آرٹ دونوں ایک سطح پر ہیں لیکن حق یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل اور مخالف ہیں جس طرح دو متوازی خطوط کبھی نہیں ملتے اسی طرح یہ دونوں بھی ایک نقطے پر متحد نہیں ہوسکتے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ سائنس اور آرٹ کا مثلث ہر حیثیت سے برابر نہیں اس لیے ان میں ایک بڑا ضرور ہے۔ اب فرض کرو کہ سائنس آرٹ سے بڑا ہے تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو علوم متعارفہ یا "اکشیم" سے کم نہیں۔ اس لیے یہ مزید توضیح کا محتاج نہیں اور انسانی دماغ اُس کی بزرگی و برتری کو بلاخوفِ تردید قبول کرسکتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے اگر انکار کیا گیا تو سائنس اپنی فضلیت بزور منوا چھوڑے گا اور اُس وقت کہیں آرٹ کی شکل کا پتہ بھی نہ ہوگا۔" Q.E.D

اقلیدس ابھی کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ صدر نے ڈانٹ بتائی اور کہا!

"خاموش از باں، دعویٰ بیجا نہیں اچھا — ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا

بس بس یہ غرور اور یہ دعویٰ نہیں اچھا — آپ اپنی ثنا واہ یہ شیوہ نہیں اچھا

کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر"

صدر کی اس خشمناک آواز نے لوگوں کو دم بخود کر دیا اور کسی کو اتنی جرات نہ ہوئی کہ وہ مخالف یا موافق تقریر کرسکے لیکن عین اس وقت مسٹر ملٹن صدر کی میز ٹٹولتے ہوئے

پہونچے اور خفیف آواز میں اُنھوں نے لوگوں کو جنگ کے خیال سے اس طرح باز رکھنا چاہا

"دل میں ہے یار کی صف مژگاں سے روکشی حالانکہ طاقت خلش خار بھی نہیں
اُنکا اُنکے عداوت اغیار اک طرف یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

ملٹن کی سردی وجمود پیدا کرنے والی تقریر نے مسٹر برک[1] کو گرما دیا اور فوراً کھڑے ہوکر اُنھوں نے اپنی دھواں دھار تقریر اس طرح شروع کردی۔

"حضرات! مسٹر ملٹن کی تقریر نہایت بودی اور کمزور ہے، ہم سائنس کے ظلم وستم کو برداشت نہیں کرسکتے ہم اپنی قوت کو آرٹ کے دشمنوں پر کام میں لائیں گے ہم ایک لحظے کے لیے بھی خیال نہیں کرسکتے کہ دنیا ہم کو بھلادے اور چھوڑ دے اور ہماری اُن چیزوں کو جن پر ہماری زندگی ہے صدمہ پہونچنے دے مجھے ہرگز یقین نہیں کہ دنیا ہماری (زبان) کو مرنے دیگی بلکہ اُس کو زندہ رکھے گی اور کبھی مرنے نہ پائے گی۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو کوشش اُس کے مارنے کی دوسری طرف ہورہی ہے اگر وہ برابر جاری رہی تو آیندہ ہماری طاقت کو صدمہ پہونچے گا یہی خوف ہے جس کے لیے کوششیں ہورہی ہیں تاکہ ہم اپنی طاقت کو قائم رکھ سکیں اور اگر خدانخواستہ وہ وقت آسے کہ اُس کو زندہ نہ رکھ سکیں تو اُس کا جنازہ دھوم سے نکالیں۔

"عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"[2]

[1] برک (۱۷۲۹ء۔ ۱۷۹۷ء) انگلینڈ کا مشہور مقرر اور فلسفہ سیاست کا زبردست ماہر

[2] از اسپیچ نواب محسن الملک مرحوم در جلسہ حمایت اردو منعقدہ لکھنؤ ۱۹۰۰ء

اس مصرعے نے جلسے میں تلاطم برپا کر دیا اور مسٹر برک ابھی کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ گینو[1] کی گرج نے سب کو دم بخود کر دیا وہ بآواز بلند بولا۔

"...... لو سن لو! قانون قدرت کے خلاف جب دو چیزیں ایک جگہ اور ایک ہی وقت میں ہوں گی تو ان کے اتصال سے یقیناً حرارت پیدا ہوگی اور اس حرارت کا لازمی نتیجہ روشنی، آگ، بجلی یا مقناطیس ہے اس لیے ایک ہی ظرف زمان اور ظرف مکان میں سائنس اور آرٹ دو متضاد چیزیں بلا رگڑ پیدا کیے ہوئے نہیں رہ سکتیں۔"

گینو نے اپنی تقریر ۲ گھوڑے طاقت والی موٹر کی تیزی سے ختم کی جو سامعین میں ۲۵۰ والٹ برقی لہر دوڑا گئی اور حاضرین اپنے اندر گرمی اور حرارت محسوس کرنے لگے لیکن عین اس وقت مسٹر برک گرجتے ہوئے کھڑے ہوئے اور انھوں نے سوال کیا

"کیا آزادیٔ تقریر انسان کا اصولی حق نہیں اگر ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ مسٹر گینو کیوں مداخلت بیجا کے مرتکب ہوئے اور کیا وہ اسی جلسے میں غیر مشروط معافی مانگنے کے لیے تیار نہیں؟"

مسٹر برک کے اس پوائنٹ پر زبردست بحث چھڑی اور دونوں پارٹی کے لوگوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں ایسے عجیب وغریب الفاظ سننے میں آئے کہ جو "ویبسٹر" کی ڈکشنری یا کسی "فرہنگ" میں بھی نہ ملیں غرض ایک عجیب ہیجان اور انتشار کے بعد پریسیڈنٹ کی آواز غالب آئی اور جلسے میں جب امن و سکون قائم ہو گیا تو ملتھس[2] تقریر کرنے کھڑا ہوا اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر اس نے اس طرح کہنا شروع کیا:-

[1] گینو مشہور فرنچ سائنس داں اور ماہر علم البرق
[2] ملتھس (۱۷۶۶ء تا ۱۸۳۴ء) پادری اور اقتصادیات کا مشہور ماہر تھا اور اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ شادی بیاہ میں کمی کی جائے ورنہ توالد و تناسل کا لازمی نتیجہ عالمگیر قحط سالی و گرانی ہو

"اخوان ملت! اب بیسویں صدی کا وہ نامبارک وقت آ پہونچا ہے۔ جب آرٹسٹ کیڑے مکوڑوں کی طرح تعداد میں بڑھ رہے ہیں اور ہر وہ شخص جس میں ادنیٰ صلاحیت بھی موجود ہے ایک نہ ایک تصنیف کا باپ بننے کے لیے آمادہ نظر آتا ہے۔ لیکن اب ضرورت ہے کہ اس بڑھتی ہوئی تعداد کو کم کیا جائے ورنہ وہ وقت یقیناً آنے والا ہے جب دنیا میں کاغذ و قلم کا نقصان ہوگا اور مولفین و مصنفین بھوکے کتوں کی طرح ایک دوسرے کا نوالہ چھینا کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آرٹ اپنی جگہ سائنس کے حوالے کر دے اور خود گوشۂ امن و عافیت میں بیٹھ رہے"

ورڈسورتھ۔ ملٹن۔ اڈیسن اور دوسرے لوگوں نے اس معاندانہ اور مخالفانہ تقریر کی مخالفت اور آرٹ کی ضرورت و اہمیت کے سمجھانے اور بتھانے کی کوشش کی چنانچہ ان مقرروں کی جادو بیانی نے ملتمس کا رنگ جمنے نہ دیا۔ اور وہ اپنا سا منھ لے کر چپ ہو رہا۔

پرستار سائنس کی خاموشی نے فدایان آرٹ کے حوصلے بڑھا دیے اور وہ سائنس کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ و تیار ہو گئے۔ چنانچہ جب ووٹ لیے گئے تو دو ایک کے سوا سب نے اعلان جنگ کا ساتھ دیا۔ اور متحدہ فیصلے سے یہ قرار پایا کہ کل ہی سائنس کے کیمپ پر حملہ کر دیا جائے اس عزم نے حاضرین میں ایک نئی روح پھونک دی اور شعراء کے ترانہ ہائے جنگ نے آتشِ غضب کو بھڑکا دیا اس موقع پر شعراء کے جذبۂ تیز کا سن لینا خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

ہومر سے (گینو کو مخاطب کرکے)

"بگڑوں تو ابھی نقش فنا تجھ کو بنا دوں — ہوں حرف غلط صفحۂ ہستی سے مٹاؤں
سب فوج کو شمشیر کی آتش سے جلا دوں — آجاتا ہے پر رحم کہ ایذا تجھے کیا دوں"

ملٹن سے (مسٹر برک کی تقریر سے متاثر ہو کر)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
آئے جھلک ہر گلِ تر کی بجلی مرے نزدیک — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

شیلے سے

قبائے گل کو پھاڑے جب مرا گل پیرہن بگڑے
بن آئے کچھ نہ غنچے سے جو غنچہ دہن بگڑے

کارنج سے

بلند ہووے اگر کوئی میرا شعلۂ آہ — تو ایک اور ہو خورشید آسماں کے لیے
اشارہ چشم کا میرے یکایک سے سنائیں — ہو اک بہانہ تری مرگ ناگہاں کے لیے

ٹینی سن سے

کرے جس جگہ زور بازو نمود — دلِ آہن اس جا پہ ہووے کبود
چلے تیغ گر میری روز مصاف — نظر آئے دشمن سے میدان صاف
اگر بے حیائی سے کوئی عدو — ملا دیوے اس تیغ سے منہ کبھو
تو ایسے ہی کھا کر گرے سر کے بل — کہ سر پر کھڑی اس کے رووے اجل

چند روز دگر چشمۂ آفتاب ہے
رانگیختن آتش زدریائے آب ہے

میں اس جنگ کا تماشا دیکھنے اس میدان میں گیا جہاں آرٹ اور سائنس کی قسمت کا فیصلہ اور ہومر نیوٹن کی زور آزمائی کا اکھاڑا سجنے والا تھا۔ وہاں پہونچا تو سائنس کے خیمے کی طرف جانا چاہا لیکن ایک سنتری نے روک دیا اور ایک سائن بورڈ دکھایا جس پر لکھا تھا "بلاضرورت داخلے کی اجازت نہیں"۔ میں بے نیل و مرام واپس آیا اور افسوس ہے کہ سائنس کی خفیہ تیاریوں کا پتہ نہ لگا سکا۔ لیکن آرٹ کے خیمے میں آکر میری مایوسی مسرت سے بدل گئی کیونکہ یہاں کی تیاریوں کا پورا پورا حال ہمیں مل گیا اور میں ان کی پیش بندیوں کا جائزہ لے سکا۔ دیکھا تو مورخین دفتر کے دفتر سیاہ کر رہے ہیں کہ دشمنوں کے سروں پر پھینک کر اُن کو اس تودۂ عظیم کے نیچے دبا دیں۔ اقتصادیات والے جنگ آزماؤں کی پوزیشن اور راشن کا انتظام درست کر رہے ہیں۔ فلسفی تخیل کا بحرِ بے پایاں کھود رہے ہیں کہ فرعون بے سامان سائنس دانوں کو اُس میں غرق کر دیں۔ شاعر اپنے آنسوؤں کے تار سے سائنس کو لپیٹ لینا چاہتے تھے یا یوں کہیے کہ آنسوؤں کا دریا بہا کر اُن کو ڈبو دینا چاہتے تھے۔ ملٹن "جنت گم شدہ" کی یاد میں رو رہا تھا۔ ہومر اپنے ہیروز کی یادآوری کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔ مصور اور نقاش خوشنما اور دلکش تصویروں سے سائنس کا دل موہ لینا چاہتے تھے۔ ظریف اپنے تیر سنبھال رہے تھے کہ سائنس والوں کو ہنسی میں اڑا دیں۔ رزم کے شیر رجز خوانی میں مصروف

منتظر شیروں کی طرح گرج کر سائنس اور آرٹ کی دل فوج کو برباد کر دینا چاہتے تھے غرضیکہ

ہر جگہ یعنی نفسی نفسی کا عالم تھا اور قیامت کا بازار گرم ہو رہا تھا

دو لشکر بہم برکشیدند کوس

چو شطرنجی از عاج و از آبنوس

وقت مقررہ پر جنگ کا بازار گرم ہو گیا اور دونوں طرف کے سردار زور آزمائی کا تماشہ دکھلانے لگے۔ چنانچہ اقلیدس نے متقس کے مرکز دماغ کا کچومر نکال دیا۔ لیکن عین اُسی وقت "دائیٹ برٹ" نے بڑھ کر "دائرۃ المعارف" کی بھاری جلد اقلیدس کے سر پر اس زور سے ٹیک دی کہ بیچارہ اپنے نقطے سے ڈگمگا گیا اور سطح زمین پر آ رہا۔ شیلی نے گینو پر تیر چلایا لیکن اُس کا رُخ کارنت آرخود اُس کے گلے کا ہار ہو گیا۔ بوائل نے بائرن پر وہ درجہ حرارت پہونچائی اور وہ گیس بن آسمان پر اُڑتا نظر آیا۔ اتنے میں نیوٹن درخت سے کود کر آ پہونچا اور اپنے نظریے کا عملی ثبوت، لوگوں کے سر مرکز زمین پر گرا کر دینے لگا اور اُس نے آرٹ کے صفوں میں وہ تہلکہ مچا دیا کہ بائد و شاید لیکن سب سے عجیب تر تماشہ ایک مداری ڈارون نے دکھایا جس نے تمام انسانوں کو بندر بنا دیا اور کچھ ایسا شعبدہ دکھایا کہ سب اپنے حقیقی آباواجداد کو بھول کر بوزینہ بننے پر فخر کرنے لگے۔ ابھی مداری نے اپنا کھیل ختم بھی نہ کیا تھا کہ دائنامیٹ کے پھٹنے کی آواز آئی۔

دیکھا تو آرٹ کے خیمے ہوا میں اُڑ رہے ہیں اور جانباز سپاہی ادھر اُدھر بھاگے پھرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ آرٹ کو شکست کامل ہو گئی اور اُس کے

قدیم آلات حرب سائینس کے ڈائنامیٹ مشین گن۔ ہوئٹزر اور زپلین۔ وغیرہ کے مقابلے میں بالکل بیکار ثابت ہوئے۔ چنانچہ علم و حکمت کے پرانے خلیے جب نسیا ہو گئے تو زمین کو جائے امن نہ پاکر وہ تخیل کے بازوں پہ آسمان کی طرف اڑتے نظر آئے اور وہ ایسی بلندی پر پہونچ گئے جہاں سائینس کا پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ اس طرح دنیا کے اکثر حصے پر سائینس کا قبضہ ہو گیا اور آرٹ آسمان تخیل پر شاہ خاور بن کر مادیت کے تاریکی میں روشنی کی کرن پیدا کرنے لگا۔

افکار آزاد

(از علامہ آزاد سبحانی)

مایوس کیوں ہو ہمت دورِ جہاں یہ کبتک ۔۔۔ جورِ نہاں یہ کبتک قہرِ عیاں یہ کبتک

گھبرا نہ طائرِ دل پھر رُت بدل رہی ہو ۔۔۔ آخر زمیں یہ کبتک اور آسماں یہ کبتک

گل پھر یہاں کھلینگے۔ پھر یاں بہار ہوگی ۔۔۔ پژمردگی کہاں تک دورِ خزاں یہ کبتک

کچھ ذکرِ عہدِ گل بھی اے خوش بیانِ گلشن ۔۔۔ اک قصۂ کہن ہو ذکرِ خزاں یہ کبتک

ان نوحہ خوانیوں سے اکتا گئی طبیعت ۔۔۔ پھولوں کی ڈالیوں میں تو سوز خواں یہ کبتک

آخر کوئی خدا ہے تو ہے کسی کا بندہ ۔۔۔ پھر کفرِ ناامیدی او بدگماں یہ کبتک

دھونا ہو ہاتھ دھو لے یہ بہہ رہی ہو گنگا ۔۔۔ او ناشناسِ فرصت عمرِ رواں یہ کبتک

دوپہر ڈھل چکی ہو اب تیز بڑھ مسافر ۔۔۔ ہر ہر قدم پہ رہرو اٹکھیلیاں یہ کبتک

سورج نکل چکا تو اب تک ہو کروٹوں میں ۔۔۔ او مستِ لاابالی خوابِ گراں یہ کبتک

پھر دوڑ کر دکھا دے میدان ہے یہ تیرا

سہتا رہیگا غیروں کی گرمیاں یہ کبتک

کلام اکبر پر ایک نظر

از

جناب قمر الدین احمد صاحب بدایونی

گذشتہ سے پیوستہ

فلسفہ

۳ عشقِ حقیقی یہ ہے کہ انسان از خود رفتہ ہو کر اپنے کو دریائے معرفت میں ڈبا دے۔ بقول عارف شیراز ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں ۔۔۔ شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

سید اکبر حسین صاحب کہتے ہیں

جس کی آنکھیں ہیں وہ ہے دیوانہ چشمِ آفریں

عالمِ عرفاں میں جو ذی ہوش ہے بیہوش ہے

دیکھو ایک اہلِ خرابات کا بھی یہی اصول ہے ؎

جان جاتی ہے پلادے مُسرجوش مجھے ۔۔۔ ساقیا دوڑ کہ پھر آنے لگا ہوش مجھے

گویا ہوش کا آنا اُس کے لیے اتنا تکلیف دہ ہے جتنا کہ انسان کو جان کا نکلنا۔

صوفیِ باصفا کا بھی اچھا مذاق ہے

اس فلسفے میں ہوش کا آنا فراق ہے

حقیقتاً وصل اُسی کا نام ہے کہ انسان اپنے حقیقت سے ایسا خود فراموش ہے

کہ سوائے ذات باری کے اس کے دل میں کسی خیال کو قطعاً دخل نہ ہو اس شراب سے ہوش میں آنے کے معنے یہ ہیں کہ اس کو ما سوا کا خیال آنے لگے۔ جب ہوش کی وجہ سے خیال کو ما سوا کا احساس ہوا تو یہیں سے ہی معشوق حقیقی کا فراق ہوا۔

ہستی بے ثبات نے جان بشر کو کیا دیا۔

نفس سے حرص آگئی ہوش نے "میں" بتا دیا

بنا ہوں شاہ جنوں کی خوش انتظامی سے

خدا بچائے مجھے ہوش کی غلامی سے

واقعی سچے طالبان حق کا یہی مسلک ہے۔

گر جنوں آید بسو بہم رہ بدہ بیگانہ نیست ورخرد پرسد سراغ من بگو در خانہ نیست

حضرت منصور انا بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ

دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہو

للہ الحمد۔ اتنے دقیق اور پیچیدہ مسئلے کو کس غضب کی سادگی سے بیان کر دیا ہے۔ شبلی نعمانی کہتے ہیں "بڑے بڑے نامور شعرا کا اصل کمال یہی ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیال روزمرہ اور بول چال میں اس طرح سے ادا کرتے ہیں کہ گویا معمولی بات ہے۔" یہ شعر سید صاحب کے تعمقِ نظر کی ایک زندہ مثال ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرتِ منصور اگر شرابِ عرفان سے پورے طور پر مدہوش ہوتے تو انا الحق نہ کہتے کیونکہ "میں حق ہوں"۔ کہکر انھوں نے اپنی اور خدا کی ذات میں تفریق کر دی یعنی اُن کے اس

کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اور خدا کے وجود کو وجدا گانہ چیزیں تسلیم کرتے تھے۔ اگر اپنے وجود کا ہوش نہ ہوتا تو دوئی کو کبھی دخل نہ دیتے۔ جس اس ذات ہوش کی وجہ سے وہ سولی پر چڑھائے گئے ؎

کہتے جو دار پر منصور انا الحق غلط

خدا بنے تھے تو جینا بھی ان کو لازم تھا

آخر مصرعے کی خوبی ادا کی پوری تعریف نہیں ہو سکتی "دار" تک تکلیف فرمائیں" کہہ کر حضرت منصور کے احترام کا بھی خیال رکھا اور سولی دینے والے کی طرف سے معذرت بھی پیش کر دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ؎

مرغانِ خوش آہنگ اند در باغ سخن لیکن

نالیدن ایں بلبل شہ ۔ دگرے دارد

ایذا کا مجھے حس ہی نہ ہوا فریاد و فغاں میں کیا کرتا

جس وقت تہ خنجر تھا گلا آنکھ اپنی لی تھی قاتل سے

حضرت رابعہ بصری سے دریافت کیا گیا کہ تکلیف اور ایذا پر صبر احسن ہے یا شکر۔ فرمایا صبر یا شکر کرنے سے تکلیف کے احساس کا پتہ چلتا ہے۔ کمال محویت وہ ہے کہ انسان کو ایذا کا حس ہی نہ ہو۔ جب حس مفقود ہو جائیگا تو یہ سوال کہ صبر و شکر میں کس کو فضیلت ہے پیدا ہی نہ ہوگا۔ مولوی امیر احمد بدایونی کا شعر ہے ؎

صاعقہ نشاط سوز لذت بیخودی رہی خندہ ہر صرف زخم دل درد میں بھی ہنسی رہی

دنیا کے تغیر کا نہیں حس شیدائے جمال یاری کو پروانے کو مطلب شمع سے ہے کیا کام ہے رنگ محفل سے

کہتے ہیں کہ سچے طالب اُس معشوق حقیقی کی یاد میں ایسے محو رہتے ہیں کہ اُس کے سوا اُنھیں کسی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ باوجود دنیا میں رہنے کے اُن کی طبیعت عالم کے کسی مشغلے کی جانب رجوع نہیں ہوتی۔ پروانے کو خواہ آپ کیسے ہی آراستہ محل میں چھوڑ دیں۔ وہ نہ آرائش دیکھے گا اور نہ فرنیچر۔ ہمیشہ چراغ ہی پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرے گا۔ اسی طرح طالبانِ مخلص کی لَو خواہ وہ کسی حالت میں ہوں ہمیشہ نورِ جمال باری ہی سے لگی رہتی ہے کیوں نہ ہو ؎

تم کُن آنجناں کہ ندانم ز بیخودی   در عرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت

۴ مسئلۂ جبر و اختیار :۔

یہ مسئلہ علما اور فقہا کا ہمیشہ سے دار الحرب رہا ہے اور نتیجہ فیصلہ کُن اب تک نہیں نکلا۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ خدا نے جب بندے کو تخلیق کیا تو اُس کو فاعلِ مختار بنا دیا۔ اب جو کام بھی بندہ سے ظہور میں آتا ہے اُس کی اچھائی بُرائی کا وہ بندہ ہی ذمہ دار ہے۔ دوسرے لوگ بالکل اُس کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ خدا جب ایک چیز کا خالق ہوا تو اُس کے اثر کا بھی وہی خالق ہوگا۔ اگر آفتاب خدا کی مخلوق ہے تو اُس کی حرارت بھی خدا کی تخلیق کردہ مانی جائے گی۔ انسان اپنے فعل کا فاعل ہے۔ جب فاعل مخلوق ہے تو اُس کا فعل بھی مخلوق ہوا۔ قلب تمام اعضا کا بادشاہ ہے اور قلب کو خداوندِ عالم کے ساتھ وہی نسبت ہے جو اعضا کو قلب کے ساتھ ہے۔ اعضا صاحبِ فعل قلب کے سبب سے ہیں اور قلب صاحبِ ارادہ

خدا کی وجہ سے ہے۔ پس قصاص ہمارے افعال کی وجہ سے ہم پر عاید نہ ہونا چاہیئے ؎

نفس سے بچنے کی انساں چارہ جوئی کیا کرے۔
فطرتی رہبر یہی ہے اس کو کوئی کیا کرے

بر وزے ناصح و بر دُرد کشاں خُردہ مگیر کار فرمائے قدر میکند ایں من چہ کنم

خیام کا قول ہے ؎

ہر نیک و بدے کہ از من آید بوجود تو بر سر من نوشتۂ من چہ کنم

ان لوگوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ اور ہے جو کہ انسان کو مجبور محض جانتا ہے اور نہ فاعلِ مطلق۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انسان کچھ مجبور بھی ہے اور کچھ صاحبِ اختیار بھی۔ یہ درمیانی حالت عام پسند ہے۔ میر اکبر حسین بھی اسی درمیانی حالت کو پسند کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے بندے کو کچھ اختیار ضرور دیا ہے۔ اب یہ حکمیہ رائے لگانا کہ اس فعل کا مختار بندہ ہے اور اس کا خدا ایک امر پُر خطر ہے۔ یہ کہنا کہ ہمارے فعل کی وجہ سے ہم پر قصاص نہ عائد ہونا چاہیئے ایک بڑی غلطی ہے۔ خدا ہی نے تو آدمی کو مالدار بنا دیا اور پھر اسی نے فرمایا مَن ذَا الَّذِی یُقرِضُ اللّٰہَ قَرضًا حَسَنًا۔ یعنی کون ہے جو خدا کو قرض حسنا دے۔ حالانکہ مال اور مالدار دونوں اوسی کی ملک ہیں۔ تو اب لوگوں کا یہ قیاس کرنا کہ یہ کس طرح ہے اور کیوں ہے اور یہ ظلم ہے۔ یہ سب اُن کے عقل و فہم کے قصور کا باعث ہے۔ امور خداوندی قیاس انسانی سے باہر ہیں۔ تم کو کوتہ نظر نہ بننا چاہیئے۔ ذرا غور سے دیکھو کہ کون

کام بندہ کا ہے اور کون خدا کا۔ خدا بُرائی نہیں کرتا بلکہ اگر بندہ اپنے کو معرضِ ہلاکت میں ڈالتا ہے تو بسا اوقات تائیدِ ربانی اُسے آن کر بچاتی ہے ؎

ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر لیکن تیری رحمت نے گوارا نہ کیا

دل مبتلائے غفلت تو ہے محوِ دیرِ فانی
جو خدا کی یاد آئے تو اُسی کی مہربانی

سچ ہے ؎

آمادگی ہاں تو رہی ہر گناہ پر فضل خدا سے بُت ہی نہیں آئے راہ پر

حق تعالیٰ نے بشر کو کچھ دیا ہے اختیار
مولوی صاحب سے لیکن آدمی مجبور ہے

مولوی صاحب کی تنگ نظری اور زیادتیوں پر بقول جناب اسمٰعیل میرٹھی اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؎

کسی گروہ میں ہے ختم فاتحہ پر جنگ کہیں ہے محفل میلاد موجب تکرار
کہیں تو کفر کے فتووں کا چل رہا ہے گرپ کہیں ہے طعن ملامت کی ہو رہی بھرمار
گھٹی جو دور میں اُن کے تو راستی کی قدر بڑھی جو عہد میں ان کے تو ریش کی مقدار

ہے اختیار خود کو مختار تم سمجھ لو
لیکن ہوئے یقینی بے اختیار پیدا

اس شعر سے ایسے بادہ نخوت کے مستوں کی اصلاح مقصود ہے جن کا قول ہے کہ ہم اپنی قوت سے سب کچھ کر سکتے ہیں اور سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ خواہ کوئی کیسا ہی فرعونِ وقت بنے مگر پیدائش اور موت کے موقعے پر مجبوری کا اعتراف کرنا ہی

پڑتا ہے۔ ہائے ؎

جو برق و باد پہ قادر۔ یہ دیکھیے کہ انھیں اب ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں

امتحانوں سے ہوئی طے بحثِ جبر و اختیار

فیل جب ہو جائے مختار کیوں یا تو کہو جبر

کہتے ہیں کہ یہ سوال کہ بندہ کو خداوند عالم نے کس کام میں مجبور رکھا ہے اور کس کا اختیار دیا ہے۔ امتحانوں سے حل ہو گیا۔ یعنی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے واسطے کافی کوشش کرنا انسان کے اختیار میں تھا اور وہ اس کو کرنا چاہیئے۔ اس کوشش کے بعد بھی ناکامیاب رہے تو مجبوری ہے۔ پھر اس کی یہ ناکامیابی قسمت پر محمول کی جاوے گی۔ مختاری کے ذو معنی استعمال نے شعر میں جان ڈالدی۔ مراد یہ کہ جہاں تک بشر کے امکان میں ہو کوشش کرے۔ اگر اس میں کوتاہی کر کے اپنی ناکامیابی کو قسمت پر محمول کریگا تو اس سے جبر و اختیار کا صحیح مفہوم ادا نہ ہوگا ؎

میں نام نہ لوں گا اپنی خستہ حالی کا

جو بن پڑے گی مگر وہ اٹھا نہ رکھوں گا

کسی بزرگ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت ہم کو خدا نے کس بات کا اختیار دیا ہے اور کس میں مجبور رکھا ہے فرمایا کہ ایک پیر زمین سے اٹھا لو۔ اُس نے اُٹھا لیا۔ پھر کہا کہ دوسرا بھی اٹھا لو۔ اُس نے کہا کہ یہ تو ناممکن ہے۔ بھلا پہلا پیر زمین پر ٹیکے بغیر دوسرا کیسے اُٹھا سکتا ہوں۔ فرمایا کہ بس خدا نے تم کو پہلی بات کرنے کا اختیار دیا ہے اور اس دوسری میں مجبور رکھا ہے۔ اس معمولی

مثال سے اُن بزرگ کی مراد یہ تھی کہ اختیارات اور مجبوریوں کی کوئی شخص فہرست بنا کر پیش نہیں کر سکتا۔ ہر موقع پر انسان کی طبع سلیم بتا دیتی ہے کہ فلاں بات کی تکمیل اُس کے اختیار میں تھی اور اُس کی کمی کوشش کی وجہ سے نامکمل رہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل حصار فہم و فراست وہ ہے کہ ہر موقع پر غور کر کے جبر و اختیار کی درمیانی حد فاصل تک پہونچ جائے ؎

دنیا کی طوالت ہے بیحد خلقت کا تو لمبا قصہ ہے
ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں مرا کیا حصہ ہے

انہیں مسائل پر غور کرتے کرتے جب تھک جاتے ہیں تو ایک جگہہ گھبرا کر بول اُٹھتے ہیں ؎

کیا خدا کی قدرتیں کیا مصلحت کیا شان ہے ۔۔۔ غور کتنا ہی کرو یہ بھید کھلتے ہی نہیں

کلام نواب

دور ہو دنیا کہ تجھ سے آرزو کچھ بھی نہیں ۔۔۔ نام سے ظاہر ہوا تیرے کہ تو کچھ بھی نہیں
دے تو ایسی دے کہ پھر محشر میں بھی آئے نہ ہوش ۔۔۔ ساقیا یہ جام تیرا یہ سبو کچھ بھی نہیں
اُس پہ مر مٹنا ہی اپنی زندگی اے خضر ہے ۔۔۔ آب حیواں کے لیے یہ جستجو کچھ بھی نہیں
دل سے نقش غیر دھو ڈال ایک لمحہ کے لیے ۔۔۔ پنجوقتہ شیخ جی یہ شست و شو کچھ بھی نہیں
محفل اعدا میں کیونکر کہیں تجھ سے کہ ہائے ۔۔۔ چاہنے والوں کی تیرے آبرو کچھ بھی نہیں
"خنجر تسلیم" سے نواب گھائل ہیں جو دل ۔۔۔ ذبح کو اُن کے یہ خنجر بر گلو کچھ بھی نہیں
خوب رقص بوزنہ کر واہ بس رہنے بھی دے ۔۔۔ تجھ سے اب اے ارتقائی گفتگو کچھ بھی نہیں
ڈھونڈھتا ہے کس لیے ذرات عالم میں اسے ۔۔۔ روح میں مانند آب تھا گر رنگ و بو کچھ بھی نہیں

اکیسویں صدی کے ایک شخص کا روزنامچہ

از جناب مولوی عبدالواحد صاحب ایم اے علیگ

ہر شخص کو معلوم ہے کہ دنیا کتنی سرعت سے مادی ترقی کی طرف مائل ہے اور کتنے مدارج آنکھوں کے دیکھتے ہی دیکھتے طے ہوگئے ہیں۔ ہر آنے والا دن ایک نئی ایجاد کی خوشخبری دیتا۔ اگر اسی حال سے دنیا بڑھتی رہی تو ایک سو سال کے بعد نہ معلوم کیا سے کیا ہو جائے گا۔ ذیل میں ایک اگلی صدی کے رہنے والے کے روزنامچے کا اقتباس فرضی طور سے درج کرتے ہیں۔

تاریخ یکم ماہ ششم ۲۰۱۶ء۔ آج سورج کل کے مقابلے میں ۲ لمحہ ۴ ثانیہ ۳۲۳۴/۱ دقیقہ پہلے نکلا ہے۔ آج کل میں اپنی سوانح عمری سوچ رہا ہوں اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ آنے والی نسلیں ہم سے نصیحت حاصل کریں۔ بلکہ صرف اس قدر ہے کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ گذشتہ نسلیں آنے والی نسلوں سے کس قدر پیچھے تھیں۔

میں فضائے ہندوستان میں نو وارد ہوں۔ ٹھیک اس جگہ جہاں کسی زمانے میں قدیم شہر دہلی آباد تھا۔ اس سے ۴ ہزار فیٹ کی بلندی پر میرا مسکن ہے۔ ہمارے شہر کا نام چونکہ اس کا تعلق قدیم دہلی سے ہے نئی دہلی

ہی حکومت نے دس سال سے انتظام جدید یہ کیا ہے کہ اگلے زمانے میں دیہاتوں اور قصبوں کی آبادی کا جو دستور چلا آتا تھا اُس کو منسوخ کر دیا اور اہلِ قریہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے گاؤں کو چھوڑ کر اور زمین کو ہموار کر کے بڑے بڑے شہروں میں سکونت پذیر ہوں۔ اس حکم کی وجہ سے لاکھوں میل مربع زمین کی بچت ہو گئی ہے اور مزارعین کی آسانی کے لیے ہر جگہہ ہوائی جہازوں کا معقول انتظام کر دیا ہے جو اُن کو اُن کی زمین تک تھوڑے عرصے میں پہنچا دیتے ہیں اور شام کو ان کو واپس لے آیا کرتے ہیں:۔ صناع اور دستکار جن کو زراعت سے کچھ تعلق نہیں ہے وہ فضا میں رہتے ہیں۔ ان کے شہر جس طرح کہ نئی دہلی آباد ہے۔ ہوا پر قائم ہیں ہر شہر کے دو بڑے حصے ہیں ایک ذکور کے واسطے اور ایک اناث کے واسطے اور یہی حال اب نیچے کی آبادیوں کا بھی ہے۔ ہر شخص کے متعلق کچھ فرائض ہیں۔ جو اس کو انجام دینے پڑتے ہیں۔ اور ایک ایک لمحہ کا حساب حکومت کو دکھانا پڑتا ہے۔ جس نے کچھ فروگذاشت کی وہ نیچے بھیجا جاتا ہے اور اس کو مشقت سخت کرنا پڑتی ہے۔ یہ ہی حال فرقۂ اناث کا ہے۔ سب سرکاری ملازم ہیں اور اُن کو بھی ان کے لائق کام دیا جاتا ہے: ارتباط ذکور اور اناث اطبار کے مشورہ سے ہوا کرتا ہے اور حسب ضرورت دونوں طبقوں کے نفر ایک خاص جگہہ ایک وقت معینہ کے لیے روانہ کر دیئے جاتے مگر وہ وہاں بھی بیکار نہیں رہتے۔ جو اولاد اس کا نتیجہ ہوتی ہے وہ سرکار کی ملکیت ہوتی ہے۔ والدہ کو اولاد وضع کرنے کے بعد ہی سرکار کے حوالے کرنا پڑتی ہے۔ یہ اولاد اول دن سے حکومت

کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتی ہے اور ابتدا عمر سے وہ جس کام کے لائق ہے اس کی تلقین کی جاتی ہے یہ حال نیچے کی آبادی کا ہے مگر چونکہ زراعت پیشہ لوگوں کے واسطے نیچے کی آبادی مخصوص ہے۔ اسی لیے ان کی اولاد کو مذکورہ بالا اصولوں پر پرورش کرتی ہے۔ سوائے زراعت کے کسی چیز کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ آج خبر کرنے کے آلے نے اطلاع دی کہ رات کو اس شہر کے مشہور حکیم و فیلسوف نے اس دنیا سے مفارقت کی۔ وجہ یہ بتلائی کہ شام کو اپنے خلوت خانے میں بیٹھے ہوئے دوربین کے ذریعے سورج کے داغوں کی پیمائش کر رہے تھے ان کے عمق کا اندازہ لگا رہے تھے اور تحریر کرتے جاتے تھے۔ آخری تحریر اُن کی یہ تھی کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اس فکر میں رہا کہ کسی طریقے سے دنیا کو سورج کے دھبوں کے اثر سے محفوظ رکھوں اور میں نے اپنی ۸۰ سال کی عمر میں سے پورے ۵۲ سال اسی کوششوں میں صرف کیے مگر آج دورانِ معائنۂ شمس مجھ کو یہ یقین ہو گیا کہ میں ایسا کرنے سے قاصر ہوں۔ لہٰذا میں اس دنیا کو اپنے بیکار بوجھ سے تکلیف نہیں دینا چاہتا اور اب رخصت۔ اس خبر کے بعد ہی حکومت کی جانب سے یہ اطلاع بھی موصول ہوئی کہ حسب وصیت حکیم مذکور اس کا جسم اور دماغ حکومت کی ملکیت ہو گیا ہے۔ لہٰذا جو علم کے شائق اس کے دماغ یا کسی عضو بدن سے مستفید ہونا چاہیں ان کو موقع دیا جاتا ہے کہ اس اطلاع کے پاتے ہی حکومت کو مطلع کریں۔ چنانچہ میں نے بھی ایک قیراط بھیجنے کے لیے درخواست دیدی ہے۔ میں علمیت کی

جراثیم کو اس دماغ سے علیحدہ کرکے ٹھیک اسی جگہہ آلے کے زور سے پہونچا دونگا جہاں سے ان جراثیم کا تعلق ہے۔ میرے دماغ میں کمزوری اس معنے کر ہے کہ میں رنگوں کی تفریق اور مناسب تدریج نہیں کرسکتا۔ لهذا مجھ کو اس خانہ دماغ کے لیے درخواست دینا چاہیئے۔

چنانچہ میں نے آج دس بجے ٹھیک درخواست دیدی۔ مجھ کو امید ہے کہ شام تک میرے پاس میرا مطلوب حصّہ دماغ آجائے گا۔

اب میرے نہانے کا وقت آگیا ہے۔ میں جانتے ہی برقی رو سے جو میرے جسم کے اندر سے بنائی گئی ہے مستفید ہوں گا اس کے بعد مجھ کو غذا کی طرف توجہ کرنا پڑے گی اور اس آلے کے قریب جاکھڑا ہونا ہوگا۔ جس سے تعلق پیدا کرنے سے جراثیم غذا بدن میں حلول کرجاتے ہیں۔ ان دونوں باتوں میں مجھ کو پانچ لمحے لگا کرتے ہیں۔ آج شام کو میرے ایک دوست نے میری دعوت کی ہے: اور حکومت کو اس کے متعلق تحریر کردیا ہے۔ حکومت کی جانب سے اطلاع آئی ہے کہ آج ٹھیک ۸ بجے شام کے تم کو آلۂ غذا کے قریب اس سے مستفید ہونے کے لیے کھڑا ہونا چاہیئے اور پانچ لمحے اس امر کے لیے تم کو ملیں گے۔ آلۂ تکلم کے ذریعے تم اپنے دوست مولوی فلاں کے ساتھ دوران غذا میں ہم کلام ہوسکو۔ میں اس کا شکریہ حکومت کو ادا کرچکا ہوں اور اس کے ساتھ فرمائش بھی کردی ہے کہ اُلٹی آنت اور سینے تک پہونچے ضعف کو دور کرنے والی مناسب غذا مجھ کو دعوت میں ملنا چاہیئے۔ ۴ بجے شام۔ اطلاع آگئی کہ ایسی غذا کا انتظام رہے گا۔

آج کل بڑی سہولیت یہ ہے کہ غذا تیار شدہ حکومت کی جانب سے ملتی

ہوتی ہے اور زور اس عضو پر زیادہ دیا جاتا ہے جہاں ضعف ہے۔ یہ

وقت کی کتنی کفایت ہوتی۔ لیکن میں بیسویں صدی میں ہوتا تو آج شام کی

دعوت ہی میں آدھ گھنٹہ میرا بالکل بیکار چلا جاتا۔

مجھ کو افسوس ہے کہ میں یہاں زیادہ نہیں لکھ سکوں گا کل ٹھیک

۱۱ بجے دن کے ہمارے مجھ کو قطب جنوبی سے ۴۵ درجہ جانب مغرب

ایک جزیرہ پر جانا ہے۔ یہ سفر اگر ہوا موافق ہوئی تو پورے ۲ گھنٹے لیگا

ورنہ ۲۰۔۲۵۔ لمحے زائد کل مجھ کو بہت سے لوگوں سے گفتگو کرنے کا

اتفاق ہوگا۔ یہ سفر مجھ کو اس واسطے کرنا پڑا کہ اس جزیرے کے کنارے

سمندر میں آج سے ایک ہفتے بعد ایک نہایت دلچسپ زلزلہ آنے والا ہے

اور میں اور میرے معزز دوست اس اخراج حرارت ارضی کو بیکار

ضائع ہونے سے بچانے کے واسطے اتنی تکلیف گوارہ کریں گے۔

کل کے دلچسپ سفر کی خوشی میں مجھ کو خوف ہے میں نیند لانے کی کل

سے زیادہ دیر تک مستفید نہ ہو سکوں گا۔

۷ تاریخ چھٹا مہینہ۔ مجھ کو خوشی ہے کہ جس غرض سے مجھ کو سفر اختیار

کرنا پڑا ہے اس میں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اس وقت سے

صرف ۲۴ گھنٹے ۱۲ لمحے اور ۳ دقیقے رہ گئے ہیں مگر انہماک میں ہم کو

اتنی دیر معلوم بھی نہ ہوگی۔

آج مجلس متعلق انتظام خوراک نے اس امر کا فیصلہ کیا ہے کہ آج صبح کو

آلہ غذائیت کے ذریعے سے مچھلیوں کے دماغ کے ست کا ہمارے

بدنوں تک اندر پہونچایا جائے تاکہ کل ہر شخص کا دماغ اس جوہر کی سیرابی سے ایک نیا جوہر شکل کام کا مستعدی سے مقابلہ کر سکے۔ ایک صاحب نے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ۲۴ گھنٹے قبل اسی طرح کی غذا کا انحلال نیا ہر کوئی فائدہ نہ دے گا۔ لہذا یہ امر کل صبح کے لیے ملتوی کر دیا جائے مگر چونکہ مخالفین کی رائیں کم تھیں اس کا بظاہر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور ہمکو مچھلیوں کے دماغوں کا جوہر آج ہی قبول کرنا پڑے گا۔ یہاں ہر دُنیا کی سلطنت سے نمایندے آتے ہیں۔ اس کا اندازہ پیشتر ہی سے کیا جا چکا تھا کہ کس قدر حرارت خروج کرے گی۔ ان کے انتیاز سے اس حرارت کے جذب کرنے اور مسخ کرنے کے آلات ہر قوم کا نمایندہ لایا ہے۔ یہ آلہ ہر اُس قوم کی ایجاد ہے جس کی اپنی حکومت کا نمایندہ ہوں۔

آج مجکو آرام کے وقت دو آلوں سے کام لینا پڑے گا۔ ایک نیند لانے کا دوسرا خیال کو ایک مرکز پر لانے کا آلہ۔

۱۸ تاریخ۔ آلۂ پرواز الوقت ۰۰ ۳ میل فی گھنٹہ جا رہا ہے۔ اب میں اپنے مستقر سے صرف آٹھ سو میل دور رہ گیا ہوں۔

۲۳ آج شام کے ۵ بجکر ۲۳ لمحے پر میں حکومت کی کتاب پیدائش کی رو سے پورے ۲۴ برس کا ہو جاؤں گا۔ تعلیمی عمر میں ایک سال کا فرق رہتا ہے۔ تعلیمی عمر کے اعتبار سے ۲۳ سال کا کہلاؤں گا۔

۲۵ تاریخ چھٹا مہینہ چوتھا دن۔ آج ہوا کی رفتار ۳۴ میل فی گھنٹہ ہے۔ اور برودت ۴۰ درجہ:۔

آج ٹھیک پانچ بجے شام ۴؎ مجھ کو حکیم فلاں سے بغرض مبارکباد ہمکلام ہونا ہے۔ حکیم موصوف ایک سخت مرض میں مبتلا تھے اور ان کی زیست کی نسبت عوام کو شبہ ہوگیا تھا۔ وجہ اس علالت کی یہ بتلائی جاتی ہے کہ ابتدا اسے مرض سے ایک روز پیشتر اپنی تفریح کے اوقات میں رات کے ٹھیک ۹ ۴؎ بجے مریخ کے چار چاندوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مریخ کا ایک چاند اس سے کتنی قریب آ گیا ہے۔ حکیم موصوف نے اس کا عینی مشاہدہ کیا اور اندازہ لگایا کہ یہ چاند اس رفتار سے روز بروز مریخ کے نزدیک ہوتا جاتا ہے اور فلاں دن اور فلاں وقت اور فلاں سال اسکا تصادم مریخ سے ہو جائے گا چنانچہ اس فکر کے مارے ان کے ہوش خطا ہوگئے اور دو روز تک اسی حال میں رہے۔ مگر جب آلۂ کلام کے ذریعے اُن کے کان میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ اس وقت تک باقی نہیں رہیں گے تو اُن کو اطمینان ہوگیا اور وہ اب روزمرہ کے کاموں میں قدیمی انہماک کے ساتھ مصروف ہیں۔ آج شام کو اسی صحت یابی کے متعلق بذریعۂ آلۂ کلام مجھے ان کو مبارکباد دینا ہے۔

۸ر تاریخ۔ حکیم فلاں جو ستارہ سنیچر کے متعلق دنیا میں سب سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں ان کے متعلق یہ خبر موصول ہوئی ہے کہ کثرت استعمال سے ان کی سیدھی آنکھ مضمحل ہوگئی ہے۔ چنانچہ حسب ہدایت اطبا وہ آنکھ بالکل نکال لی گئی اور حکومت کی جانب سے ایک آنکھ نیچے کی آبادی کی لیکر ان کو پیش کش کی جائے گی۔ جراحوں کو یقین ہے کہ نئی آنکھ ان کے لیے مفید ہوگی اور دو روز میں وہ اپنی قدیمی خدمات مستعدی سے انجام دینے کے قابل ہو جائیں گے۔

۴ تاریخ۔ ساتواں مہینہ۔ آج صبح سب سے بڑی خوشخبری یہ ملی کہ اہل مشرق قریب نے جو ۷ سال سے مینہ برسانے کی کل ایجاد کرنے کی فکر میں تھے آخرکار کامیاب ہو گئے۔ موبد کا قول ہے کہ اب تک فضا میں جو ابر کے ٹکڑے آزاد پھرا کرتے تھے۔ اور جب جی چاہتا تھا برس جاتے تھے اور جہاں چاہتے برستے اور جہاں سے چاہتے بلا بارش اُڑ کے چلے جاتے تھے۔ اب آزاد نہ رہنے پائیں گے۔ وہ اب انسان کے محکوم ہو کر رہینگے اور جہاں ضرورت دیکھی جائے گی ان کو نچوڑ دیا جایا کرے گا موجد کو دعوےٰ ہے کہ آسمانی بجلی کا خدشہ اس نئی ایجاد سے بالکل دفع ہو جائے گا اور اب تک جو بجلی بیکار جاتی تھی اُس کو خانگی امور میں آسانی سے خرچ کر لیا جائے گا۔

غزل

دل کو منظور رہی مجبورِ وفا ہو جانا — منزلِ عشق میں راضی برضا ہو جانا

آئے جب کوچۂ جاناں کی طرف سے ہو کر — میری تربت پہ بھی اے بادِ صبا ہو جانا

اٹھو من جاؤ کہ تھوڑی سی رہی ہے یہ رات — صبح ہوتے ہی مری جان خفا ہو جانا

ناتوانی سے ہے کروٹ بھی بدلنا دشوار — معجزہ ہے مری آہوں کا رسا ہو جانا

وصل میں بھی یہ تکلف ہے کہ ملتی ہی نہیں — کس سے سیکھا ہے مری جان خفا ہو جانا

بیقراری کی ہے تصویر ہمارا جینا — موت ہے جذبۂ اُلفت کا فنا ہو جانا

جان جائیگی کوئی سہل نہیں کھیل ہیں — تیر کا سینۂ بسمل سے جدا ہو جانا

نالۂ دل کو یہ تاکید اثر ہے شبِ ہجر — کم سے کم آج تو دشمن کی دعا ہو جانا

سو قیامت کی ہے یہ ایک قیامت ہاتف — کسی معشوق کا عاشق سے جدا ہو جانا

لازمی اور جبری تعلیم پرائمری کا اثر مسلمانوں پر

[illegible] مسٹر محمد [illegible] خان صاحب

تعلیم کے معاملے میں مذہب اسلام شروع سے جبریہ شان رکھتا ہے۔ اس کا یہ حکم اول دن سے ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت کو سنایا جاتا ہے کہ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

یہ حدیث شریف خاص بانیٔ اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے ادا ہوئی ہے اور اس کی بنا پر ہر مسلمان مرد و عورت تعلیم کے لیے مجبور ہے یعنی علم حاصل کرنا اُس پر واجب اور فرض ہے۔ اگر وہ تحصیل علم میں کوتاہی کریگا تو بانیٔ اسلام کے جبریہ حکم کی نافرمانی کی سزا اس پر عائد ہوگی۔

اسی طرح دوسری جگہہ بانی اسلام نے فرمایا ہے۔ اطلبوا العلم ولو کان فی الصین علم تلاش کرو چاہے وہ چین (جیسے دور) ملک میں ہو۔ عربی زبان کے قاعدے کی رو سے امر کا صیغہ جس مقام پر استعمال ہو۔ اس بات کا واجب ہو جانا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس حدیث میں چونکہ اطلبوا صیغۂ امر ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بانیٔ اسلام نے حصول تعلیم کو واجب اور جبریہ قرار دیا ہے۔

ایسی ہی اور بہت سی حدیثیں ہیں۔ جن میں تعلیم کے وجوب کا ثبوت ملتا ہے اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اسلام ابتدا سے جبری تعلیم کا حامی ہے اور عورتوں اور مردوں کو یکساں تعلیم پر مجبور کرتا ہے۔

پس اس ملک ہندوستان میں بھی ہر مسلمان مرد و عورت کو حکم اسلام کے بموجب جبری اور لازمی تعلیم کا حامی ہونا چاہیئے۔

۲

مذہبی حکم کے ساتھ ہی مسلمانوں کو اپنے تمدنی اور جغرافی حالات کا دیکھنا اور ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اُن کی رو سے وہ موجودہ جبری اور لازمی تعلیم سے کہاں تک فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور جبری تعلیم ان کو مفید ہے یا نہیں۔ اس تفتیش کے لیے ان کو علم کی ماہیت پر پہلے غور کرنے کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ علم کا لفظ جس کے حاصل کرنے پر مسلمان مذہباً مجبور کیے گئے ہیں بہت وسیع ہے اور آسانی سے یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ فلاں چیز اس دائرہ علمی کے اندر ہے جس کا حاصل کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

علم کی تعریف لفظ دانستن سے کی جاتی ہے یعنی کسی چیز کا جاننا اور معلوم کرنا علم ہے۔ پس علم کتابوں پر محدود نہیں ہے اس کے لیے دماغی ذہنی اور آنکھ کے مشاہدات بھی کافی ہو سکتے ہیں۔

۳

ہندوستان کے اکثر تعلیمی مبصروں نے تسلیم کرلیا ہے بلکہ وہ اس کی ضرورت پر شدت سے اصرار کرتے ہیں کہ یہاں جبری اور لازمی تعلیم کا رواج ہونا چاہیئے۔

مگر جبری تعلیم مسلمان قوم کے موجودہ افلاس اور پراگندہ حالی کے ایام میں ایک حد تک قابلِ غور ہے۔ مسلمانوں کے بچے ہوش سنبھالتے ہی معاش حاصل کرنے کی

فکر میں مصروف ہو جاتے ہیں اور اپنے غریب والدین کو اپنی محنت سے مدد پہنچاتے ہیں۔ جبری تعلیم کا نفاذ اس قسم کے افراد پر ہوا تو بجائے تعلیم فائدے کی جگہ ایک طرح کی بددلی اور بے اطمینانی پیدا کرے گی لہذا تعلیم کے جبر میں ایسے طبقوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا اور وہ یہی ہے کہ مفلس بچوں کے لیے نائٹ اسکول جاری کیے جائیں تاکہ دن کو معیشت حاصل کرنے میں اُن کا حرج نہ ہو۔ اور جیسا کہ اس پر اشارہ کیا گیا ہے۔ ان بچوں کے لیے کتابی کورس کی جگہ دماغی اور ذہنی نصاب تعلیم بننا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ محکمۂ تعلیم ایسے لائق اُستاد مہیا کرے جو غریب بچوں کو زبانی لکچروں کے ذریعے سے تعلیم دیا کریں۔ اگرچہ اس میں ان کو لکھنے اور پڑھنے کی لیاقت پیدا نہ ہوگی۔ لیکن معلومات کی ترقی جہالت کی پستی سے بہت درجے تک ان کو نکال سکے گی۔

۴

غریب اقوام کے بچوں کو ایسے پیشوں کی تعلیم دی جائے جو ان کی معاش میں مفید ہو سکتے ہوں۔ سارے ملک کو نوکر بنانے کی تعلیم کچھ بھی مفید نہ ہوگی بلکہ اس سے نقصان ہوگا۔

محکمۂ تعلیم کی ذمہ داریاں اس تفریق عمل میں یقیناً حد سے بڑھ جائیں گی مگر تعلیم دشواریوں کی چیز ہے۔ اس کے لیے سب کچھ برداشت کرنا چاہیئے۔

صوبوں کی خصوصیات اور باشندوں کے تمدنی اور جغرافی خصائل کا مطالعہ کرنے کے بعد طرزِ تعلیم کا مقرر کرنا آسان ہو سکتا ہے۔

ہندو مسلمانوں اور تمام اقوام کی مشترکہ تعلیم کا اصولی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ صفائی اور حفظان صحت کے طریقے شروع سے ان کے ذہن نشین کیے جائیں اور اس کے بعد حلال روزی کمانے کے ذریعے بتائے جائیں۔

۵

ان تفصیلات کے بعد آسانی سے جواب دیا جا سکتا ہے کہ جبری اور لازمی تعلیم کا اثر مسلمانوں پہ بہت اچھا ہوگا۔ اور مسلمانوں پر تعلیم کے لیے جبر کرنا ایک طرح ان کے مذہبی حکم کی تائید ہوگی۔ جیساکہ اوپر بتایا گیا ہے۔

جبری اور لازمی تعلیم کے اثر سے مسلمان بچوں کی موجودہ بیکاری اور آوارگی دور ہو جائے گی جس میں آج کل وہ عموماً مبتلا پائے جاتے ہیں۔
جبری تعلیم ان کے دماغی قویٰ کو اطاعت کا سبق پڑھائے گی۔ اور اطاعت ہی وہ چیز ہے جس سے قومیں بنتی اور سنورتی ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ خرابی کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے دلوں سے اطاعت کا مادہ کم ہوگیا ہے جبری تعلیم پھر اس کو واپس لا سکتی ہے۔ کیونکہ تعلیم کا جبر ان کو بچپن سے مطیع اور تابع حکم بننا سکھائے گا۔

جبری تعلیم اگر مسلمانوں کی ضروریات تمدنی کا لحاظ رکھ کر جاری کی جائے تو ان کے باہمی نزاعات کی اصلاح بھی کر دے گی۔ کیونکہ فساد بے علمی اور ضروریات معاش سے پیدا ہوتا ہے۔ جب جہالت دور ہوگی۔ اور

ضروریات پوری ہونے کا راستہ نکلے گا تو جھگڑے خود بخود کم ہوتے چلے جائیں گے۔

جبری تعلیم مسلمانوں کو حکومت کا وفادار بنا دے گی۔ اگر مسلمانوں کی حالت کا اس میں لحاظ رکھا گیا۔ کیونکہ اس جبری تعلیم سے جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اطاعت کا مادہ بچوں میں پیدا ہوگا۔ اور اطاعت ہی اصل میں وفاداری ہے۔

جبری تعلیم مسلمانوں کی جسمانی حالت کو درست کر دے گی۔ کیونکہ ان کی جسمانی کمزوری حفظ صحت کے اصول نہ جاننے کے سبب ہے۔ اور جب مجبوراً ہر مسلمان اصولِ صحت کو پڑھے گا تو قدرتاً تندرستی کی حفاظت کرے گا۔ اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کی جسمانی حالت خوب ہو جائے گی۔

جبری تعلیم سے مسلمانوں میں تجارت کا شوق بڑھے گا۔ جبری تعلیم ان کو اچھا کاشتکار بنا دے گی۔ جبری تعلیم مسلمانوں کے ہر پیشے کو مفید ہوگی۔ اور اس کے اثر سے مسلمان ایک زندہ قوم بن جائینگے جس کی ان کو از حد ضرورت ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

بنگالی صاحب! (سخت و سست لکھنے والے سے) بس خبردار زبان روک کے بات کرو۔ نہیں تو ہم اخبار میں گالی دینگے۔"

نسخۂ خضاب

کرنل صاحب نے اپنے قیام ایران کے زمانے میں ایک "عزیز دوست" کے لئے جو نسخۂ خضاب تیار کیا تھا وہ اب ناظرینِ نقیب کے لیے عنایت فرمایا ہے۔ نسخہ بہت تیز ہے اس لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ استعمال "قدرے قدرے" ہو ورنہ سیاہی کے تجاوز کر جانیکا اندیشہ ہے

از کہ میخواہی کہ یابی نسخۂ رنگِ خضاب — موے تو گردد سیاہ و تیرہ چوں بالِ غراب

چہرۂ پژمردہ و افسردہ و پُرچینِ تو — زود تر گردد جواں چوں چہرۂ برنا و شاب

تا نخواند کس ترا پیرِ خرف مردِ ضعیف — جانِ تو یابد اماں از سرزنش زجر و عتاب

جانِ من "خام ایں خیال است و محال است و جنون" — تشنہ۔ جوئے آب پندارد۔ رواں ریگِ سراب

یاد داری آں زماں کز چشمۂ آبِ لبت — خضر و الیاس و سکندر تشنہ می جستند آب

روئے رخشانِ تو بد چشم و چراغِ دو جہاں — دادہ شمس و ماہ و انجم را ضیا و آب و تاب

بوئے گیسویت معطر کن مشامِ جاں بود — چینِ زلف انداختہ یک عالمی در پیچ و تاب

نوکِ مژہ ات پارہ کردہ خرقۂ زہد و ورع — چشمِ مخمورِ تو کردہ خانۂ صوفی خراب

درکشیدہ نو خطِ تو بر خطِ تقدیر خط — مرغِ دل دور رخت بر سیخِ خط بریاں کباب

منزلِ تو مرجعِ عشاق بود در گہت — بودی محبوبِ جہان و حسن و خوبی را مآب

بد ہجومِ عاشقاں در کوئے تو ہر صبح و شام — چوں ہجومِ بادہ خواراں در پئے جامِ شراب

یاد ملک [illegible] دندا نت شدہ تسبیح من — میکشم آہ و ز دہانم میچکد شعرِ خوشاب

آں ہمہ بگذشت و ایں باقی کہ ہست و مختصر نیست — نقشِ ہستی جانِ من پندار چوں نقشے بر آب

ایں بہارِ گلشنِ عالم ہمہ یکرنگ نیست — گاہ ضعفِ پیری گاہے بود عہدِ شباب

نسخۂ دیرینہ از پیرِ مغانم یاد ہست — حکمتِ بقراط و جالینوس را لبِّ لباب

رو۔ بدست آور بتے رنگیں ادا نازک بدن — ہر دو لب یاقوت رنگ و چشمِ او مستِ شراب

گوشۂ تنہا۔ لبِ آبِ رواں و سبزہ زار — کن مہیا مرغِ بریاں بادہ و جامِ شراب

فارغ از فکرِ دو عالم باش و رنج و غم مخور — پس بری وقتِ جوانی را چو موجِ سراب

بادہ خور۔ بوسہ بگیر و خوش گذر کن روز و شب — ایں خضابِ پیری است۔ ایں حالِ عہدِ شباب

تاریخ کچھ ہی کہے کہ سرکار بدایوں سلطنت مغلیہ کا بہترین صوبہ اور بلدہ بدایوں، حاکم نشین شہر تھا، ہم نے تو یہی دیکھا کہ یہاں کے لوگوں کو کپڑے کی خریداری کے لیے پیلی بھیت، شکر کے لیے ہاتھرس اور برتنوں کے لیے فرخ آباد جانا پڑتا تھا۔ کپڑے شکر اور برتنوں کی خریداری کے لیے باہر جانا تو پرانی بات ہوگئی، علم خریدنے کے لیے بریلی ہائی اسکول اور انصاف خریدنے کے لیے جج شاہجہان پور جانا تو ابھی کل کی بات ہے!

ہمیں تو یہ بھی یاد ہے کہ بدایوں سے بارہ بارہ چوبیس میل تک ریل کی سیٹی کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور یہ "خشکی سے محدود جزیرہ" بیرونی دنیا سے محض اونٹ گاڑی اور اکے کے سلسلے ہی سے مربوط و منسلک تھا۔!

بزرگوں کا قول تھا کہ جس وقت بدایوں کو تین چیزیں مل جائیں گی تو اس کا شمار بھی دنیا کے بڑے شہروں میں ہونے لگے گا۔ یعنی ہائی اسکول[۱] ریل[۲] - جج[۳] - اب شکر ہے کہ یہ "موالید ثلاثہ" ہمارے شہر کی دسترس میں ہیں۔ جن میں سے آخر الذکر کے لیے ہم سب کو (اولاً مسٹر بعدہ مسز وحال لارڈ۔ و آیندہ خدا معلوم) مسٹن صاحب بہادر کا رہین منت۔

ہونا چاہیے!

ہائی اسکول اور جی تو اُسی قسم کے کارخانے ہیں جیسے دوسرے بڑے شہروں میں ہوا کرتے ہیں۔ لیکن ہماری ریلوے لائن کا سلسلہ نسب اس خاندان سے ملتا ہے جو اپنی ٹکے گز کی مہذب چال کے لیے مشہور رہے اور جسے ہر قدم پر اس کا خیال رہتا ہے کہ پہیئے کے نیچے ہزاروں لاکھوں چیونٹیوں کی جانیں ہیں۔ سُنا ہے کہ ریلوے اُنھیں انجنوں کو استعمال کرتی ہے جو واٹ اور اسٹیونسن نے بطور مشق اول بنائے تھے۔

ہائی اسکول ریل اور جی پانے کے بعد بزرگوں کے قول کے مطابق بدایوں اب واقعی بڑا ہوگیا اور خدا کے فضل سے حد بلوغ کو پہنچ گیا جس کا ثبوت رات کے دس بجے کے بعد اچھے اچھے خاندانوں کے نوجوانوں کی مستانہ خرامی سے ملتا ہے۔ منجملہ بہت سے شواہد بلوغ کے ایک نمائش بھی ہے جس کا آغاز نومبر کی سترہ تاریخ سے ہوا ہے۔ اور جس کے حسن انتظام کے لیے ہم کارکنانِ نمائش کو مبارکباد دیتے ہیں!

کہا جاتا ہے کہ نمائش جس دماغ سے پیدا ہوئی تھی اب اُس کے ہاتھوں میں نہیں ہے بلکہ اپنے پدرانِ اصطباغی کے ہاتھوں میں ہے سابق و حال کا موازنہ و مقابلہ نہ ہمارا کام ہے نہ اس کے مواقع ہمیں حاصل ہیں۔ لیکن بہ تحقیق معلوم ہوا ہے کہ پہلے کی بہ نسبت نمائش کا طول و عرض اب بہت زیادہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بچے نے عمر کے

ساتھ ساتھ جسم میں بھی ترقی کی ہے۔ یا شاید یہ ہو کہ پدر اوّل کے جسم پر مختصر سی نمائش ہی زیب دیتی تھی۔ لیکن اب جبکہ پدرانِ اصطباغی۔ خدا کے فضل سے سب کے سب "ریگولیشن ہائٹ (REGULATION HIGHT)" والے جسموں کے مالک ہیں تو چھوٹی سی نمائش اُن کے قدوں پر کیا زیب دیتی ہے :۔

جامہ ہر کس بہ قدِ خود دوزند

نمائش کے پروگرام میں شاعری بھی رکھی گئی تھی۔ شعر کا اشیائے نمائشی کی فہرست میں شامل کیا جانا شاید اس لیے جائز سمجھا گیا ہو کہ "بافتن" کا مصدر پارچہ پوشیدنی۔ بوریا اور شعر۔ اور اسی قسم کی چیزوں کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ مگر سُنا ہے کہ عین وقت پر ایک بحث پیدا ہو جانے سے نمائش جس طرح اور اہلِ حرفہ کی دست کاری سے معمور تھی۔ شعرا کی دماغ کاری سے خالی رہی۔ بحث یہ آپڑی تھی کہ اہالیان ڈسٹرکٹ بورڈ یہ کہتے تھے کہ "شعر کا وزن عام اجناسِ بازاری کی طرح سیرِ رائج الوقت سے ہوگا" مگر شعراء یہ احتجاج کرتے تھے کہ "جب سیر رائج الوقت کے ہوتے ہوئے افیون کے لیے وزنِ خاص مستقل ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ شعر کے لیے۔ جو باعتبارِ کیف و سرور افیون سے کسی طرح کم پایہ۔ نہیں ہے۔ خاص وزن نہ ہو اور اس لیے وہ بجائے معمولی اور مستقل وزن یعنی چھیانوے روپے والے سیر کے فعولن فعولن

سے کیوں نہ وزن کیا جائے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ والوں کا یہ عذر تھا کہ "اگر آج ہم شعر کے لیے کوئی بھی دوسرا وزن۔ چاہے وہ فعولن فعولن ہی ہو۔ مقرر کردیں تو کل کو مثلاً گھی والے اس تبدیلی کو سند میں پیش کرنے لگیں گے کہ جب ایک مرتبہ وزنِ رائج بازار بدل گیا تو ہمارے لیے چالیس روپے والا سیر۔ جو کبھی نہیں چلتا ہے۔ کیوں نہ رائج کیا جائے۔" غرضکہ ڈسٹرکٹ بورڈ والے اپنی ضد پر اور شعرا اپنی ہٹ پر اڑے رہے اور اس ہوک وگرمیں "شاعری از میاں گم شد"۔ منسوجاتِ قلمی کی موجودگی میں منسوجاتِ شعری کا عدم وجود اس امر کا نہایت افسوسناک ثبوت ہے کہ نئی روشنی میں شعر دپارچہ پوشیدنی سے زیادہ ناقابلِ اعتنا سمجھا جاتا ہے۔

نمائش میں گھوڑوں کا تو پتہ نہیں مگر گھوڑوں کے علاج کا شفاخانہ مع اپنے پورے ضمیمہ جات و متعلقات کے نمائش میں موجود ہے۔ موٹر اور ہوائی جہاز کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نسلِ انسانی کا یہ پرانا اور تاریخی رفیق ہمیں داغِ مفارقت دے گیا۔ اس مرحوم ہستی کے رخصتی ایڈریس یا نوحۂ مفارقت کے طور پر عالی جناب شیخ سید محمد صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ نے نمائش میں ایک "فرسی" لکچر دیا۔ سنا ہے کہ مخاطبت زیادہ تر خالی کرسیوں سے تھی اس لیے کہ ذی روح سامعین کی تعداد لکچرار سے وہی نسبت رکھتی تھی جو اعشاریہ کو احاد سے ہے۔ ہمارے

خیال ہیں اگر صاحب موصوف "موٹر اور ہوائی جہازوں کا خیر مقدم" اپنی تقریر کا
عنوان قرار دیتے تو بہ معین کثرت سے تشریف لاتے۔ اس لیے کہ
ہندوستانیوں کا نقشِ نگین عام طور پر "اُتراشہ مردک نام" ہے

نمائش میں مختلف اقسام کے گنّے اور غلّے اور پھل وغیرہ رکھے ہوئے
ہیں غلّے کو دیکھ کر ہم نے دریافت کیا کہ "پوسہ" اور "سونہ" اور "کوسہ"
اور اسی قسم کے گراں قیمت گیہوؤں کی پیداوار تو بہت زیادہ ہے لیکن
"پرانی چال" کے گیہوں جو کسی زمانے میں روپیہ کے بیس پچیس
سیر تک بکتے تھے کیا ان کی کاشت ہندوستان میں بند ہو گئی ہے؟"
ایک ماہر علم زراعت نے جو وہاں موجود تھے ہمیں سمجھایا کہ "جب سے
نئی چال" کے گیہوں اور دوسری قسم کے غیر ملکی بیج ہندوستان میں
آنا شروع ہوئے "پرانی چال" کے غلّے کا تخم سوخت ہو گیا" ان صاحب
سے گرانیِ اجناس کے متعلق دیر تک گفتگو رہی۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستانی
ناقدرے ہیں جو غلّہ موجود اور غلّہ معدوم میں مطلق امتیاز نہیں کرتے
لوگ جب تک نئی چال کے غلّے کے اجزاء ماہیتی کی خصوصیاتِ مختصہ
سے واقفیتِ تامّہ نہ پیدا کر لینگے غلط فہمی سے ہمیشہ یہی شکایت کریں گے
کہ اناج پہلے سے بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ آج کل جو غلّہ جدید آلاتِ کشاورزی
اور جدید ذرائع آب پاشی اور جدید ترین اقسامِ خورشِ زمین کی مدد سے
پیدا کیا جاتا ہے۔ پہلے ضرور ہے کہ اس کے اجزاءِ ترکیبی کا تناسب پرانی چال

کے غلے کے اجزار ترکیبی سے معلوم کیا جائے۔ تب اس کا اطمینان ہوگا کہ نئی چال کا پانچ سیر غلہ اپنے فعل کے اعتبار سے پرانی چال کے پچیس سیر کی برابر ہے۔ یہ تناسب جو تازہ ترین طریقہ تحلیل کیمیاوی سے دریافت ہوا ہے حسب ذیل ہے۔ مثال کے لیے ہم ہر قسم کا پانچ سیر غلہ لیکر یوں تناسب ظاہر کرتے ہیں :۔

پُرانی چال کا غلہ وزن پانچ سیر = نئی چال کا غلہ وزن پانچ سیر

پرانی چال		نئی چال	
۱۔ اجزائے تولید امراض	۳٫۷۴	۱۔ اجزائے تولید امراض	۴٫۷۴
۲ اجزائے تغذیہ اجسام	۱٫۲۵	۲۔ اجزائے تغذیہ اجسام	۱٫۲۵
۳ اجزائے برکت	۰٫۰۱	۳۔ اجزائے برکت	۱۹٫۰۱
میزان	۵٫۰۰ سیر	میزان	۲۵٫۰۰ سیر

تناسب مندرجہ بالا کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ جب کہ تغذیہ کی اجزا وہی رہے اور تولید امراض کے اجزار میں کسی قدر اضافہ ہوگیا برکت کے اجزار تقریباً پچگنے ہوگئے جس کی وجہ سے پانچ سیر غلہ باوجود پانچ سیر ہونے کے پچیس سیر ہو جاتا ہے۔ اگر برکت کے اجزار ترکیبی کی بیشی کا اس پر بھی یقین نہ ہو تو اس مثال سے سمجھیئے۔

ایک چپراسی ہے جو پچھلے بیس پچیس سال سے چھ سات روپیے ماہوار تنخواہ پا رہا ہے۔ اب سے بیس سال پہلے اس کے گھر میں کھانے والوں کی تعداد نصف درجن تھی جن کی خوراک کے لیے تین سیر روزانہ کے حساب سے مہینے میں دو من دس سیر غلہ آتا تھا اور اُس کی قیمت اوسطاً ساڑھے چار روپے

ہوتی تھی۔ اب اُسی چپراسی کے یہاں بجائے نصف درجن کے تقریباً درجن کھانے والے ہو گئے۔ لہٰذا اب اُس کے گھر میں ساڑھے چار سیر روزانہ کے حساب سے مہینے میں تین من پندرہ سیر غلہ خرچ ہوتا ہے جس کی قیمت کم وبیش ساڑھے بائیس روپے ہوئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کی تنخواہ میں تو بیشی ہوئی نہیں ہے اور ایک غریب چپراسی کے "دست غیب" میں بھی بقدر اٹھارہ روپے ماہوار کے بیشی ہونا ناممکن ہے چاہے وہ کسی آنریری حاکم ہی کا چپراسی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا بجز اس کے کہ غلۂ رائج الوقت میں برکت کے اجزا کی حیرت انگیز بیشی ہو گئی اور کسی نتیجے پر پہنچ ہی نہیں سکتے۔ وہی ماہر علم زراعت فرماتے تھے کہ اگر نئی چال کے تخم کو تجربے میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور اہل ہند روپیہ سیر غلہ کھانے کے عادی ہو گئے تو ایسے گیہوں کا تخم منگایا جائے گا جس کا ایک دانہ ایک آدمی کے پیٹ بھرنے کو کافی ہوگا اور اُس وقت ثابت ہو جائے گا کہ حضرت آدم علیہ السّلام گیہوں کا صرف ایک ہی دانہ کھا کر کیسے ہزاروں بچے پیدا کر سکے!

اسی سلسلے میں اُنھوں نے یہ سائنسی انکشاف بھی بیان کیا کہ "گھی کے بھاؤ کے متعلق بھی آج کل لوگ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ گھی کے مہنگے ہونے کی شکایت تو کرتے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ پہلے اگر روپے کا سیر بھر گھی آتا تھا تو وہ محض سادہ اور غیر آمیزش گھی یعنی "روغن زرد مفرد" ہوتا تھا اب جبکہ اُس میں آرد آلو۔ روغن مہوا مقطر۔ روغن کنجد متقشر اور شحم مجہول

جیسی اشیاء ملائی جاتی ہیں اور وہ بجائے سادہ گھی ہونے کے "روغنِ زرد کیپ" ہوجاتا ہے تو تجارتی اصول کے مطابق وہ کس طرح اتنی ہی مقدار میں۔ اُتنے ہی داموں میں آسکتا ہے؟

نمائش کے میدان میں ہر روز ایک "ایٹ ہوم" ہونا بھی لازمی ہے ہندوستان کے اکثر مقامات میں "ایٹ ہوم" دیکھا تو ہم نے ایک آدھ دفعہ پہلے بھی ہے مگر اپنے لفظی معنوں میں اس کا صحیح استعمال یہیں دیکھا۔ یعنی ایک ڈیرے یا قنات دار شامیانے کے زیرِ سایہ وسط میں ایک میز رکھ کر اس کے چاروں طرف ملا ملا کر کرسیاں رکھدیں جن میں لوگ اُسی طرح سما جائیں جیسے چھوٹے گھر میں بڑا کنبہ۔ میز جو وسط میں بچھی ہے اس پر سامان تحریر نہیں بلکہ سامانِ تنقل و تنقل ہوتا ہے۔ چونکہ یہ سامان ان لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتا ہے جو مثلاً دوسری یا تیسری یا چوتھی قطار میں بیٹھے ہیں۔ لہذا۔ منتظم عہدہ دار اُسی میز سے تھالیوں میں منتقل کرکے تھوڑا تھوڑا پرشاد بانٹتے پھرتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ۔ یہاں "القاسم محروم" کا فرسودہ اصول کام میں نہیں لایا جاتا۔

نمائش کی سرزمین پر شہر کی مال اور فوجداری کی بڑی۔ مجھولی چھوٹی سب قسم کی کچہریاں بھی اپنے اپنے مقامات سے منتقل ہوکر آگئی ہیں۔ جو "دل بہ یار و دست بہ کار" کے مطابق نمائش میں بھی شریک ہیں اور اپنا فرضِ منصبی

بھی ادا کرتی ہیں۔ نمائشوں میں کچہریوں کی موجودگی کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ کچہریاں فی الحقیقت عدالتی دکانیں ہیں جن میں فیس دے کر انصاف خریدا جاتا ہے یا یہ کہ کچہریوں کی مسلوں میں "اگز بٹ" ہوتے ہیں اور "اگزبٹ" نمائشوں کے لیے ایسے لازمی ہیں جیسے پلاؤ کے لیے چاول۔

نمائش کے تفریحی پروگرام میں ایک مد لوٹا ریس LOTA RACE بھی تھی۔ ایک مقام پر اُلٹے لوٹے رکھے ہوئے تھے۔ شہسوار ہاتھ میں ایک کاغذ پوش چوب دستی لیے ہوئے سرپٹ گھوڑا لاکر پہلے تو لوٹے کو بیک ضرب چوبدستی سیدھا کرتے تھے۔ پھر لاٹھی ڈال کر اُٹھا لیتے تھے۔ لاٹھی پر اس طرح لوٹا لے جانا پرانے زمانے کی لڑائیوں کی یاد تازہ کرتا تھا جب حریف فاتح حریف مفتوح کا سر نیزے میں چھید کرلے جاتا تھا۔ لوٹے کو انسانی سر سے وہی نسبت ہے جو نرگس کو انسانی آنکھ سے ہے۔ شہسواروں کو اس طرح لوٹا لاٹھی پر لے جاتے ہوئے دیکھ کر عجب نہیں جو بہت سے ہندوستانیوں کو غش آنے کے قریب ہوگیا ہو۔ ہم مہتممین نمائش سے التجا کرتے ہیں کہ آیندہ سال ایسی خوفناک تفریح نمائش کے پروگرام میں نہ رکھیں۔

پروگرام کے مطابق نمائش میں شطرنج ٹورنامنٹ بھی ہوا۔ کھلاڑیوں کے جوڑ مقرر کرنے میں شاعرانہ نکتہ آفرینی سے کام لیا گیا تھا مثلاً ایک طبیب صاحب کے فریقِ بازی ایک مختار صاحب قرار پائے تھے۔ غالباً یہ انتخاب اس

وجہ سے ہوا ہوگا کہ خاصیت جلابی دونوں میں قدر مشترک تھی۔ یا یہ وجہ ہو کہ ایک کی نظر جان پر رہتی ہے تو دوسرے کی مال پر۔ اور ظاہر ہے کہ جان و مال جوڑ کے الفاظ ہیں۔ سُنا ہے کہ "نبفشہ گاؤ زباں" "قانون قبضہ" راضی سے باز نہ آئے گیا۔ طبابت وکالت کے مقابلے میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ میدان جیت چکی ہے۔ یعنی ایک وکیل صاحب اور ایک حکیم صاحب ایک دفعہ اپنے اپنے پیشے کی فضیلت کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ فریقین دیر تک دلائل و براہین کے اسلحہ سے مصروف جنگ رہے۔ آخر میں حکیم صاحب نے یہ کہہ کر اپنے فریق کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا کہ "اگر آپ اپنے پیشے میں کوئی غلطی کریں تو وہ غلطی عدالت مقامی سے لیکر عدالت العالیہ ہائی کورٹ تک برابر طشت از بام ہوتی رہے گی لیکن اگر ہم غلطی کریں تو وہ فوراً ایسی زمین دوز ہو جاتی ہے کہ قیامت تک کسی کو خبر نہیں ہوتی"!

اس ٹورنامنٹ میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایسے امیدوار بھی لیے گئے جن کی عمر سولہ سال سے کم تھی اور نابالغ کامیاب کھلاڑی کو چاندی کا ایک خاصدان انعام میں دیا جانا تجویز ہوا۔ سولہ سال سے کم عمر کے بچوں کو نقرئی انعام کی چاٹ دے کر ایسے پُرمنفعت شغل میں لگانا تو حقیقت میں نئی نسل کے ساتھ خیر خواہی کا بہترین ثبوت ہے مگر شطرنج باز کو خاصدان انعام میں دینا اُس وقت تک ہمیں باور نہیں آسکتا جب تک ہمیں یہ یقین نہ دلایا جائے کہ آجکل "بلینڈ" کے کامیاب کھلاڑی کو کھاڑی انعام میں ملنے لگی۔ اگر انعام کے لیے خاصدان مل ہی گیا تھا تو بہتر ہوتا کہ "پان خوری" کا بھی ایک ٹورنامنٹ قائم کیا جاتا۔

آخر میں ہم کمال ادب اہالیان نمائش کو ایک فروگذاشت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں یعنی یہ کہ جہاں اور سامانِ تفریح ۔ مثلِ گھوڑدوڑ ۔ شطرنج ۔ ٹینس وغیرہ کے رکھے تھے ۔ وہاں ایک "بھوک ٹورنامنٹ" بھی رکھتے جو کھلاڑی اس مقابلے میں شریک ہوتے (اور آج کل بلا شبہ ان کی تعداد صدہا سے متجاوز ہوتی ۔ انھیں جوار یا باجرے ۔ یا جھڑے یا مٹرے یا منڈوے کی دو دو روٹیاں (یا دو دو مٹھی بھنے چنے دیے جاتے اور جس وقت (اسٹارٹر) صاحب ایک دو تین کہتے ۔ کھلاڑی روٹی کے نوالے کھانے یا چنوں کے پھنکے مارنے شروع کر دیتے ۔ جو کھلاڑی سب سے کم وقت میں اور سب سے پہلے اپنا حصہ تناول کر لیتا ۔ اسے سب سے پہلا اور دوسرے نمبر والے کو دوسرا انعام دیا جاتا ۔ اس ٹورنامنٹ سے ایسی گرانی کے زمانے میں بہت سے سفید پوشوں کا ایک وقت تیر ہو جاتا اور لوگوں کو جلد سے جلد کھانا کھانے کی مشق بھی ہو جاتی ۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ اس ٹورنامنٹ کا منتظم کسی عہدہ دار سرکاری کو نہ بنایا جاتا کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ سرکاری رعب سے غریب رعایا کے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں ۔ اس ارضی بہشت کے وہ ساکنین جن کے کام و دہان مادی رحیق مختوم اور عنب و رمان سے لذت یاب ہیں وہ تو ان روٹیوں کو طعاماً ذا غصۃٍ اور "لا یسمن ولا یغنی من جوع" سمجھتے ہونگے لیکن ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہزار ہا بلکہ لکھوکھا وہ ہستیاں جن کی تخلیق "فی احسنِ تقویم" ہوئی ہے انھیں من و السلویٰ مائدۃً من السماء خیال کرتیں ۔

اور اس "اطعمہ فی یوم ذی مسغبۃ" پر منعم حقیقی کی تحمید اور مطعمین مجازی کی تحسین کرتیں۔

ثنائے سخن

از جناب سید حکیم الدین ممنون حمید رآبادی

جی میں ہے کیجئے ثنائے سخن فکر ہے لیکن اس کو کیا کہیئے
جوہر تیغ محبت قاطع ترکش تیر بے خطا کہیئے
ہے مخاکات کا یہ شیرازہ مراۃ قلب باصفا کہیئے
بزم حاضر کا باعث رونق عمر رفتہ کا نقش پا کہیئے
نغمۂ بلبلان باغ ادب پردۂ ساز خوش نوا کہیئے
عشق و عرفاں کے راز کا مخبر ترجمان گل و صبا کہیئے
موج دریائے علم و حسن بیان گوہر چشمۂ بقا کہیئے
ہے یہ لاریب حامل جذبات باغ تخیل کی فضا کہیئے
لکھیئے اس کو انیس خستہ دلاں مونس درد آشنا کہیئے
بذلۂ سنج محافل فضلاء نکتہ دان خرد فزا کہیئے
قوم کے درد کی دوا جو یہ ہے اس کو پھر نسخۂ شفا کہیئے
نازش ساز شوخی و رندی نغمۂ صوت دل کشا کہیئے
رونق افروز مجلس انشا شمع بزم مشاعرہ کہیئے
مایۂ انبساط جوش شباب غم ربا کہیئے جانفزا کہیئے
دلکش و دلپسند و صلح کل دلنشیں اور دل ربا کہیئے
گتھیاں دل کی کھول دیتا ہے ناخن صد گرہ کشا کہیئے
راحت قلب ہر غریب و امیر یا ور ہر شہ و گدا کہیئے
حسن کے جلوے ہوں اسقدر ممنون میری جانب سے بس دعا کہیئے

اہلِ ہنود کے مختلف گروہ اور فرقے

از حضرت عزیز احمد صدیقی

اس دنیا کو جلوہ گاہ ناز کہہ کر ایک شاعر نے گویا فلسفۂ جمال کی جملہ باریکیوں کو ایک مختصر سے جملے میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ جس وقت سے یہ عالم وجود میں آیا ہے اس کی دلچسپیوں کو تقویت دینے کی خاطر اختلاف کا عنصر کچھ اس دانشمندی سے شامل کر دیا گیا ہے کہ ظاہرا یہ اختلاف گو زیادہ لطف خیز نہیں نظر آتا۔ تاہم یکرنگی کی بے دلچسپی کو دور کرنے کی غرض سے اگر اس اختلاف کا عنصر نہ موجود ہوتا تو کل کائنات نہایت پھیکی، غیر حس پذیر و سست اور اچاٹ رہتی حلاوت کے ساتھ اگر چاشنی شامل نہ ہو تو لطف ہی کیا آسکتا ہے۔ اُس معشوق حقیقی کے جمال جہاں آرا کی جلوہ ریزی سے عارف باللہ لوگوں کی آنکھیں گو چکا چوند رہتی ہیں تاہم ہر عاشق و دل گرفتہ شخص انداز معشوقانہ کی کٹار سے گھائل ہو کر متمنی بنا رہتا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اسی اختلاف سے اس نازنے کا کام نہیں لیا۔ ہر شاہ راہِ حیات میں اختلافی پہلو موجود ہونے کے ساتھ ہی مذہبی عقائد میں بھی از ابتدائے آفرینش اختلاف قائم رہے اور دیکھیں کب تک قائم رہتا ہے۔ بانیان مذاہب جو مذہب قائم کرتے تھے اُن میں بھی بہ مرور ایام بہت سی شاخیں و فرقے قائم ہو جایا کیں جن میں سے بعضوں میں زیادہ اہم

اختلاف پیدا ہو گیا یعنی از روئے اعتقاد بنیادی اصولوں میں بیگانگت رونما ہوگئی اور بعضوں میں محض فرعی و مراسمی۔ نویں صدی عیسوی کے ابتدائی ایام میں جب ہندوستان میں سری شنکر آچارج کی خارانشگاف تلقینات نے بدھ مذہب کو سرزمین ہند سے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور "شیو" کی پوجا از سرنو بلند یوں کنایش وصوامع میں ہونے لگی یہ گویا ویدانت کا دوبارہ احیا تھا تو اس کو بھی ساڑھے تین سو برس کے بعد ایک نئے مصلح جس نے "شیو" کے بجائے "وشنو" کی پوجا کو افضلیت دی۔ کے لیے جگہہ خالی کرنی پڑی۔ اس نئے بانی سری امانج کا لقب دیا گیا اور اسی نام سے وہ یاد کیے گیے۔ اس کے بعد اور بھی کئی پنتھ نکل آئے لیکن حقیقت میں یہ ہی دو عظیم گروہ قائم ہوئے جو اب تک موجود ہیں۔ البتہ ایک تیسرا فرقہ بھی ہے جس کے پیرو بھی کچھ کم وقعت نہیں رکھتے مختصراً اہل ہنود کے مندرجۂ ذیل تین فرقے کہے جا سکتے ہیں:-

(۱) "شیواسی جو "شیو" کی پوجا کرتے ہیں۔

(۲) سکتا نیشی جو "زنانہ قوت" کی پوجا کرتے ہیں۔ خاصکر دیویوں کی مثل "درگا"، "کالی"، وغیرہ کے جو شیو کی بیبیاں مانی گئی ہیں۔

(۳) "وشنواسی" جو "وشنو" کو مانتے اور اس کی پوجا کرتے ہیں۔

ہندوؤں پر ہی کیا منحصر ہے مسلمانوں کا بھی یہی حال ہوا۔ اثنا عشریہ اور اہل سنت کے علاوہ ۷۲ فرقے ہو گئے۔ اس اختلاف سے صوفیائے کرام کی بزم بھی خالی نہ رہی۔ پہلے چار خاندان قائم ہوئے جو موسوم بہ سہروردیہ، نقشبندیہ، چشتیہ و قادریہ ہیں اور بعد کو ۱۴ خانوادے وجود میں آئے جن کے نام یہ ہیں:-

زیدیاں، عباسنیاں، ادھمیاں، ہبیریاں، چشتیاں، جبیبیاں، طیفوریاں
کرخیاں، سقطیاں، جنیدیاں، گاذرونیاں، فردوسیاں، طوسیاں، سہروردیاں

حقیقت یہ ہے کہ اس عالم کون و فساد میں اس حکیم برحق نے انسان کو عقل دے کر اور تحریر و تقریر کی قوت عطا کر کے مختلف جذبات وخیالات وخواہشات کی تکنیبت سے ایسا پر لطف بنا دیا ہے کہ قدم قدم پر اس کی نیرنگ طرازیوں اور انسانی عجائب زائی کی مثالوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے پس ہر وہ شخص جس کے حصہ میں کوئی قوتِ غیر معمولی آگئی ہے اس کے اظہار کی تمنا رکھتا ہے۔ نام و نمود کی خواہش اور اپنے بعد کوئی یادگار چھوڑنے کی آرزو اس جذبے کو اور بھی سریع الحرکت کر دیتی ہے۔ گو بعض لوگ اس جذبہ و تمنا کو انسانی کمزوری قرار دیتے ہیں۔ اور اگر فی الواقع کمزوری کا اطلاق اس پر ہو سکتا ہے تو بانیانِ فرقہ دینیہ کی طرف اس کو منسوب کرنا سراسر نازیبا بات ہوگی لیکن نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ نام و نمود کے حصول کی خواہش ایک پاک جذبۂ انسانی ہے جس سے اس کو اپنے قوائے ظاہری و باطنی کو کامل طور پر کام میں لانے اور اس سے خلائق کو فائدہ پہونچانے کی تحریک ہوتی ہے۔ کیا عجب ہے متذکرۂ بالا تین بڑے مذہبی گروہ قائم ہونے کے بعد۔ یہی شے اہل ہنود کے مذہبی ریفارمروں اور پیشواؤں کے پیش نظر رہی ہو۔ علاوہ ازیں چونکہ ہر مذہبی پیشوا اپنے خیال کے موافق اپنے کو راہ حق پر سمجھتا ہے اور حق بات کا نشر ضروری ہے اس سے اور بھی یہ گوناگوں عقاید اور طرفہ مذہبی خیالات اس دنیا میں مروج ہو گئے

اہل ہنود کے مختلف گروہ اور فرقے

اہل ہنود کے فرقہ اول یعنی سیوا سیوں کی حسب ذیل فرعیں ہوگئی ہیں:

(۱) سنیاسی (۲) ڈنڈی (۳) پرم ہنسی (۴) برہم چاری (۵) لنگیت (لباوا کے ماننے والے) (۶) اگھوڑی (۷) جوگی جس میں سے اول چار سری شنکر آچارج کے ماننے والے ہیں۔ اسی طور سے وشنوا سیوں کی بھی چھ قسمیں کہلاتی ہیں:۔ (۱) سری وشنواس مرید رامانج (۲) مادھواس مرید مادھوا چاریہ۔ (۳) رامانندی مرید رامانند (۴) کبیر پنتھی (۵) بلبھہ وچاریہ (۶) چیتنی۔

سکھ مذہب گو اب بالکل ہی جداگانہ مذہب قرار پا گیا ہے تاہم چونکہ اس کے طریقے بھی اہل ہنود سے ملتے جلتے ہیں اس لیے اس کا ذکر بھی کیے دیتے ہیں ان میں تین جماعتیں ہیں (۱) ادلیسی (۲) زملی (۳) نہنگ یا اکالی۔

فرقے پنتھ یا جماعتوں کے نام لینے کے بعد ہر ایک فرقے کے کسی قدر تفصیلی حالات بھی دیدینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"سنیاسی" اس جماعت کی دس نسیں کہلاتی ہیں جن کے نام یہ ہیں:۔ (۱) گری (۲) پوری (۳) بھارتی (۴) بن (۵) اورن (۶) پروتا (۷) ساگر (۸) تیرتھ (۹) آشرم (۱۰) سرسوتی۔ سنیاسی جنیو نہیں پہنتے اور نہ چندی یا شکھا ہی رکھتے ہیں۔ ان کے چھ نواہی ہیں اول پلنگ یا تخت پر سونا دوسرے سفید کپڑے پہننا۔ تیسرے عورت سے بات کرنا چوتھے دن کو سونا۔ پانچویں کسی سواری گھوڑے یا دیگر جانور پر چڑھنا۔ چھٹے دل کو پریشان ہونے دینا اور چھ اوامر بھی ہیں جن کی پابندی ہر وقت لازم ہے

(۱) ہر روز پوجا کرنا (۲) روزانہ غسل کرنا (۳) دن بھر شیو کا دھیان رکھنا۔ (۴) ظاہری صفائی رکھنا اور دل کی صفائی کی عادت ڈالنا (۵) دیوتاؤں کی بانا عدہ عبادت کرنا (۶) اپنی جگہ اُسی وقت چھوڑنا جب کھانے کی حاجت ہو۔ برعکس طریقہ مروجہ سنیاسی کی لاش جلانے کے بجائے زمین میں دفن کر دی جاتی ہے۔ لیکن زمین میں رکھتے نہیں بلکہ اس کو بیراگن سے ٹیک لگا کر بٹھا دیتے ہیں۔ ان لوگوں کا سر ادھ بھی نہیں ہوتا۔ ان کے مشہور رشی راجہ دستریہ کی یادگار سے ۲۴ اوپاگر چلے آتے ہیں جنہوں نے دنیا کی اکثر چیزوں کے حرکات و سکنات سے ایک سنیاسی کو نصیحت پکڑنے کے لیے یہ اوپاگر و مقرر کر دیے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:-

"زمین" اس گروہ سے صبر و استقلال کی تعلیم ہوتی ہے جس طور سے زمین کے اوپر اچھے بُرے ہر قسم کے حرکات ہوتے رہتے ہیں اور وہ اس کو بُرا نہیں مانتی اسی طور سے سادھو کو بھی بُرے برتاؤ کو برداشت کرنا چاہیے اور حرف شکایت زبان پر نہ لانا چاہیے۔

"آسمان" گروہ سے یہ سبق لینا چاہیے کہ جو کچھ بھی مصیبت اور پریشانی اس پر آوے اس کا ذرا بھی اثر اپنے اوپر نہ لیوے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آسمان پر خوشی کے نعرے بھی جاتے ہیں، جنگ کی چیخیں بھی جاتی ہیں اور تلواروں کی جھنکار بھی پہونچتی ہے لیکن اس پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوتا۔

"آگ" سے بھی نصیحت کا ایک پہلو نکلتا ہے یعنی اس کا شعلہ ہمیشہ اوپر ہی کو

اٹھتا ہے اور جب یہ سلگتی ہے تو اچھے بڑے درختوں سب ہی کو جلا کر
خاکستر کر دیتی ہے پس سادھو کو شعلے کی بلندی کی مثال اپنے خیالات
بلند و اعلیٰ رکھنا چاہیے اور "آگ" کی دوسری صفت سے اس بات کا اظہار
ہوتا ہے کہ سادھو کو کھانے پینے کا چنداں لحاظ نہ کرنا چاہیے جو کچھ مل جاوے
اچھا ہو یا بُرا اس سے اپنے جہنم شکم کو بھر لینا بہتر ہے۔ راجہ دستر تھ نے
ایک بار کبوتر کے جوڑے کو گھونسلا بناتے اور اپنے بچوں کو سیتے دیکھا جب
وہ بچے اڑنے کے لائق ہوئے تو ایک دن صیاد نے پکڑ لیا مادہ نے جب
یہ دیکھا تو فرطِ محبت سے وہ بھی بچوں تک پہونچ گئی اور فوراً دام میں پھنس گئی
نر یہ دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے اور خود بھی داخلِ جال ہو گیا۔ اس واقعے سے
اُنھوں نے سادھوؤں کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ باوجودیکہ اعزا و
اقربا کے محبت کی لگاوٹیں بہت دلفریب اور نازک ہوتی ہیں۔ لیکن ان سکو
عارضی سمجھنا چاہیے اور اُن کو چاہیے کہ اپنے دل کو نادان کبوتر کے جوڑے
کی طرح اس بے حقیقت محبت کے دام میں نہ پھنسا دیویں "زنِ بازاری
سے بھی ایک سادھو کو نصیحت لینے کی ہدایت ہے جس کا قصہ یہ ہے کہ ایک روز
ایک طوائف خوب بن سنور کر بڑے ٹھسّے سے لبِ بام آکر بیٹھی اس امید پر
کہ اُس کے حسنِ جہاں سوز کو دیکھ کر بہت سے تو گرفتارانِ عالمِ شباب آویں گے
پہلو کا پہلو گرم ہوگا اور روپیہ بھی ملینگے۔ لیکن اسی امید موہوم میں صبح سو
شام ہو گئی حتیٰ کہ رات کا ایک پہر بھی ختم ہو گیا اور ایک متنفس بھی کمرے
پر نہ آیا۔ گذرنے کو تو صدہا راہ گیر گذرے لیکن ایک نے بھی التفات نہ کیا

تب تو اس کو پچھتاوا ہوا اور دل سے کہنے لگی اے کاش! میں نے اس قدر وقت یادِ الٰہی میں صرف کیا ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ اس خیال کے آتے ہی اُس روز سے وہ تائب ہوگئی اور پھر کبھی اس بیہودہ پیشے کی طرف رخ نہ کیا۔ پس معلوم ہوا کہ ایک انسان کتنا ہی بد اطوار اور بدکردار ہو اگر وہ توبہ کرنے پر آمادہ ہو تو عابد بن سکتا ہے۔

"ڈنڈی" اس گروہ میں محض برہمن ہی شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ جنیو نہیں پہنتے چونکہ ڈنڈا ضرور رکھتے ہیں اس لیے ان کا نام ڈنڈی پڑ گیا۔ ان کو حکم ہے کہ سارے دن ایک مقام پر قیام نہ کریں اور ڈنڈا ہی نہ رکھنے پاوے یا تو زمین میں سیدھا گاڑ دیا جائے یا کسی درخت سے لٹکا رہے یہ ڈنڈا ہمیشہ بائیں ہاتھ میں رکھا جاتا ہے تاکہ بُری اور نجس ارواح سے محفوظ رہیں۔ بودھ مذہب والے بھی مثل ان کے ایک ڈنڈا رکھتے ہیں جو ڈردچی یا دھرا کہلاتا ہے۔ اس طلسمی ڈنڈے میں چھ گرہیں ہوتی ہیں جن سے مراد چھ گاتیاں (رہنے یا زندگی کے چھ طریقے) لی جاتی ہیں۔ ڈنڈی لوگ اپنے ڈنڈے کی پوجا بھی کرتے ہیں۔ ان کے بدن پر ایک گیروا کُرتا ہوتا ہے جو ایک بار کا رنگا ہوا کفایت کرتا ہے۔ جنگلوں میں برہنہ پا پھرتے رہتے ہیں آگ روپیہ یا کسی اور قسم کی دھات چھونے کی ان کو ممانعت ہے کھانے کو برہمن کے گھر سے مانگ سکتے ہیں۔ لیکن اسی وقت جب کہ گھر میں آگ نہ جلتی ہو نہ چکّی چل رہی ہو اور نہ کتّا دروازے پر موجود ہو اگر ان علامات سے ایک بھی موجود ہو تو وہ واپس چلے جاتے ہیں۔ جس وقت پہلے پہل کوئی شخص

شاگرد ہونے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو اُس کو سب سے قبل تین یوم روزہ رکھاتے ہیں جس کو برت کہنا چاہیئے۔ اس عرصے میں شاگرد دودھ پی سکتا ہے۔ جب برت کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو ہون کرنا پڑتا ہے

"پرم ہنس" اس کے ممبر اس اعلیٰ جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو خود فراموشی اور واصل بہ وجود حقیقی کی منازل میں قدم زن ہوتے ہیں۔ جب ایک سنیاسی یا ڈنڈی کامل بارہ برس تک اپنی حالت میں گذار چکتا ہے تو وہ اس جماعت میں شامل ہوتا ہے۔ اس منزل میں "شبو اور" وشنو" کے اختلافات ظاہری کو بالائے طاق رکھ کر خود اپنی آپ پوجا کرنے لگتا ہے۔ پرم ہنسوں کے مردے دفن کیے جاتے ہیں اور دریا میں تیرا دینے کی بھی رسم ہے۔ اس فرقے کے اکثر لوگ سنسکرت کے متبحر عالم بھی ہوتے ہیں۔

"برہم چاری" اصل میں برہمچاری کا اطلاق طالبانِ علم پر ہوتا ہے چونکہ اس گروہ کے لوگ درس و تدریس میں اپنی ساری عمر صرف کر دیتے ہیں اس لیے ان کو یہ نام دیا گیا۔ اس جماعت کے لوگ کھانا مانگ کر کھا لینے کو عیب نہیں سمجھتے

"لنگیت" یہ لوگ برہمنوں کے سخت مخالف ہوتے ہیں۔ ان کی گردن یا بازو سے ایک تاگا بندھا ہوتا ہے جس میں لنگ لٹکا رہتا ہے تاگے کو "لنگا سترم" کہتے ہیں جو گویا برہمنوں کے جنیا آشرم کا جواب ہے ان کے پاس ایک گھنٹی بھی رہتی ہے جو ہر وقت بجتی رہتی ہے۔ اس سے اپنی آمد کی اطلاع دہی کا

کام بھی لیا جاتا ہے۔ گوشت خور نہیں ہوتے۔ یہ لوگ اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں۔

"اگھوڑی" اس گروہ کے طریقوں کے ذکر سے کراہیت آتی ہے۔ نہایت ناپاک جنس اور گندے اصول برتتے ہیں اور افعال مکروہ و مبتذل کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً غلیظ کھانا یا پیشاب پینا۔

"جوگی" شیو کی خاص حرمت ان کے دلوں میں ہوتی ہے۔ اور بھیروں کا بھی پاس ادب اور عزت کرتے ہیں۔ جن کی تصویر اکثر یوں بنائی جاتی ہے کہ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہوتا ہے۔ دوسرے میں بوتل۔ بھیروں جی کے نزدیک ہی ایک کتے کی تصویر ہوتی ہے۔ گو اس طائفہ کی کئی فروعیں ہیں لیکن دو زیادہ رائج ہیں۔

(۱) جوگی ششرعنی کن پھٹے (۲) اوگر یا اوگھڑ کل جوگی رُدر کشر کے دانوں کی مالا پہنتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں۔ اگر بدن پر کوئی کپڑا ہوتا ہے تو نارنجی رنگ کا رنگا ہوا۔ بالوں میں کالے رنگ کے اونی تاگے لپٹے ہوتے ہیں اور سر پر بالوں کا جوڑا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے مُردوں کو جلاتے نہیں بلکہ شمال جانب منہ کرکے قبر میں بٹھا کر دفن کرتے ہیں۔ جو کن پھٹے ہوتے ہیں وہ کانوں میں شیشے کے آویزے یا لکڑی کے حلقے پہنے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے ناموں کو آخر میں ناتھ لگا ہوتا ہے۔ اوگر لوگوں کے نام داس پر ختم ہوتے ہیں جو عموماً نیچ ذاتوں سے بھرتی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کانوں میں حلقے نہیں لٹکاتے بلکہ کالے

ناگئے میں نادھ لٹکائے رہتے ہیں۔ اس بین کو صبح و مسا بجاتے ہیں اور قبل کھانا کھانے کے بھی۔ عام طور سے ان کے پاس کتے پلے ہوتے ہیں۔ جوگی علاوہ بھیروں کے نو ناتھوں کو بھی متبرک سمجھتے ہیں جو گویا غیر فانی عابد قرار دیئے گئے ہیں جن کے نام یہ ہیں:-

(۱) گوراکرن ناتھ (۲) مچھندر ناتھ (۳) چہرنتہ ناتھ (۴) منگل ناتھ (۵) گھگو ناتھ (۶) گوپی ناتھ (۷) پرن ناتھ (۸) سورتھ ناتھ (۹) چمپا ناتھ۔ علاوہ ازیں ان کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ اس عالم میں ۸۴ راسی سدہ بھی موجود ہیں جو تا ابد زندہ رہینگے۔ ان میں سے جو لوگ سدھوں کی پوجا کرتے ہیں وہ اپنے پاس ایک چاندی کی سنگی بھی رکھتے ہیں۔ جو گردن سے لٹکتی رہتی ہے۔

دوسرے فرقے کے لوگ جو وشنواسی کہلاتے ہیں اور شیو کے بجائے وشنو کی پوجا کرتے ہیں ان کی آپس کی جماعتوں میں از روئے اعتقاد محض اس قدر فرق ہوتا ہے کہ بعض انسانی اوتار میں کرشن کو مانتے ہیں اور بعض رام کو۔ اس کے کل افراد سبز ترکاری کھاتے ہیں اور شراب نہیں پیتے۔ جو لوگ رام کی پوجا کرتے ہیں ان میں سے اکثر سیتاجی کو نہیں بھی مانتے ہیں۔ لیکن کرشن پوجن والے کرشن جی کی بیبیوں اور ان کی مدخولہ رادھا کو ضرور مانتے ہیں۔ اس مذہب کی جو "سری وشنو" جماعت ہے اس کے تابعین بیشتر جنوبی ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اور رامانج مہاراج کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے ہیں وہ "سری" یا "لکشمی" کو وشنو کی بی بی سمجھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے۔ کھانا کھلانے والے کو لیے

بھی یہ شرط ہے کہ وہ یا تو ریشمی کپڑے پہنے ہوئے ہو یا اونی لیکن سوتی ہرگز نہ ہو
ان کی دو قسمیں ہیں (۱) داداگلاس (۲) تنگ لاس۔ ان میں سے اول الذکر اپنی پیشانی
پر تشدید کی سی سفید لکیریں بناتے ہیں اور موخرالذکر لا کی طرح کی وہ یا ان میں لال رنگ
کی تحریر ہوتی ہے۔ بازوؤں اور سینے پر گوپی چندن ہاتھ کی انگلیوں سے لگاتے ہیں اور
تحریر لال رنگ کی اس میں بھی رہتی ہے۔ چندن کی چار لکیروں سے مراد وشنو کے
کنول، ڈنڈے، کوچ اور چکر سے لی جاتی ہے۔ اور لال تحریر سے "سری
لکشمی" جو شیو کی بی بی مانی جاتی ہیں۔ اس فرقے کے فقیروں کے کنٹھے یا مالے
تلسی کے دانوں یا تخم کنول سے بنے ہوتے ہیں۔ کپڑے لال رنگ سے رنگے
ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض ڈنڈا بھی باندھتے ہیں۔ لیکن جنیو نہیں
چھوڑتے +

"مادھواس" اس فرقے کا بانی مادھوچاریہ تھا جس نے جنوبی ہند میں
۱۱۹۹ء اور ۱۲۰۰ء کے درمیان اس پنتھ کی بنا ڈالی تھی۔ اس کے مہنت جن کو
قلندر کہہ سکتے ہیں۔ ہمیشہ کنوارے رہتے ہیں اور صومعہ میں قیام پذیر رہتے
ہیں تہہ بند کے طریق پر محض ایک کپڑا نارنجی رنگ کا تن پوشی کے لیے کافی سمجھا
جاتا ہے۔ ان کا سر منڈا رہتا ہے۔ یہ لوگ مثل شیواسیوں کے ڈنڈیوں کی جنیو
توڑ ڈالتے ہیں۔ ڈنڈا بھی باندھتے ہیں اور ایک کشکول بھی ساتھ رہتا ہے بازوؤں
اور سینے پر وشنو کی نشانی اور پیشانی پر دو عمودی لکیریں گوپی چندن سے بناتے
ہیں ان دو لکیروں کے درمیان ایک لکیر سیاہ رنگ کی بھی رہتی ہے۔ جو اس راکھ سے
بنائی جاتی ہے جو "وشنو" کے سامنے لکڑی جلانے سے نکلتی ہے۔ سیاہ لکیر کے

خاتمہ پر ہلدی کا گول نقطہ بھی رہتا ہے۔ اس پنتھ میں کل ذات کے لوگ شامل کر لیے جاتے ہیں البتہ گرو ہمیشہ برہمن ہی رہتا ہے

"راما نندی" جن کو راماوت یا اماوت بھی کہتے ہیں۔ اس فرقے کے متبعین شمالی ہند میں بکثرت موجود ہیں۔ یہ لوگ پیشانی پر ترفلا بناتے ہیں جو تین عمودی لکیروں سے بنتا ہے درمیانی لکیر لال ہوتی ہے اور راست وچپ کی سفید۔ تسبیح و مالے تلسی کے دانوں کو رکھتے ہیں۔ ان کی چار فرعیں ہیں۔ ایک آچاری دوسری سنیاسی تیسری خاکی چوتھی بیراگی۔ اچاری ہمیشہ ریشمی یا اونی کپڑے پہنتے ہیں اور سنیاسی سوتی لباس زیب تن کرتے ہیں۔ جس کا رنگ سامن مچھلی سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ خاکی (کھاکی) ننگے پاؤں پھرا کرتے ہیں بدن پر بھبھوت یا راکھ مل لیتے ہیں بال و ناخن نہیں کٹواتے بیراگیوں کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لفظ بے معنی بغیر اور راگ بمعنی محبت۔ پورے لفظ کے معنی ہوئے بلا محبت۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ دنیاوی محبت سے کلیتاً مُبرا ہوتے ہیں۔ یہ لوگ رنگین کپڑے نہیں پہنتے۔ بال خوب لانبے بڑھاتے ہیں۔ ماتھے پر رنگ سے ترفلا بناتے ہیں ترفلے کی لکیریں ناک کے آخری حصے کی ابتدا سے نکالی جاتی ہیں۔ درمیانی لکیر لال رنگ کی ہوتی ہے اور داہنے بائیں کی سفید ہوتی ہیں۔ درمیانی لکیر سے دشنو مراد لیتے ہیں اور داہنی بائیں لکیروں سے "برہما و شیو"۔ یہ لوگ کنٹھی بھی پہنتے ہیں اور ان کے تلسی کے دانوں کا جپنے والا مالا بھی ہوتا ہے۔ گوشت کھانے اور شراب پینے سے پرہیز رکھتے ہیں۔ البتہ بھنگ کھانا عیب نہیں سمجھتے۔ اس پنتھ کے جملہ لوگ جنیؤ پہنتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ نیچ ذات سے آکر کیوں نہ داخل ہوں۔ ان کے سر پر بالوں کا "گپھا" بھی ہوتا ہی۔ بیراگی

کبھی کبھی سر کے نام کا صافہ بھی باندھتا ہے اس فرقے کے مہنت لوگوں کے حلقے میں نا کتخدا عورتیں بھی رہتی ہیں۔ بیراگی کی بابت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بن باس رہتا ہے اور اسی حال میں زندگی ختم کر دیتا ہے۔

"کبیر پنتھی" ان لوگوں کی پوشاک کا کوئی خاص رنگ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کے نزدیک ہر رنگ یکساں ہے اور ہر مذہب کے متبعین کو اچھا سمجھتے ہیں۔ البتہ رامت لوگوں کی طرح تلسی کے دانوں کا مالا پہنتے ہیں اور پیشانی پر تر فلاکی بناتے ہیں۔

"بلرام دچاری" ان کا ملجا و ماویٰ مغربی ہندوستان ہے ان کا پیشوا "بالا گوپال" ایک چرواہے کا لڑکا تھا۔ اس گروہ میں بھی ہر ذات والے ہندو شامل ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ دھوبی، موچی، درزی اور نائی کو نکال کر شدر لوگ بھی لے لیے جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے پیشوا کا اعتقاد تھا کہ عبادت اسی وقت پورے طور سے خشوع و خضوع کے ساتھ ہو سکتی ہے جب تک کہ انسان کی تندرستی اچھی اور قویٰ توانا و تندرست ہیں لہٰذا لوگوں کو اس کی سخت ریاضت اور تندرستی کش مجاہدوں سے پرہیز رہنا بہتر ہے۔

"چتنیا نیت" اس فرقے میں بھی تیج ذات والے شامل کر لیے جاتے ہیں۔ ان کے ذات عام طور سے بیراگی کہلاتے ہیں۔ جن کے حلقے میں مرد و عورت دونوں رہتے ہیں۔ مرد کو بابا جی اور عورت کو ماتا جی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نیک پیشہ اور لوگ اس حلقے میں مل جاتے ہیں۔ مثلاً دیگر وشنیویوں کے یہ لوگ بھی ماتھے پر گوپی چندن سے عمودی لکیریں بناتے ہیں اور بعض اپنے سینوں اور بازوؤں پر گوپی چندن سے دیوتاؤں کے نام بھی چھاپتے یا لکھ لیتے ہیں جو عموماً نعلقو یا نتوانند کے پیغمبر کا نام ہے۔

مالا بھی تلسی کے دانوں کی ہوتی ہے۔ سبزی ترکاری ان کی خوراک ہے

مرغوب غذا ہے البتہ شراب نوش نہیں۔ جو لوگ جانوروں کی بھینٹ چڑھاتے ہیں ان سے متنفر رہتے ہیں۔ اس گروہ کے دو تین فرقے اپنی اخلاقی کمزوریوں کے لیے مشہور ہیں مثلاً اشٹبشاد یا کاس سہاجائیں اور تول وغیرہ۔

سکھوں کے فقری سلسلے یا طائفے بھی کئی ہیں مثلاً بابا نانک کے سب سے بڑے بیٹے سری چند نے "اودسیی" سلسلے کی بنیاد رکھی جو سامن مچھلی کے سے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ سر پر نوکدار ٹوپی ہوتی ہے اور گردن میں سالی باندھتے ہیں جھولی اور تونبی بھی رکھتے ہیں اور ایک کلے رنگ کی آسینی (دری کا ٹکڑا) بھی ان کے پاس ہوتی ہے جس پانی سے گرو کے پیر دھوئے جاتے ہیں اس کو پھینک نہیں دیتے بلکہ اسی کو اپنے پینے کے کام میں لاتے ہیں۔ جب گرو چیلے کو رخصت کرتا ہے تو یہ نصیحت کرتا ہے "چرن گرو کے دھو دھو پیو۔ ارپ سادھ کو اپنا جیو" مطلب یہ ہے کہ جسم و روح سب سادھو کو دیدو۔

"نرملی" جس وقت گرو گوبند سنگھ انوپ کنور سے جان بچا کر نکلے تو انھوں نے بیر سنگھ کو اپنا لبادہ دے کر ایک نئے سلسلے کی بنیاد رکھنے کا حکم دیا جو "نرملی" کہلائے یہ لوگ عموماً لکھے پڑھے ہوتے ہیں اور فلسفۂ ویدانت کے معتقد۔ لانبے بال رکھتے ہیں اور گیروے رنگ کا لباس پہنتے ہیں۔

"نہنگ یا اکالی" یہ سلسلہ اس وقت قائم ہوا جب گرو گوبند سنگھ افواج قاہرہ سلطنت مغلیہ سے شکست فاش کھا کر مقام جام کور سے بھیس بدل کر اور اپنی جان لیکر بھاگے تھے جب وہ موضع مچھی وارہ میں پہونچے تو وہاں کے مسلمان باشندوں سے امن و امان چاہی اور اپنی جان ان کی حفاظت میں سپرد کر دی۔ مسلمانوں نے از راہ ترحم پناہ دیکر ان کو نیلے رنگ کے کپڑے پہنا کر چارپائی پر لٹا دیا اور اُچکا پیر کے نام سے ان کو لے چلے

چارپائی اٹھانے والوں میں بنی خاں اور غنی خاں تھے جب وہاں بھاگ کر گرد گوبند ایک ایسے موضع میں پہونچے جہاں سکھ لوگ آباد تھے اور ایک گوشے میں وہ مقام بھی تھا۔ وہاں چندے قیام کے بعد مان سنگھ کو ایک نیا سلسلہ اس واقعے کی یادگار قائم کرنے کے لیے کہا۔ اور ان کو نام اکالی دیا گیا۔ ان لوگوں کا طریقہ ہے کہ برابر پھرتے رہتے ہیں ایک جگہہ قیام نہیں کرتے

سکھوں کے علاوہ جین مذہب والوں کے مہنتوں کی نرالی ہی سج دھج ہے داڑھی مونچھوں کا صفایا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ بھویں تک منڈائے رہتے ہیں۔ اس خیال میں کہ کسی ذی روح کی جان نہ جانے پائے۔ اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں کہ بہ نظر احتیاط ناک و منہ پر کپڑے کی چار پانچ تہ ہر وقت لپیٹے رہتے ہیں مبادا سانس کے ہمراہ کوئی بھنگا وغیرہ داخل ہو کر مر جاوے۔ اسی لحاظ سے آگ بھی نہیں جلاتے۔ اس میں بھی ڈر رہتا ہے کہ کوئی پتنگا یا کیڑا مکوڑا اس میں پڑ کر جل جاوے۔ طبقۂ اناث سے علیحدہ رہنے کی اس شدت سے ہدایت ہے کہ ان کا چھونا تک منع قرار دیا ہے۔ کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے اور نہ شراب پیتے ہیں 'جان' کا خیال اس درجہ دامنگیر رہتا ہے کہ نہاتے بھی نہیں اس میں بھی ان کو ڈر رہتا ہے کہ کسی جاندار کا خون نہ ہو جاوے۔ یہ لوگ اپنے مُردوں کو اٹھاتے نہیں بلکہ یونہیں ڈال دیتے ہیں اگر کوئی راہ گیر اٹھا کر دفن کر دیتا ہے تو اس کو روکتے بھی نہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک سوتیم برا (سفید کپڑے پہننے والے)، دوسرے براد حیوشل آسمان کے برہنہ جسم رہتے ہیں۔

اہل ہنود میں تپسیا جاہیے یا ریاضتوں کے آسنوں کی بھی دو قسمیں ہیں

در ہر ایک کے نام بھی جدا جدا ہیں۔ مثلاً جو لوگ دھونی رما کر بیٹھتے ہیں وہ "پنچ دھوتی
سادھو" کہلاتے ہیں دوسرے "کلنڈا سیہ" جو کیلا تختے یا تخت پر لیٹے رہتے ہیں۔ ایک "نھرسری" ہوتے ہیں جو
ایک پیر پر کھڑے رہتے ہیں۔ "اردھا مکھی" وہ ہیں جو تھوڑی کچھ دیر کے لیے اُلٹے لٹک کر عبادت کرتے ہیں۔
انہی میں ایک "اردھا باہو" کہلاتے ہیں۔ "جل دھر تپسی" اور "جلیا سی" دریا میں جھکل پلا دالی
میں مصروف رہتے ہیں بعض سادھو محض پھل پر گذر کرتے ہیں جو "فریری" کہلاتے ہیں اور جو لوگ بجز
دودھ کے اور کچھ نہیں کھاتے وہ "دودادھاری" کہلاتے ہیں۔ سادھوؤں میں ریاضت کا ایک طریقہ "سمادھ" کا بھی
رکھا گیا ہے جس میں ریاضت کرنے والے سادھو کو مٹی کے اندر دفن کر دیتے ہیں اور کئی ہفتے گذر جانے کے
بعد اُس کو کھود کر نکال لیتے ہیں۔ "الونی" طریقے والے کبھی نمک نہیں کھاتے۔ ایک فرقہ ہے جسکو "کرالنگی" کہتے ہیں
اس سے تعلق رکھنے والے اپنے آلۂ تناسل کو اور اُس کی رگوں کو بیکار کر ڈالتے ہیں۔ سب سے مشکل آسن "پدم
آسن" کہلاتا ہے جس میں کنول کے پھول کی مانند جسمانی ہیئت بنانی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں سادھو لوگ اور بھی
بہت سے حرکات کرتے ہیں مثلاً "نیتی کرم" یعنی ایک تاگہ منہ میں ڈالکر ناک سے نکالنا۔ "دھوتی کرم" میں منہ سے ایک رومال
پیٹ میں ڈال کر نکال لیتے ہیں۔ "برہم داتن" مسواک کرنے کو کہتے ہیں صفائی کے اور بھی طریقے ہیں جس میں سے
ایک کو "برجولی کرم" کہتے ہیں اور ایک دوسرے کا نام "گنیش کریہہ" ہے۔

وشنو اسی اور شیو اسی سادھو اپنے لباس وضع قطع تلک یا مالے وغیرہ سے بھی پہچانے جا سکتے ہیں مثلاً
بعض سادھو پیشانی پر تلک لگاتے ہیں اور بعض ترفلا بناتے ہیں۔ ترفلے کے درمیان کی لکیر اگر [illegible]
اور دائیں بائیں کی سفید تو [illegible]مت سادھو سمجھنا چاہیئے۔ جو ترفلا اس طور سے بنا یا جاتا ہے کہ [illegible]
رولی بھی شامل ہو اور سفید لکیریں گو یا چندن سے بنی ہوئی ہوں تو اس سے مراد تینوں خدا سے لیتے [illegible]
وشنو، شیو اور برہم۔ اور اگر ترفلے میں لال لکیر کے بجائے سیاہ ہو تو وہ سادھو چار [illegible] سادھو کی [illegible]
چاہیئے شنکر آچاریہ مہاراج کے شیواسی پیشانی پر ترپنڈ [illegible] لگاتے ہیں۔ دکھنی چارتی اردھا [illegible]

ہیں بالوں کے لحاظ سے "جٹادھاری" اور "سہوریہ" ہوتے ہیں اول الذکر بال جوڑے کے طور پر بندھے رکھتے ہیں اور موخرالذکر پریشان اور الجھے ہوئے بالوں سے بھی وشنو شیو والوں میں تمیز کی جاسکتی ہے۔ ایک تلسی کے دانوں والے مالے رکھتے ہیں اور دوسرے رودراکش کے دانوں کے گروہ بجائے ایک کے دو مالے تلسی کے دانوں والے پہنے ہوتے ہیں تو ان کو شنو امی نرائن سمجھنا چاہیئے جو کرشن وشنو اور ان کی بیتو لرادھا کو مانتے ہیں جب مالوں میں بھی تفریق ہے شیو واسی ۳۲ یا ۶۴ دانوں والا رودراکش کا جپ مالا رکھتے ہیں اور وشنو اسی ۱۰۸ دانوں کا تلسی کے ہوتے ہیں۔ پانی پینے یا بھیک مانگنے کا کشکول یا تو ناریل کا ہوتا ہے یا اس کے بجائے ایک تونبی ہوتی ہے اور بیراگن شیو اسیوں کے پاس ذیل کی چیزیں بھی ہونا ضروری ہیں (۱) لنگم (۲) انسان کی کھوپڑی (۳) مرگ چھالا (۴) ترسول (۵) دمیرو (ڈفلی یا دائرہ) اور وشنو اسیوں کے پاس سالگرام (پتھر) تلسی سنگھ اور چکر موجود رہتا ہے۔

خفتگان لحد سے

از جناب سید محمد اعظم صاحب فہمی ترمذی

جبکہ تمہارے دم سے تھی رونق بزم کائنات　　جبکہ تمہاری ذات تھی نقطۂ گردش حیات

جبکہ جہاں میں تم بھی تھے وجہ سرور انبساط　　جبکہ جہاں میں تم بھی تھے رونق محفل نشاط

جبکہ دل بھی تھا وقف ہزار آرزو　　اس پہ فدا تھیں حسرتیں اس پہ نثار آرزو

تھی تو اک سکون جذبۂ مشتعل میں تھا　　تم جو کسی کے دل میں تھے کوئی تمہارے دل میں تھا

اس ارتباط کو سمجھے تھے فرض عین تم　　کوئی تمہارا چین تھا اور کسی کے چین تم

تھا کبھی اضطرابِ شوق، صبر شکن، رضا شکن — شکوۂ صد جفا بلب، شکوۂ صد وفا شکن
ہمت سربلند تھی رسمِ وفا سے بے نیاز — دل میں بھرا ہوا مگر عشق کا ایک سوز و ساز

آہ وہ دور کیا ہوا؟ آہ وہ دن کہاں گئے؟ — آہ وہ تم نہیں رہے! آہ وہ دل نہیں رہے
یاد تمہاری مدتوں صورتِ دلنشیں رہی — بن کے رفیقِ زندگی وہ بھی مگر نہیں رہی
آج تمہاری قبر ہے منظرِ صد فرامشی — اس پہ فدا ہے بیکسی، اس پہ نثار خامشی
اے کہ جہاں میں تم بھی تھے رنج و الم سے نوحہ گر — اے کہ کسی کے غم میں تھی تم بھی جہاں میں چشم تر
اے کہ کسی کی قبر پر تم بھی کبھی تھے نوحہ خواں — اے کہ کسی کی یاد میں تم بھی کبھی تھے سرگراں
دل تھا تمہارے سینے میں، دل میں تمہارے درد تھا — لب پہ تمہارے آہ تھی، چہرے کا رنگ زرد تھا
تم بھی یوں ہی کبھی کبھی جا کے کسی مزار پر — لیکے وہاں سے آتے تھے دل میں قلق فزا اثر
یوں ہی کسی کی یاد میں ٹیس سی دل میں اٹھتی تھی — یوں ہی کسی خیال میں اٹھتی تھی ایک ہوک سی
ہائے کسی مزار پر تم بھی کبھی جو جاتے تھے — آنکھوں سے اپنے اشکِ خوں یوں ہی بہا کے آتے تھے
یوں ہی لحد پہ جاتے تھے تم بھی برائے فاتحہ — تم بھی یوں ہی اٹھا کے ہاتھ پڑھتے تھے ہائے فاتحہ
آہ تمہاری قبر پر فاتحہ خواں ہوں آج میں — آہ تمہاری یاد میں وقفِ فغاں ہوں آج میں
خیر! گزر کے یہ بھی دن ایک گھڑی وہ آئیگی — جبکہ یہی سماں، یہ دل، موت مجھے دکھائیگی
جبکہ تمہاری طرح سے ہو کے میں تودۂ غبار — چھوڑوں گا ایک ڈھیر سا دہر میں اپنی یادگار
یوں ہی مرے مزار پر کوئی پڑھے گا فاتحہ — کوئی وہاں نہ ہوگا جو قبر کا دے اسے پتہ
پہلے تو یہ کہیگا وہ "آہ! یہ کس کا ہے مزار" — لوح کو پڑھ کے خود بخود چونک پڑیگا ایک بار
دیکھ کے میری قبر کو دل میں اٹھیگا ایک درد — رو کے کوئی کہیگا پھر کھینچ کے ایک آہ سرد
اس کو تو جانتے تھے ہم، یہ تو ہمیں بھی یاد ہے — فہمی نامراد ہے! فہمیِ نامراد ہے

نقیب

مرتبہ

وحید احمد

قسم دوم

بہ اہتمام اشاعت نقیب پریس پھلواری شریف

اشتہارات

تندرستی طاقت اور عمر درازی یہ سب حاصل کرنے کا طریقہ

آتنک نگرہ گولیاں

ان گولیوں نے نئی زندگی اور عمر درازی اور خوش حالی بخشنے کی وجہ سے عالم دنیا میں بڑی شہرت اور فتحمندی حاصل کی ہے ان کے صرف چند روز کے استعمال سے سینہ دھڑکنا شکم میں باؤ گولہ کا پھرنا۔ طبیعت کا متلانا۔ حواس کا پریشان رہنا۔ حالتِ خواب میں پریشان خواب کا نظر آنا۔ خواب سے بار بار چونک جانا۔ حالتِ بیداری میں خاطر کا پریشان ہونا کسی اشیا کو دیکھ کر یا آواز سن کر ڈرجانا دور ہوتا ہے۔ بلکہ دل نہایت قوی اور مضبوط ہوتا ہے کیونکہ اعضائے رئیسہ کو تقویت اور بدن میں طاقت اور سلام کاج کے لیے چستی اور چالاکی بخشنا خاص انھیں گولیوں کا کام ہے مایوس الاولاد شخصوں کو بڑھاپے میں مالک کی مہربانی سے اولاد بخشی ہے۔ حصول اولاد کے لیے میاں بی بی دونوں استعمال کرسکتے ہیں۔ پرہیز کی چنداں ضرورت نہیں۔ جڑی بوٹیوں کی مرکبات ہیں قیمت ۳۲ گولی کی ایک ڈبیہ ۲ علاوہ محصول۔

مزید آگاہی کے لیے ہماری کتاب کام شاستر جو اٹھارہ زبانوں میں ترجمہ شدہ موجود ہے اور آج تک تخمیناً ۱۱ لاکھ کے ہم رفاہِ عام کے لیے مفت تقسیم کرچکے ہیں ہم سے مفت منگواکر ملاحظہ فرماویں۔

ہر مریضہ کی حالت پوشیدہ رکھی جاتی ہے مستورات کے خفیہ امراض کے لیے ہماری فارمیسی کی بنی ہوئی چندر پربھا گولیاں نہایت مفید ہیں۔ قیمت ۱۲ گولی کی ڈبیہ علاوہ محصول

للشاهد، وید شاستری منی شنکر گووند جی مالک آتنک نگرہ فارمیسی ہیڈ آفس جام نگر کاٹھیاواڑ

جلد ۲ - دسمبر ۱۹۰۹ء نمبر ۵

ڈیڑھ اینٹ

از جناب محمد ظفر اللہ خاں صاحب بی اے

اظہارِ خیال زبان سے ہو یا قلم سے ہمیشہ اس نیت سے ہوا کرتا ہے کہ مقرر یا مصنف اپنے سامعین محترم یا قارئین کرام کو خوش کرے۔ اپنی قوت زبان یا قلم سے دلوں کو گرمائے۔ اور اس غرض سے اکثر ہوتا ہے کہ ایک ادنیٰ نہایت غیر معین اور ناقابلِ تربیت ہستی کو جسے پبلک کہتے ہیں یوں شیشے میں اتارا جاتا ہے کہ زبان اور قلم کو روغنِ قاز سے چکنا کیا جاتا ہے اور ہر لفظ شکر لپٹا نکلتا ہے۔

ایسے صاحب زبان و قلم جو اس نیت سے زبان ہلائیں یا قلم اُٹھائیں کہ محض اپنے اصلی خیالات اور جذبات ادا کریں۔ خواہ سامعینِ محترم، ناک بھوں چڑھا کر پھنکارے ماریں، خواہ قارئین کرام، مضمون پر تھوکیں انہیں اور بے نقط سنائیں آپ کو چراغ لیکر ڈھونڈنے پر بھی، صدیوں کے دوران اور وہ بھی

ارتقاپذیر اقوام میں اکا دکا ہی ہاتھ لگینگے۔ ادبیات کے اس مختصر حصے کو "جسے دنیا برضا و رغبت سٹنے نہیں دیتی"، الگ رکھیئے اور روزانہ ہفتے وار اور ماہوار ادبی ضیافتوں پر نظر دوڑائیے تو الوانِ نعمت بیشتر دولت کی چاٹ کی طرح محض اس غرض سے تیار کیئے جاتے ہیں کہ دیکھنے سے پبلک کا دل خوش ہو۔ مگر کتنا ہی کھلایا جائے پیٹ ہی نہ بھرے۔

کہا جاتا ہے کہ نیا پن مزے کی چیز ہوتی ہے۔ اگر یہہ سچ ہے اور بعض خاص صورتوں میں یقیناً سچ ہے تو کیوں نہ اس امر کی کوشش کی جائے کہ مضمون میں قارئینِ کرام کی صرف خوشنودی ہی مدنظر نہ ہو بلکہ ان کے ناراض کرنے کا پورا اہتمام کیا جائے۔ اس کا آسان سے آسان طریقہ تو یہ ہے کہ پبلک کی شان میں بے نقط باتیں لکھ دی جائیں اور صفراوی مزاج کارلائیل کی طرح چیخ اٹھے "دنیا میں تقریباً بیوقوف بستے ہیں"، یا ملٹن کے ہم آواز ہو کر گایا جائے کہ شہرت طلبی "قابل دماغوں کی آخری کمزوری ہے"۔ مگر اس طریقے کے لیے ایک تو صفرے کی زیادتی اور دوسرے اپنی طبع کے خداداد اور بے نظیر ہونے کا گھمنڈ لازمی ہے اور یہہ خلقی اور ذہنی خصوصیتیں بہت کم یکجا جمع ہوتی ہیں۔ ایک اور طریقہ واعظانہ ہے جس میں کھلم کھلا پبلک کو دوزخ کے کندے سے کچھ زیادہ وقعت نہیں دی جاتی۔ مگر اس طریقے کو وہی لوگ بخوبی استعمال کر سکتے ہیں جن کے ایثار کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ اپنی روح سے زیادہ اوروں کی روح کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں اگر اور سب طریقوں کو اسی طرح علیحدہ علیحدہ بتلایا جائے تو ڈر ہے کہ یہ مضمون تمہید پر ہی ختم ہو جائے اس لیے صرف یہہ عرض کر دینا کافی ہے کہ جس طرح پبلک کی "ہاں میں ہاں" ملانے

کے طریقے بیشمار رہیں اُسی طرح پبلک کو "چنچنا دینے" کی بھی بے گنتی صورتیں ہیں یہہ اور بات ہے کہ آخر الذکر صورتوں سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔

اس تحریر میں ناچیز راقم کی عین کوشش یہی ہوگی کہ قارئین کرام کے دل خوش کُن کوئی بات نہو۔ خیال اُن کے خیال۔ جذبات اُن کے جذبات کو مطابق نہوں۔ ظاہر ہے کہ یہہ کوئی آسان نہیں، پبلک کی ناراضی کا سامان فراہم کیا جائے اور پھر یہ کہ قارئین کرام اُسے ہضم کریں یا نہ کریں، کم سے کم نوش جان تو فرمائیں ایک پل صراط پر سے گذرنے سے کم نہیں۔ کیونکہ۔ اور اس میں ظرافت کا پہلو ملاحظہ ہو۔ پبلک کے ناراض کرنے کی جسارت محض اسی توقع پر کی جائے گی کہ ایک ہی طریقہ، خواہ وہ چاپلوسی کی شہد بھری لوری ہی کیوں نہو، انسانوں کے دل و دماغ کے لیے باربار دوہرانے سے، بدمزہ اور اجیرن سا ہو جاتا ہے۔ ماں بیٹے کو لعل، لوکلیجہ اور خدا جانے کیا کیا کہتے کہتے، ان پیار بھرے الفاظ کو چھوڑ کر انتہائی پیار میں تتلا کر بول اُٹھتی ہے "حرامزادہ (شیطان)" یا کسی عہدہ دار کے ماتحت پیار میں آتے ہیں تو بجائے عالی جناب۔ فلاں صاحب کے کہہ اُٹھتے ہیں "ہمارا بڈھا" "ہمارا بوپلا"، عاشق صادق فرط محبت میں 'جان' اور 'روح' سب ترک کر کے گہرے سانس کے ساتھ پھول جیسے کان میں کہہ گذرتے ہیں۔ "اے ظالم"، یا اگر عاشق انگریزی میں بولے تو "اوہ تم پیاری ننھی سی شیطان"۔ نفسیات کے ماہر اس کی وجہ تلاش کرتے رہیں۔ مگر یہہ واقعہ ہے کہ انسان زیادہ پیار میں آتا ہے تو گالیاں دے بیٹھتا ہے اور اس طرح کی گالیاں۔ سہالیاں سمجھی جاتی ہیں۔ لہذا قارئین کرام کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ اُن کے ناراض کرنے میں کوئی وقیقہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اور اس امید کے ساتھ کہ ہماری پیاری پبلک اس جسارت کو انتہائے عقیدت اور پیار پر محمول فرمائیگی

سرشتِ انسان میں جہاں وہ زبردست قوتیں رکھی گئی ہیں جن سے جماعت کا ڈھانچہ
بنتا۔ اور پھولتا پھلتا ہے وہیں ایسے رجحان بھی ودیعت کئے گئے ہیں۔ جن سے ارتقائی رو میں
رکاوٹیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور ارتقا کے سرچشمے ۔ پھر اوپر والی لطیف صورت نمودار ہوتی کہ
پھر مزے کی بات یہہ ہے کہ یہہ سماج کے مخالف رجحانات بھی انھیں قوتوں سے دم لیتے ہیں
جو جماعت کی روحِ رواں ہیں۔ اس پر طرّہ یہہ کہ اس قسم کے رجحانات [illegible]
ارتقا و [illegible] انسان کے لیے لازمی ضروری ہیں۔ مثلاً فطرتِ انسان میں ایک زبردست
اس قسم کا رجحان وہ ہے جسے اگر آپ پسند فرمائیں تو ہوس کہیے۔ یہہ [illegible] بات آپ پر
کھلے گی لہذا پہلے سے ذہن نشین کر لیجیے۔ اور یہہ روزمرہ کی بات ہے کہ سماج کی ایک
اساسی قوت وہ خواہش ہے جس پر آدم و حوا نے جنت الفردوس کی برکات کو نثار کر دیا

اس انمول قوت کی بقا کے لیے جس میں سماج کی بقا اور ارتقا کا راز پنہاں ہے۔
سرشتِ انسانی میں لازمی تھا کہ اس خواہش کی جبلت ودیعت کی جائے جن سے سماج کی
بقا اور روز افزوں ارتقا میں اختلال کی گنجائش باقی نہ رہے مگر ساتھ ہی اس ہوس کا ثمرہ
یہہ بھی ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں چکلوں کی گرم بازاری ہے اور کس قدر نظر افروز ہے — اور
معنی خیز یہہ ہندوستان کا دستور رہا ہے کہ محفلِ عقد میں، جہاں اس عظیم الشان قوت کے
استعمال کی بقائے نوع کے لیے دولہا اور دلہن کو جماعت باقاعدہ اجازت دیتی ہے اس کے
لطف کو دوبالا کرنے، اس پر نشاطِ مستانہ کا رنگ دینے کی غرض سے 'بی شیریں جان' کو بلایا جاتا ہے
جن کا پیشہ ہی یہہ ہوتا ہے کہ ہوس کے شعلوں کو طرح طرح سے بھڑکائیں اور اپنے عطیاتِ
دلربائی کو متاعِ تجارتی بنائیں۔

اسی طرح فطرتِ انسانی میں ایک وہ رجحان ہے جسے "سماجیت" SOCIAL INSTINCT

کتنا سچا ہوگا جس کی بنیاد یہی آدم وحوّا والے 'میوۂ ممنوع' پر ہے۔ اس رجحان کا ہی ظہور ہے
کہ ہر نوجوان کا دل گھونگھٹ والی اور ایسی گھونگھٹ والی کو جو صرف اُسی کی گھونگھٹ والی بھی ہے
اپنی خانہ آبادی کے لیئے ڈھونڈھتا ہے اور ہر جوانی کی راتوں، مردوں کے دنوں
میں قدم رکھنے والی دوشیزہ کے دل میں گھر کرنے کا ارمان پیدا ہوتا ہے۔ اس رجحان کی
بدولت گھر بستے ہیں۔ خاندان نشو ونما پاتے ہیں، جماعت کا شیرازہ درست ہوتا ہے۔
دولت (STATE) معرض ظہور میں آتی ہے۔ قومیت (NATIONALITY)
حرّیت کی برکتیں بے دریغ لٹاتی ہے اور ملک کے چپے چپے سے، دودھ اور شہد کے
چشمے اُبل پڑتے ہیں۔ مگر یہ اُن ہی خوش قسمت زمینوں میں ہوتا ہے۔ جہاں یہ رجحان
افراط و تفریط کی بھول بھلیاں سے بچ نکلا ہو، جہاں اس نے ہوس کی تباہ کن زیادتی
نہ اختیار کی ہو۔ جہاں مذہب کی آڑ میں، سیاست کی اوٹ میں اور اقتصادیات
کی اوجھل بات بات پر ڈیڑھ اینٹ کی عمارتیں نہ کھڑی کی گئی ہوں۔

اگر یہ صحیح مان لیا جائے کہ تمام اقطاعِ عالم میں سرشت انسان یکساں ہے تو پھر یہ
بھی ماننا پڑے گا کہ یہ سماجیت کا ہوکا۔ یہ ڈیڑھ اینٹ کا لپکا ہر شخص کی فطرت میں
ودیعت ہے۔ انگلستان کے آزاد باشندے ہوں یا امریکہ کے حرّیت کے فدائی،
البتہ فرق اتنا ہے کہ تاریخ کی اندھا دھند موجوں نے سب طرف سے بہا بہا کر ڈیڑھ اینٹ
کی تمام اقسام وانواع کا غریب ہندوستان کو عجائب خانہ بنا دیا ہے۔ اور اسی لحاظ سے
ہندوستان کی طول وطویل تاریخ جس کی آج کل کے وطن پرستوں میں دفعتہً غیر معمولی محبت
پیدا ہوگئی ہے۔ ایک مسلسل ڈیڑھ اینٹ کی کہانی ہے، یکساں حماقتوں کا مجموعہ ہے
جس کے پڑھنے سے بے ساختہ کم از کم سرزمینِ ہند کے بسنے والوں کے لیئے۔ کارلائیل کا

معقول بالکل صحیح ماننا پڑتا ہے۔ اس طومار کی ورق گردانی سے سوائے اس کے کہ آپ کے دماغ میں ایک خواب پریشاں سما جائے اور کیا نتیجہ ہاتھ آتا ہے۔ اگر ہمارے بچوں کو تاریخ ہندوستان صرف اس زمانے تک پڑھائی جائے جہاں سے جان کمپنی JOHN COMPANY کا عہد شروع ہوتا ہے تو ایمان سے آپ ہی فرمایئے کہ کیا کوئی ایسا خیال جس کو دور سے حریت کی ہوا بھی لگی ہو، بچوں کے نوخیز دماغ میں پیدا ہو سکتا ہے؟ کوئی ایسا سیاسی سبق مل سکتا ہے جس سے اپنے آپ حکومت کرنے، اپنے حقوق، اپنی آواز منوانے کا اصول اور اکیڈمٹ یقین ذہن نشین ہو۔

اس دفتر بے معنی، اس ڈیڑھ اینٹ کی بے تعلیم یادگار۔ اس وسیع ملک کی خشارق آبادی کی حماقتوں کے روح فرسا انبار سے صرف ایک ہی منفعت ہو سکتی ہے اور وہ یہہ کہ اس سے اسی سرزمین کی، بعد کی نسلیں، اگر موروثی ڈیڑھ اینٹ ان کے خون میں باقی نہ رہے، اور دیگر اقبال مند اقوام عبرت لیں اور ماہرینِ سماجیات ایک قیمتی مسلسل اور نتائج خیز تجربہ تصور کریں۔ اگر کسی آبادی کے لیے یہہ بات باعثِ فخر ہو سکتی ہے کہ وہ ان اقوام کی عبرت اور ترقی کے لیے۔ جو ترقی کی جدّ وجہد میں آسمانوں پر پہونچ چکی ہوں اپنی حماقتوں اور جہالتوں کا ذخیرہ فراہم کرے تو ہندوستان کو اپنی اکتادینے والی ڈیڑھ اینٹ کی داستان پر ضرور فخر کرنا چاہیئے۔

یہہ خلاصہ ہے ہندوستان کی اس تاریخ کا جسے ڈیڑھ اینٹ کے رجحان نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے زمانے پر منقسم کر دیا ہے اور کس قدر متشکر ہونا چاہیئے زمانے کے مٹانے والے ہاتھ کا کہ اس خوابِ پریشاں کے بہت بڑے حصے کو بیسیوں صدیوں کے تاریک طبقات میں اس طرح دبا دیا ہے کہ ان کے پتھرا سے ڈھانچ بھی

ماضی پرستوں کے ہاتھ نہیں لگ سکتے ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ ڈیڑھ اینٹ کی ٹیڑھی ڈل
انواع میں اور کتنی انواع و اقسام کا اضافہ ہوتا ۔ ۔ مزہ تو یہ ہے کہ حال کے وہ ابیدہ
وطن پرست اس پر بجائے شکر و سپاس بجالانے کے، ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں
اور پھر بھی اپنے کو سچا وطن پرست شمار کرتے ہیں۔ ظرافت کی دیوی لوٹ لوٹ جاتی
ہوگی۔ وطن پرستی کا قدم آگے مستقبل کے اندھیرے میں ٹیکا ڈنٹول رہا ہے اور آنکھیں
ہیں کہ پیچھے کی طرف ماضی کے ڈیڑھ اینٹ والی نیرنگیوں بھرے چہرے پر لگی ہوئی ہیں
ہندوستان کی اصلی تو نہیں تاریخ تاریخ مستقبل ہوگی۔

آخر کار ہندوستان سے اقوام مغرب کا تصادم ہوا۔ خصوصیت کے ساتھ
اس قوم سے سابقہ پڑا جس نے اپنی شاندار تاریخ میں ہمیشہ اس امر کی کامیاب
کوشش کی کہ سماجیت کا رجحان ڈیڑھ اینٹ کی نیرنگیاں نہ اختیار کرے۔ یہاں
کی ساری کائنات ڈیڑھ اینٹ اور ظاہر ہے کہ ڈیڑھ اینٹ کی بساط ہی کیا۔ برطانیہ کو
حریت میں رچے ہوئے فرزند۔ تجارت اور حکومت دونوں میں طاق نکلے ۔ اور
تاریخ عالم کا ایک حیرتناک واقعہ ظہور پذیر ہوا، اور وہ ننھا سا جزیرہ ۔ برطانیہ۔ ہندوستان
کی برا عظم کی سی وسعت پر چھا گیا۔ یہاں تاریخ نے بھی ظرافت کا پہلو نہیں چھوڑا ۔
ڈوپلے ۔ (DUPIE ∞) اس لطیف خاک کا فرزند تھا۔ جہاں سے مولیر (MOLIE RE)
جیسا ظرافت کا دیوتا اٹھا تھا۔ ڈوپلے نے ہندوستان کی زبردست ڈیڑھ اینٹ
کے رجحان کا بغور مطالعہ کیا۔ اور یہ عجیب تاریخی انکشاف اس کے ہاتھ آیا کہ ہندوستان
میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اقتصادی، کم خرچ بالانشین اصول خوب کارگر
ہوسکتا ہے۔ چنانچہ خدا کی رحمت ہو ڈیڑھ اینٹ کے لپکے پر کہ ہندوستانی

فوجوں نے ہی ہندوستان فتح کیا اور کس کے لیے؟ برطانیہ کے لیے۔ اُن کے لیے جن کا اعلیٰ دماغ اُن کی ڈیڑھ اینٹ کی موروثی بلگت کے تاروں سے اُن کو کٹ پتلیوں کی طرح نچا رہا تھا اور دل ہی دل میں تبلیں بجا رہا تھا۔

غرض ہندوستانی افواج کا احسان کہ برطانیہ کو ہندوستان پر مسلّط کردیا۔ اُن کا دور دورہ ہوا۔ لارڈ میکالے کا کرم کہ ایک طرف تعزیرات ہند مرتب کیا اور دوسری طرف علادم مغرب کی گنگا بہائی۔

آج تقریباً ۰ ۳ برس ہوتے ہیں کہ چند ہندوستانیوں نے بعض حق پسند انگریزوں اور چند انگریزی کتابوں کی مدد سے ایک حیرتناک دریافت کی۔ ہندوستان کی لمبان چوڑان میں ایک سنسنی پیدا کردی اور 'دفترشاہی' صاحب بہادر بھی خواب مست 'نادرشاہی' سے چونک اُٹھے۔ وہ عجیب انکشاف یہ تھا کہ ہندوستانی بے ماں باپ کے سمجھے جاتے تھے۔ یہ غلط ہے۔ ہندوستانیوں کا ماں باپ موجود ہے اور وہ کوئی اور نہیں۔ ہندوستان ہے۔ جن تیز دماغ اصحاب کو یہ انکشاف پہلی دفعہ ہوا۔ وہ آرشی میدس کی طرح 'پالیا' 'پالیا' پکارتے ہندوستان کے کونے کونے میں تلپچتے پھرے اور آخر کانگریس کا بیج بو ہی دیا۔

'دفترشاہی' آسمان پر لال پیلی آندھیاں اُٹھیں، غضب کی بجلیاں کوندیں مگر قاعدے یہ طوفان بے وجہ تھے۔ اس لیے کہ اگر ہندوستانیوں نے اپنے ماں باپ کو خود آپ کی مثال اور آپ کے سکھانے پڑھانے سے، سینکڑوں صدیوں کے بعد پہچانا تو کوئی کسی کے باپ کو تو مارا نہیں۔ لیکن اصلی وجہ یہ تھی اور کس قدر لطیف بات ہے کہ خود ہندوستانی اس دریافت کے انتہائی معنی اُس حد تک نہیں

سمجھے تھے جس کا فرشاہی صاحب بہادروں کا سمجھ لینا خود برطانیہ کی تاریخ، امریکہ کی ناسعادتمندانہ جنگ اور انقلابِ فرانس کے شعلوں کی روشنی میں کچھ مشکل نہ تھا۔ اس میں صرف غلط فہمی اتنی ہوئی کہ فرشاہی دنیا نے کوتہ بینی سے سمجھا کہ اب کیا ہے سارا ہندوستان دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کھڑا ہو جائے گا۔ مگر ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ، کوئی ایسی ویسی تو تھی نہیں۔

اول تو ڈیڑھ اینٹ کی برکات کا ایک لطیفہ خیز اثر یہ تھا کہ جس زبان میں ماں باپ کی جدید وراثت کا نغمہ بلند کیا گیا وہ گنتی کے ہندوستانیوں کے سوا باقی ہندوستان سمجھا ہی نہیں۔ پھیپھڑوں کو پھیلا پھیلا کر، منہ پھاڑ پھاڑ کر، جبڑوں کو توڑ مروڑ کر پینترے کاٹ کاٹ کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر۔ برک کی بے نظیر بلاغت، اور عالی تخیلات اور گلیڈسٹن کے شاندار گونجتے جملوں کی نقالی کی جائے تو ہندوستانی حاضرین سوائے اس کے کیا سمجھتے کہ یہ آسمانی بلاؤں کے رد کرنے کے لئے کچھ منتر پڑھے جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی ظرافت فہم انگریز بھی ایسے مواقع پر ہوا تو وہ ان پہلی کھیپ کے وطن پرستوں کو ڈان کوئکزوٹ تصور کرتا ہوگا۔ جو خیالی عفریتوں پر حملے کر رہے ہوں۔

ان اکتسابی جذبات سیاسی کی بدولت جو زریں افلاک اور جواہر رنگ ستاروں کا دفتر تصور کی فضا میں کھل پڑا تھا اس کی نظرفریبی کو جب اصلیت کے تصادم نے ماند کیا تو عارفانِ بحرِ سیاسیات کی آنکھیں کھلیں کہ عرفان روحانی ہو یا سیاسی، بچوں کا کھیل نہیں۔ خصوصاً جب کہ اس ہندوستان کے ایک ہونے کے عرفان کی پہلی منزل میں ڈیڑھ اینٹ کی کرامات نے ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی ہو۔ مگر یہ

آنی دیوار صرف دیوار ہی ہوتی تو کچھ نہ تھا۔ اوس میں بیشمار بھڑوں کے چھتے بھی ہیں۔ ان چھتوں میں سے ہزاروں چھوٹے بڑے چھتوں کو سہولت کی غرض سے اور خیال کی جھاڑو سے اکٹھا کرکے 'ہندوؤں کا چھتہ' کہتے ہیں۔ اور بیسیوں نئے پرانے چھتوں کو اسی طرح یکجا کرکے 'مسلمانوں کا چھتہ' کہا جاتا ہے۔ چونکہ عالمگیر ارتقا دسے ڈیڑھ اینٹ اور وہ بھی ہندوستان کی آب و ہوا میں، کس طرح بچ سکتی۔ - اور تازہ تازہ چھتے بھی لگتے جاتے ہیں جن میں بالفعل نوٹ کے قابل عیسائی چھتہ، ہے جو اُس سب سے چھوٹے سیاسی دفترشاہی چھتہ سے بھڑا بھڑا انشو ونما پارہا ہے۔ جو دیکھنے میں چھوٹا ہے مگر سارے چھتوں پر چھایا ہوا ہو۔

اِن چھتوں کو دفعتاً چھیڑنے کی ہمت نہیں پڑی۔ چونکہ کانگریس کے معمار اوّل اوّل بیشتر اُس ہندوستانیوں کی نوع میں سے تھے جسے 'ہندو' کہتے ہیں، انھوں نے مناسب سمجھا کہ پہلے ذرا ہندوؤں کو بھی بھانپو۔ ہندو چونکہ اس قدر پرانے پڑچکے ہیں کہ قرنوں پیچھے کی یاد کو گھنگو لنے پر بھی حافظہ ہندوستان کے علاوہ کسی اور ماں باپ کا پتہ نہیں دیتا لہذا ہندو۔ ہندوستان کو ماں باپ ماننے کے لیے تیار نکلے۔ مگر صرف ایسے ہندوستان کے ماں باپ ماننے کو جو کسی اور کا ماں باپ نہ ہو۔

مسلمانوں پر بھی رفتہ رفتہ کانگریس نے ڈورے ڈالنے شروع کیے کہ آخر ان کی بھی تھاہ لینی چاہیے۔ مسلمانوں کے اجسام کو تو ہندوستان میں پایا مگر اُن کے دِل اور اُن کی روح کا سراغ چلایا تو حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ صدیوں کے بعد رنگ واستخوان کا تبدل، زبان اور گوشت پوست کا تغیر بھی اُن کی روح اور اُن کے دلوں کو عرب اور ایران، افغانستان اور ترکستان کی خاک سے نہیں تڑا سکا۔

مسلمان کانگریس کی چکنی چپڑی باتوں پر بدگمانی اور عارفانہ تبسم کے ساتھ
بولے "گنگا کی دلفریب لہروں پر ہمارے کارروان نے دنیا کا جاہ وحشم تو نثار
ہی کر دیا۔ کیا اب ہم اس قدر گئے گذرے ہو گئے کہ ہندوستان کو ماں باپ
بنا کر اپنی دین کی دولت بھی کھو بیٹھیں۔ ہم آپ کی بھائی بندی کو خوب سمجھتے ہیں"
اوّل تو مسلمان بھائیوں کے خال خال ہی لمبے اور میلوں لمبے شجرے ایسے ہوں گے
جن میں کہیں نہ کہیں ہندو خون کی پٹ نہ ملی ہو۔ انگونہ برج کی اصولی روشنی
میں ان نسب وحسب کے گراں مایہ سلسلوں کی جانچ کی جائے۔ دوسرے یہ
کہ مسلمان بھائیوں کا بیشتر حصّہ اُن لوگوں کا ہے جن کے آباؤ اجداد نے مندر کو مسجد
اور دھوتی کو پاجامے سے بدل دیا۔ ڈیڑھ اینٹ کی ستم ظریفی کہ اس
ہونے کو اَن ہوا سا کر دیا۔ خیر تعلیم سے ناآشنا مسلمانوں سے ڈیڑھ اینٹ
جو کچھ کرا لے کم ہے۔ مگر ظرافت کی انتہا تو یہ ہوئی کہ سرسید کے سے
روشن دماغ پر بھی ڈیڑھ اینٹ کے عشق نے سکّہ بٹھا کے چھوڑا۔

ڈیڑھ اینٹ کے گھن دار شجر کی ایک چھوٹی مگر کام کی ڈالی کو جھبڑ جھبڑایا
تو معلوم ہوا کہ پارسی اپنے آتشکدہ میں آگ روشن رکھنی چاہتے ہیں۔
اور کیا مضائقہ اگر وہ اور آگ نہیں وطن پرستی کی آگ ہو۔ ڈیڑھ اینٹ
کی تازہ پود عیسائی طبقہ پر کانگریس نے نظرِ شفقت ڈالی تو وہاں کا نرالا رنگ نظر
آیا۔ دفتر شاہی بلندیوں کے ہم مذہب ہونے سے دماغ بے قابو ہو ہی گیا تھا کہ
گوری چمڑی کی آدم و حوّا والی غلط کاریوں سے اس ہندوستانیوں کی نوزائیدہ نوع
میں چند ہاف ٹون یا دونوں وقت ملتے کی سماجی تصویریں کیا پیدا ہو گئیں کہ دماغ بے قابو تو تھا ہی

تب سے باہر ہو گیا۔ جن کو دفتر شاہی پیشے کے ساتھ روحانی ہمسری کا دعویٰ ہو اور اس پر سائے، کے رشتے کا بہانہ مل جائے تو پھر اُن کی نظروں میں کانگریس بھی کچھ مال ہے!

اب رہا دفتر شاہی حلقہ۔ سو وہاں ہر فرد بشر کو اپنے انگریز ہونے۔ لہٰذا ماں کے پیٹ سے علمراں نکلنے کے مزیدار احساس نے اس قدر نشے میں چُور کر رکھا تھا کہ اول تو کانگریس پر نظر ہی نہ پڑا وجہ سے ڈال کہ کہیں کانگریس اس نشے کے لیے ترشی تو نہیں نظر بھی ڈالی تو ایسی جیسے کوئی تماشا کی چوٹی سے کسی گہرے والی شے کو دیکھتا ہو۔ اور پھر نگاہ بھی پڑی تو برق افگن۔ اِن بلند ہستیوں اور بخلاف ہندوستانیوں کے اپنے ماں باپ کے فدائی فرزندوں کے حضور یہ لطیفہ تو کسی طرح پیش کرنے کی جرات ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ آپ ہندوستان کو اصلی ماں باپ تو خیر کیوں سمجھنے لگے، دودھ یا دھرم ماں باپ ہی تصور فرمائیں۔

غرض کانگریس کو ماں باپ کے پہچاننے اور پہچنوانے کا ثمرہ یہ ملا کہ اپنے بھائیوں کو بھائی بند بنانا چاہا تو انھوں نے آوازے کسے بدگمانیاں کیں اور بہتان اٹھائے۔ اور دوسری طرف دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر مول لیا۔

مگر کانگریس بھی میں کی گانٹھ نکلی۔ دفتر شاہیوں نے سمجھا کہ برقِ نگاہی جلا کے خاک کر دے گی۔ اور ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کے حامیوں نے خیال کیا تھا کہ کھیل ہے ہنسی میں اُڑا دیں گے۔ کانگریس کے لطیفہ سنج دماغوں نے اور ہی تدبیر نکالی۔ ایک تو یہ کہ ماں باپ کے نغمے کو وقت بے وقت ہر قسم کی راگ راگنی میں الاپتے رہو ہندوستانی سنتے رہیں گے تو ایک بات تو کان میں پڑی رہے گی۔

دوسرے کانگریس والوں کو ایک اور زبردست انکشاف ہاتھ لگا۔ جس سے اگر آپ چاہیں تو استدلال کر سکتے ہیں۔ کہ ضرورت نری ایجاد کی ماں ہی نہیں۔ بلکہ الہام اور القا بھی اسی کی کوک کے کرشمے ہیں۔

کانگریس کا دوسرا انکشاف لارڈ مارلے کے سادے الفاظ میں یہ تھا کہ "مغرب ہو یا مشرق غیر حکومت کا کسی قبلہ والوں میں گھر کرنا سہل سی بات نہیں" (لارڈ مارلے کے انڈین سپیچ بجٹ پیش کرتے وقت ۱۹۰۶ء)۔ لہذا یہ بجا توقع ہو سکتی تھی، کہ اگر ہندوستانی ہندوستان کو ماں باپ ماننے پر متفق نہ ہوں نہ سہی۔ اور یہی جنون انہیں ڈپٹی کمشنروں کے منہ پر وفاداری جتلاتے ہوں تو جتلائیں، ہندوستانی اس میں ضرور متفق ہوں گے کہ دفتر شاہی ارباب سے حکومت اور اقتدار کی آسائشیں، مزے اور برکتیں چھین لیں۔ صنف نازک کی دلربائی اور ازلی مسرتوں کے بعد انسان کے لیے اگر کوئی زبردست لالچ ہو سکتا ہے تو وہ اقتدار کی دلفریبیاں اور حکومت کے مزے ہیں۔ لہذا کانگریس نے دفتر شاہی چھتہ پر اعتراضات اور مطالبات کی دھواں دھار گولہ باری شروع کر دی۔ جب اس قسم کی جرأت سرکار انگریزی کے ساتھ دیکھی تو ہندوستانی ایک دفعہ تو آنکھیں اور منہ پھاڑ کے رہ گئے۔ بہت چاہا کہ کانگریس کی گستاخیوں کو حواسوں کا دھوکا یا ڈھٹ بندی سمجھیں مگر ہر سال یہی تماشہ نظر آنے لگا تو مجبوراً یقین کرنا پڑا۔ جرأتیں بڑھنے لگیں۔ اور کانگریس کے بیچ بونے والے اور ان کے تعلیم یافتہ چیلوں کے علاوہ بھی ایک حلقہ قدر والوں اور ہمدردوں کا پیدا ہو گیا۔ اور ان کے علاوہ ایک اژدہام تماشائیوں کا بھی نکل آیا جو محض سرکار انگریزی جیسی سرکار پہ تابڑ توڑ اعتراضات

کے مزے اُڑا نے کو جمع ہو جاتے تھے *

کانگریس کے ستم ظریفوں نے خوب سمجھ لیا تھا کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کے کھلے خزانے تفرقوں اور اظہر من الشمس نیرنگیوں کو یک لخت یہ فرض کرلیا گویا اُن کا وجود ہی نہیں۔ اور ہندوستان کو ایک جان اور ایک قالب قوم مان لیا اور پھر کیا تھا تاریخِ انگلستان کے عظیم الشان حریت کے سلح خانہ میں چار ہتھیاروں کی کیا کمی تھی۔ ستاون کا غدر جنگ رنی میڈ - RUNNYMEDE اور ملکہ وکٹوریہ کا اعلان منشور اعظم MAGNA-CHARTA بن گیا۔ کرام ویل اور شاہ چارلس کی گردن کا حادثہ اُلمہ۔ امریکہ کی جنابِ آزادی، فرانس کا ڈراؤنا انقلاب، اور خدا جانے کن کن تاریخی واقعات کی روشنی میں دفتر شاہی اربابِ حل وعقد کو یہ چونکا دینے والا لقب دیا گیا کہ آپ "محض ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خادم ہیں" ٹینی (ANGLO-INDIAN) اخبارات اور حلقوں میں اس پر فرانسیسی قہقہہ اُڑا۔ مگر جواب دینے بیٹھے تو حقیقت کھلی کہ اُن کا انگلستان کا کیا ہندوستان میں آگے آرہا ہے۔ میاں میکالے فرطِ ہمدردی نوعِ انسان میں شاندار غلطی کر گئے کہ تاریخ انگلستان کے حریت کے مقدس خزانوں، ملٹن اور مل (MILL) برک اور برائٹ کے انمول جواہر پاروں کے لیے "کھل جا سمسم" والا منتر سکھا گئے۔ دفتر شاہیوں کو ٹٹھول پر مائل پایا تو کانگریس کے چبوترے سے آواز گونجی "ذرا سوچ سمجھ کر ہنسیے۔ جو انگریز ان مقدس اصولوں کو نہ تسلیم کرے وہ انگریز ہی نہیں"

---

* ملاحظہ ہو مانٹے گو چیمز فورڈ رپورٹ صفحہ۔

اُس کو چاہیئے کہ اپنی تاریخ اور اپنے اجداد کے کارناموں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دے"
بھلا اصولِ حریت سے کون انگریز انکار کر سکتا ۔ دفتر شاہیوں نے با دلِ ناخواستہ
اصول کو مانا مگر اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ کانگریس نے اس قدر غل مچایا کہ اوّل تو کچھ کہنے
ہی نہیں دیا اور پھر جب شملہ کی بلندیوں سے ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کی طرف
انگشتِ طعن سے اشارہ کیا گیا تو کانگریس کے پنڈتوں نے اس کا جواب یہی مناسب
سمجھا کہ پہلے تو پیترا ہی کاٹ جاؤ اور پھر چاہے کا گر ہو یا نہ ہو انگلستان کی ڈیڑھ اینٹ
کھینچ مارو ۔

مختصر یہ کہ اب کانگریس ایک چیز ہو گئی ۔ ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ سے جو بابل
کی طرح بے گنتی زبانیں ہندوستان میں وضع ہو چکی ہیں اُن میں اخبار نکلنے لگے
اور اخباروں میں کچھ اوندھی سیدھی سیاسیات پر تحریریں بھی ہونے لگیں ۔ اُن
اڈیٹروں کو سیاسیات کی واقفیت سے زیادہ پیسے ٹکے کی حاجت تھی ۔ اور پیسہ
ٹکا صرف یوں ہی مل سکتا تھا کہ سرکار انگریزی پر لگے تو تیر ورنہ تکا حملے کیئے جائیں ۔
کانگریس کا عجیب انکشاف کہ ہندوستانی ہندوستان کو خالی خولی اور بالکل
ماں باپ نہیں مانیں گے جب تک حکومت کے لالچ کا واسطہ نہ دیا جائے ، چونکہ نفسیات
کے اصولِ مسلمہ پر مبنی تھا کامیاب ہونے لگا ۔ اور ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کو
ہندوؤں میں " وندے ماترم " کا شور کہانے لگا اور دوسری طرف بھی کچھ کچھ
" ہندوستان ہمارا " کا دھیما سُر سنائی دینے لگا ۔ اس اثنا میں ہندوستان کی
باگ ایک ایسے نڈر ہاتھ میں دی گئی جو دنیا کی منجملہ اُن چند ہستیوں کے ہے
جن کی ذات سے بڑے بڑے کرشمے ظہور پذیر ہوتے ہیں مگر جن کے سر بدنامی کا سہرا بھی

رہتا ہے اور وہ ذات ۔ کارگذاری کا زبردست دیوتا ۔ خودرائی کا اوتار ۔ لارڈ کرزن کی ذات تھی ۔ وہی لارڈ کرزن جن کی شان میں اور جن کے منہ پر چند سال بعد دارالامرا میں، اونکی ہمہ خصوصیتوں اور بے نظیر قابلیتوں کو تسلیم کرکے لارڈ مارلے ؎ ظرافت کی جان پیرایہ میں یوں فرمانے والے تھے "لیکن کارگذاری (EFFICIENCY) کے نقطہ نظر سے عالی مرتبت لارڈ (کرزن) کا کارنامہ خواہ کتنے ہی شاندار پیمانے پر تصور کیا جاوے، اُنھوں نے ہندوستان کو جس حالت میں الوداع کہا، اوس پر نظر کرتے ہیہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ایسے پرآب و تاب اور بلند حوصلہ عہد حکومت کا یہہ انجام قابل اطمینان تھا ۔ ؎"

لارڈ کرزن نے ایک تو کارگذاری کی مشین ایسی درست کی کہ اُس میں انسانیت کا احساس ہی باقی نہ رہا ۔ سررشتوں کا کام ریاضیات کی صحت اور برقی سرعت کے ساتھ ہونے لگا لیکن ۔ شاید زمانے کی مادہ پرستی کا اثر تھا ۔ اس کو بھلادیا گیا کہ حکمراں اور محکوم دونوں بہ حیثیت انسان روح بھی رکھتے ہیں جس کو نہ ریاضی کا کوئی پیمانہ ناپ سکتا ہے اور نہ جس پر برقی قوت اثر کرسکتی ہے ۔

لارڈ کرزن نے اپنی غیر محدود سیاسی دانشمندی کے خمار میں کانگریس کو محض زبانی جمع خرچ اور پمپھلٹوں کی ورزش تصور فرمایا ۔ ہندوستان ڈیڑھ اینٹ کے مرض کہنہ کو ابداً لاعلاج تشخیص فرمایا اور کانگریس کی باتوں کو سمجھا کہ بڑھے طوطے بول رہے ہیں جو محض اسی قابل ہیں کہ ان پر برطانوی شہنشاہیت (IMPERIALISM) کے دم بھرنے والے مطلق التفات ہی نہ کریں ۔ اگر دل میں یہہ خیال کرتے تو حیرودل میں کون گھسنے پاتا

؎ لارڈ مارلے کے " انڈین کی چیز " مسودہ مجالس ہند کے دوبارہ پیش کرنے کے وقت (صفحہ ۱۲۱)

غضب یہ کیا کہ تقریر بازی کا چسکا تھا۔ دھواں دھار تقریروں میں بول بھی گئے۔ بولنے پر
بھی کچھ نہیں گیا تھا۔ کانگریس والے بہت بگڑتے تو ایک شہنشاہیت کے فدائی کی بڑ کچھتے
اور کچھ قلم اور زبان کا غل بلند کرتے۔ ستم یہ ہوا کہ کارگذاری کی ترنگ میں تقسیم بنگالہ کا مسئلہ
لے بیٹھے۔ قلم کے اژدہے آتشیں پھنکارے مارتے ہی رہے اور پھیپھڑے صدائے
احتجاج کا طوفان برپا کرتے ہی رہے مگر اس آہنی ارادے کے جادوگر نے تقسیم کو
سچ مچ جیتا جاگتا واقعہ کر ہی دکھایا۔

تقسیم بنگالہ کی شورش ایک اور عجیب سیاسی لطیفہ ہے۔ کوئی پوچھے کہ اتنی زبردست
شورش کا آخر ایسا ہی کوئی زبردست سبب بھی ہوگا؟ تو اس کا جواب سوائے اس کے
کچھ نہیں کہ ایسی وجہ جس سے تقسیم بنگالہ محض بلحاظ کاغذی تقسیم کوئی ہولناک تباہ کن تجویز
ثابت ہو اُسی روز معلوم ہوگی جس دن ریاضی داں دائرہ کو مربع کر دکھائیں گے۔ اور
حیاتیات (BIOLOGY.) کو ارتقائے آدم کی گم شدہ کڑی ہاتھ لگ جائیگی

اصل بات یہ ہے کہ کانگریس کے ارباب حلّ و عقد میں بیشتر وہ لوگ تھے جنکی
تعلیم کا بڑا جز شیکسپیر ہو چکا تھا۔ اور کون شیکسپیر کا شیدائی ایسا ہے جس نے ہملیٹ
(HAMLET) پر سر نہ دھنا ہو۔ ہملیٹ، شاعری کے بے مثل دیوتا کا
حیرتناک کھیل ہے۔ حیرتناک اس وجہ سے کہ ماتم کے تیرو تار جامے میں ظرافت
کی دیوی کا بے نظیر جلوہ ہے۔ جسے شیکسپیر کا ہی خلاق دماغ پیدا کر سکا۔
اور جسے اوس کا ہی گلتراش قلم الفاظ کا جامہ پہنا
سکا۔

اِس "دبی سسکی کو" قارئینِ کرام تسلیم کریں یا نہ کریں، مگر کانگریس کے حامیوں نے بھائی بندوں کے آوازوں، دفتر شاہیوں کے طعنوں اور سنئیر وائسرائے کی چبھتی تقریروں اور حقارت آمیز عمل سے ہملٹ کی طرح مجبور ہو کر محسوس کیا کہ اب ناٹک کی سی باتیں بہت سی ہو لیں۔ کانگریس سے سب عمل کے طالب ہیں اور عمل پر ہی "ہونے یا نہ ہونے" کا انحصار ہے۔ کانگریس کو ہملیٹ کا قول یاد تھا کہ "سچی اولوالعزمی کے یہ معنے نہیں ہیں کہ کوئی بڑی وجہ پیش نظر نہ ہو تو بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ نہیں۔ اولوالعزم وہ ہوتے ہیں جو عزت کو معرضِ خطر میں پاتے ہیں تو اولوالعزمی کے ساتھ ایک تنکے پر جھگڑ بیٹھتے ہیں"۔

چنانچہ با وجہ یا بلا وجہ تقسیم کی شورش کے شعلے بھڑکے اور ایسے بھڑکے کہ کانگریس کی باتیں مشاعرہ کی دل خوش کُن تعلیاں۔ اور ناٹک کے چبوترے والی دھمکیاں نہ رہیں۔ مگر ساتھ ہی کانگریس کی دُوندے مانزم کی لوہی کی ساختہ پرداختہ فدائیوں نے۔ جو ہندوستانیت کی شمع کے اندھا دھند پروانے تھے، اپنے گرانمایہ قابلِ تقلید ایثار اور اپنی قابلِ افسوس کوتہ اندیشی سے۔ جہاں کانگریس کی آواز کو گوزِشتر کے رتبے سے اُٹھا کر آنے والی ہندوستانی قوم کی آواز بنا دیا وہیں حبذ سیاسی میں اُس کو رانہ رجحان کے بیج بھی بو دیئے۔ جو ہارڈ ہارڈنگ کی بلند اور شریف پیشانی پر ہندوستان کی ہمدردی کی روشن تحریر نہ پڑھ سکا۔ کیا یہہ خیر و شر کی آمیزش عین ظرافت نہیں۔؟ مانا کہ آپ اُس پر اُسی طرح تبسم بھی نہیں کر سکتے جس طرح ہملیٹ کے پڑھنے پر ظرافت کے تبسم کے ساتھ۔ آپ جوں جوں فطرت انسان کی گہرائیوں میں اُترتے جائینگے تبسم ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کی طرح پھیکا پڑتا۔ اور اُڑتا سا جائے گا۔ یہاں تک کہ

زندہ دلی اور افسردہ دلی میں تمیز باقی نہیں رہے گی۔

الغرض لارڈ کرزن اپنے اُس عظیم اور عمیم احسان کو محسوس کرکے جو ہندوستانی قومیت کے جگا دینے میں مضمر تھا اپنی آخری تقریر میں یہ فرماتے ہوئے کہ "ہندوستان ہی میری مشغولیت" تشریف لے گئے۔ اسی زمانے میں ولایت کی قوم کے فضائے احساس میں تبدیلی سے۔ تبدیلِ وزارت کی صورت اختیار کی۔ اور لارڈ مارلے وزیر ہند ہوئے۔ اور لارڈ کرزن کے جانشین لارڈ منٹو۔ پنڈت مالوی جی کے لائق بھائی اور اس برخوردار راقم کے لائق چچا، مسٹر گوکھلے نے اپنے کانگریس کے خطبۂ صدارت میں اس طرح لمبا سانس سے کہ جس طرح کسی بُری بلا سے پنڈ چھوٹنے پر کوئی لے، لارڈ کرزن کے "اورنگ زیبی دور" پر فاتحہ پڑھی اور امید کی جگمگاتی کرنوں میں برک کے سوانح نگار۔ مِل کے چیلے اور گلیڈسٹن کے سیاسی لگادیا یارسے جو قوس و قزح والی توقعات وابستہ ہونی چاہئیں۔ اُن کا سرپایۂ نغمہ ذرا قبل از وقت۔ بلند کیا۔ لارڈ کرزن اور اورنگ زیب والی احسان مندانہ تمثیل پر لارڈ کرزن نے خواہ کچھ ہی محسوس کیا ہو، ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کی ایک سنع ذرا کسمسائی ضرور۔ مگر یہہ پھبتی تھی ایسی کہ قلم سے آپ ہی آپ نکل پڑی اور دل میں جا بیٹھی

غرض اب دیکھنا یہ تھا کہ زمانے کا عبیق رحم کیا شگوفہ کھلاتا ہے۔ کیونکہ 'مردِ عمل' لارڈ کرزن کی ڈالی ہوئی گلجھٹی سلجھانے کو، اُس نا قابل شنوائی ہستی کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جسے فلاسفر کہتے ہیں اور جس سے خصوصیت کے ساتھ 'خاصۂ المقام' عمل کی فدائی دفتر شاہی سخت پرکا کرتے ہیں۔ لندن اور شملہ نے دفتر کے دفتر سیاہ کیے۔ انگلستان

اور ہندوستان کے اخباروں نے دل کھول کر سیاہی کے دریا بہائے - چھیپھڑوں فوا بلند سردوں میں پیٹ بھر کے مدح شیں کیں اور اس تمام تلاطم خیالات میں انقلاب فرانس کا زبردست واقف کار ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کے مطالعہ میں مصروف رہا - ڈیڑھ اینٹ کی رنگا رنگی نے ڈراؤنا خواب بن کر اس قدر سہمایا کہ مسٹر گوکھلے کی توقعات کا مطلق خیال نہ کیا اور لارڈ مارلے نے آخر میں چلکر فرما ہی دیا کہ "اگر اصلاحات سے ہندوستان میں شوریٰ (پارلیمنٹ) کی سی حکومت قائم کرنے کا گمان بھی پیدا ہو - تو ایسی اصلاحات سے مجھے رتی برابر بھی سروکار نہیں ہوگا"*

ڈیڑھ اینٹ کی پیچاں نے کچھ اس طرح دماغ کو دہلا دیا تھا کہ صرف اتنے پر ہی اکتفا نہیں کی لارڈ ملے پیشین گوئی پر اُتر آئے جو پیغمبری کے دعویدار ہی کر سکتے ہیں :- اُنھوں نے فرمایا "اگر میری عمر، سرکاری یا طبعی اُس مدت سے جس کی توقع ممکنات سے ہو بیس گنا زیادہ طولانی کر دی جائے تب بھی میں کبھی ہندوستان میں شورائی (پارلمنٹری) حکومت کے بلند منصوبے کو اپنا مطمح نظر نہ قرار دیکھوں گا" اس طرح، اگر لارڈ مارلے کا سن (اسّی) اور اُن کی پیشین گوئی، صحیح مان لی جائے تو دفتر شاہیوں کو تقریباً دو صدی تک مطلق العنانی کا اطمینان دلا دیا - البتہ برگ اور برائٹ ملٹن اور مل جیسے حرّیت کے دیوتاؤں نے - چند ہندوستانیوں کا دماغ لڑا دیا تھا - اور خود لارڈ مارلے کی عمر بھر کی پونجی وہی اصول تھے - ان کے سکونِ دماغ اور اپنی تسکینِ ضمیر کے لیے کچھ تدبیر ہونی ضروری تھی -

واقعی حکومت، پوری کی پوری تو جیسر چاند کا زمین پر اُتارنا ہے - اُس کا

* لارڈ مارلے کے انڈین بجٹ تقریر مجوزہ اصلاحات پر (صفحہ ۹)

ذرا ساحصّہ بھی دنیا ر انگلستان کی اخلاقی ذمہ داری کو معرضِ خطر میں ڈالتا ہے۔ مگر لارڈ کرزن کے پیدا کیے ہوئے طوفان پر سکون بخش تیل نہ انڈیلنا بھی سیاسی حماقت ہوگی۔ لهذا ظاہر تھا کہ "دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" اس نتیجے پر پہونچنے کے لیے تو کسی بڑے فلسفہ سیاسیات کی حاجت نہ تھی۔ مگر مزے کا مسئلہ یہ تھا کہ لقمہ ایسا ہو کہ دولت کی چاٹ سے زیادہ ثقالت نہ رکھتا ہو اور ساتھ ہی لیسدار سپیاری کی طرح سرعت سے زیرِ گلو بھی نہ ہو سکے۔ ایسا سیاسی لقمہ ایک فلاسفر مدبر ہی تجویز کر سکتا تھا اور لارڈ مارلے کا دماغ اُس طرف لگا ہوا تھا کہ ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ نے پاکج کی لی اور اُن کا ہاتھ بٹا دیا۔

مسلمان بھائی اول اول تو کانگریس کی باتوں کو لن ترانیاں سمجھتے رہے۔ حکومت کی لالچ سے ذرا پسیج چلے تھے کہ شورش اور سیاسی آتشبازی سے بدک گئے۔ دفترِ شاہی ہاتھ پچکارنے لگا اور بیموقع اور بے موقع وفاداری جتھانے لگے۔ سمجھا تھا کہ اب کیا ہے سرکارِ انگریزی کانگریس اور اس کے حمائیتوں کو پیس کر اُن کی خاک چاروں کھونٹ میں اُڑا دے گی۔ مگر بجائے اس ٹروانا، کے برطانیہ کو مراعات دینے پر آمادہ پایا تو بہت سٹ پٹائے۔ شملے کی اونچائی خوب ناپی۔ لندن کی خبر لی جہاں معلوم ہوا کہ معزز سید امیر علی صاحب نے سسرال کو وطن بنا لیا ہے مگر ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کی کٹک اُن کے ہندوستانی دل سے نہیں گئی ہے۔

کاغذی گھوڑی دوڑے۔ پیامات برقی پروں پر اُڑے اور بڑے بڑے سر ہے اور پھیپڑے پھڑ پھڑائے اور مسلمانی ڈیڑھ اینٹ سیاسی صورت لے کر "مسلم لیگ"

بن گئی او انتخاب جداگانہ کا نغمہ بلند کیا۔ پردہ ہی پردہ میں دفترشاہی نغمہ نے بھی گلا ملا دیا۔ اب کیا تھا۔ برطانوی حریت کی جان انصاف ہے۔ لارڈ مارلے انصاف پر تل گئے۔ اس ڈیڑھ اینٹ کی عین وقت کی کرامات نے خاص سیاسی نغمہ تجویز کرنے میں گرانقدر سہولت پیدا کر دی۔ یہہ آرزو کرتے ہوئے کہ کاش ڈیڑھ اینٹ کی بدولت انتخاب کو رجسٹر علیحدہ علیحدہ قرار نہ پاتے۔ لارڈ مارلے نے ہندوں اور مسلمانوں کے ڈیڑھ اینٹ والے بل کی کیا خوب تعریف کی کہ اس کو محض اصول وعقائد مذہبی کا تفرقہ نہ سمجھئے روزمرہ کی زندگی، روایات تاریخ اور تمام سماجی باتوں اور اصول وعقائد مذہبی کے تفرقوں سے اس گرانبہا ڈیڑھ اینٹ کا خمیر ہوا ہے۔ مشہور ہے کسی انگریز سے پوچھا گیا کہ "آپ کو ہندوستان کا کونسا میوہ بھایا" تو اس ستم ظریف نے ایک لفظ میں لارڈ مارلے کی ساری ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کی تحقیقات بھر دی۔ اوس نے ہنسکر صرف یہہ کہا "پھوٹ"

القصہ لارڈ مارلے نے اپنے دست مبارک سے لقمہ دیا۔ اور حقیقت یہہ ہے کہ اس کے تیار کرنے میں انگلستان کا بے نظیر تدبر استاد سیاسی نے صرف کیا۔ ظرافت کی دیوی کا یہہ بھی تاریخی کرشمہ ہے کہ لارڈ مارلے سا صاحب اصول اور سیاسی ملمع سازی میں یدطولیٰ کا اظہار! اگر ملمع آخر ملمع ہے۔ جو نیا راستہ نکالا تھا وہ بیچا اصلی حکومت کے قرب وجوار میں آکر بند گلی ثابت ہوا۔ کانگریس کے گرہ کشا دماغوں کو تسلیم کرنا پڑا "جائے استاد خالی است" اتنے غل غپاڑے

* لارڈ مارلے کی "انڈین سپی چیز" مسودہ مجالس ہند کے دوبارہ پیش کرنے کے وقت (صفحہ ۲۰۴)

دھمکیوں اور دھماکوں کے بعد حکومت کے چند عیادیتے والے طلسمات میں
ہندوستانیوں کو ایک آدھ قدم آگے بار ملا۔ مگر طلسمی کنجی جس ہاتھ میں تھی اُسی
کی آہنی گرفت میں رہی۔ حکومتِ ہند کی بساطِ شطرنج سامنے بچھی تھی۔
کھیلنے والے اور۔ ہندوستانی تماشہ دیکھنے والے۔ چالوں پر آپ رائے
دیجیئے۔ شاطروں نے رائے مانی تو دل میں اپنی دانشمندی پر پھولیئے یا بغلیں
بجائیے۔ اور ایسا اتفاق نُدرکا موقع بھی بہت کم ملتا تھا۔ ورنہ آپ کی آواز راجپوتانہ
کے ریگستان میں گوزِ شتر۔ اور حاصل یہ کہ پھیپڑے اور جبڑے غیر مادری زبان
کی مشق سے بری طرح دُکھنے لگے۔

اگر لارڈ منٹو اور لارڈ ہارڈنگ کا سایہ اصلاحات کی تراشی ہوئی مجالس ہند
پر نہ ہوتا تو سیاسی جدّت طرازی اور ملمع سازی کی ان صاحبزادیوں میں
جان ہی نہ پڑتی۔ خصوصاً لارڈ ہارڈنگ کے شریف دل میں انگلستان کے
بعد ہندوستان کی جگہ تھی اور وہ خوب سمجھ گئے تھے کہ بناوٹ، انگلستان
ہو یا ہندوستان، بناوٹ ہی ہے۔ اصلاحوں کے اس لقمے سے اس میں
شک نہیں کہ ہندوستانیوں کو حکومت کی کارستانیوں اور کارگذاریوں پر
زیادہ تنقید کرنے کا موقع ملا اور حکومت کی رائے پر ہندوستانی احساسات
کا اخلاقی اثر ضرور پڑنے لگا مگر پھر بھی انسان انسان ہے کالا ہو کہ گورا، حکومت
کی کارروائیوں پر تنقید اس توقع پر دلچسپ ہو سکتی ہے اور ناقدانِ حکومت
اسی دلفریب ارمان پر بال کی کھال کھینچتے ہیں۔ جان تک لڑا سکتے ہیں کہ جب
قومی کے دل میں اپنے نقطۂ نظر کو مفید اور برسرِ حکومت فریق کی سیاسی

رفتار کو مضر ثابت کر دیں تو پھر قوم کی مرضی سے جس کا اظہار کثرت آراء سے ہے حکومت کی کشتی کے خود ناخدا نہیں اور اپنے اصول کو عمل کا جامہ پہنا سکیں۔ اسی عظیم الشان اصول میں برطانیہ کی بے نظیر آئینی لچک اور بے مثل خوبی مضمر ہے اور یہی وجہ ہے کہ انگلستان کی ہر حکومت کے ساتھ ساتھ ایک مدمقابل رقابت کا وجود ایسا جزو تشکیلی ہو گیا ہے جیسا دو جوروں والے گھر میں سوکنا پا۔ حکومت ہند کی سبھا میں ہندوستانی رقابت کے جلے پھپولے پھوڑتے رہیں۔ اور اس یقین کامل کے ساتھ کہ حکومت کے اصلی شاہد مقصود سے کبھی وصال نصیب نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں ممکن تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی مجلس قانونی میں صرف ارد و شعرا کے انتخاب کی شرط لازمی کر دی جاتی۔ حکومت کے کاموں کی تنقید کوئی کھیل نہیں پاپڑ بیلنے میں اور دماغی پاپڑ بیل بیل کر بھی کچھ ہاتھ نہ لگے تو سیاسی بیکلی اور بے چینی اپنے آپ پیدا ہو۔ اور ناامیدی کی جلن اور مایوسی کے ایندھن سے شورش کا بھڑک اٹھنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ لارڈ ہارڈنگ کی ہمدردانہ رفتار نے اور ہمتیں بلند کر دیں اور اس پر دربار شاہی، نے سونے میں سہاگے کا کام دیا۔ دفتر شاہیوں نے دربار کی خبر سنتے ہی بغلیں اور تالیاں بجائیں کہ اب کیا ہے۔ خرچ ہندوستان کا اور ہم اور ہمارا میم صاحب انگریز اور صاحبِ حکومت ہونے کے مزے لوٹیں گے مگر جب دربار ہوا اور مراعات اور تبدیل پایۂ تخت کا راز افشا ہوا تو ظرافت کی دیوی دفتر شاہیوں کے چہروں کی بلائیں لینے لگی۔ ایک طرف بابوؤں کی تنگ سری دنیا کے حسب منشا تقسیم بنگالہ کی عملاً

تنسیخ ہو جائے اور دوسری طرف دفترشاہیوں کی چاہتی نکالتہ والے ساسی ڈیڑھ اینٹ ڈھا دی جائے اور یہ سب اس طرح ہوتے ہو جیسے کھیل ہیں کوڑ پھوٹ اعانت اور ولیس آپ دفترشاہیوں کے ہیجانِ طبع کا اندازہ خود فرمالیں۔ یہی اخبار نے حیران ہوکر پوچھا کہ کیا اس طرح ایسے بڑے بڑے انقلابات بغیر جناب کے دخل میں لائے اور خصوصاً بغیر اخبارات کی رائے کے انگلستان میں ہو سکتے ہیں تھا ہے کہ اس کا جواب سیدھا سادھا یہی تھا کہ انگلستان میں ایسا ہو یا نہ ہو مگر یہ ہندوستان ہے اور جب ہندوستانیوں کے نشا کے خلاف ہمیشہ ہی کام ہوا کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک آدھ کام دفترشاہیوں کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

مگر اسی اثنا میں گو یا دفترشاہیوں کی منہ مانگی مراد ملی کرنے پائے تخت کی بہت سے تاریخی تماشے دیکھے ہوئے شاہراہ پر وہ شرمناک حادثہ پیش آیا جسے کاش تاریخ بھلا دے۔ لیکن یہاں ظرافت کی دیوی دلخراش طعن کے لہجے میں ہنستی ہے کہ لکھنے والی انگلی نے جو لکھا لکھا۔

ان ہی دنوں میں اسلامی دنیا پر بلاؤں کے بادل چھانے لگے۔ اٹالیہ نے طرابلس پر ڈاکہ مارا۔ ڈاکہ اس لیے کہ طرابلس میں نہ اطالوی آبادی تھی اور نہ اطالوی بادری کوئی سیاسی وجہ سوائے جوع الارض کے نہ تھی۔ اٹالیہ کی اس شرمناک یورش اور بڑی یورپ کی خاموشی نے جو خود ایک طرح کی تائید تھی بلقان کی ریاستوں کو ابھارا کہ اپنی آزادی کی تکمیل اس طرح کریں کہ سلطنت عثمانیہ کے یورپی حصے کو آپس میں بانٹ کھائیں اور ملک معظم کی ہندوستانی مسلم رعایا کے دل پاش پاش کر دیں۔

کانگریس نے در اصل ڈیڑھ اینٹ سے جنگ شروع کی تھی مگر مصالح وقت اور ماحول کی ڈیڑھ اینٹ والی چلّو نگی کی وجہ سے یہی دانشمندانہ رفتار اختیار کی۔ کہ ڈیڑھ اینٹ پر بالراست حملہ نہ کیا جائے۔ جیساکہ اوپر کہیں عرض کر آئے ہیں حکومت کی لالچ کو واسطہ بنا کر دفتر شاہی آہنی قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی گئی اور یہ طریقہ ایک دودھاری تلوار تھی جس سے ایک طرف ہندوستانیوں کے فطری حقوق کی بندشیں کچھ کچھ کٹنے لگی تھیں اور دوسری طرف ڈیڑھ اینٹ بھی ذرا ذرا سی جھڑنے لگی تھی۔ ظرافت کی دیوی پھڑک اٹھی۔ جب قومیت کے ہیولیٰ پرستوں کو اپنے تخیّلات کا گلا گھونٹ کر ڈیڑھ اینٹ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا پڑا۔ یہ ظاہر تھا کہ مسلمان بھائیوں کو بری طرح بلاد اسلامیہ سے دلبستگی ہے اور اگر کانگریس واقعی طور پر مسلمانوں کو بھائی کہتی اور سمجھتی ہے تو مانا کہ قومیت کے بلند ترین تخیلات کے نظر کرتے "چین و عرب ہمارا" کی راگنی بے سری اور بے وقت اور اندلس کی ڈالیوں والے آشیانہ کی اشکبار یاد عبث ہی سہی مگر کیا کیا جائے موجود ہ کر اور روح کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں گاڑے ہوئے ہو۔ علاوہ اس کے اگر کانگریس اُن کے اس دور میں شریک ہو تو ہندوستانی قومیت کا حرف کچھ بگڑتا ہی نہیں بلکہ مسلمان بھائیوں کا اس طرح دل لینے سے ایسی قومیت کو وہ تقویت پہونچ گئی جس سے ڈیڑھ اینٹ کے رجحان اور دفتر شاہی نخوت دونوں کو صدمہ پہونچے گا۔

اور واقعہ یہ تھا کہ سچ مچ مسلمان بھائیوں کا دل بہت ہی دکھ چلا تھا۔ بلاد اسلامیہ پر بلاؤں کے نزول نے اُن کی جغرافیائی حدود سے مستغنی وطن پرستی کو سخت صدمہ پہونچایا ہی تھا کہ خود ہندوستان اپنے گھر میں ایک اور دل پر چوٹ پڑی۔ خود مسلمان

بھائیوں نے دماغ پر بڑا زور ڈالکر علاج جملہ علّت ہا والی دوا کی تحقیقات کی۔ اور یہ دوا مسلم یونیورسٹی کا ولولہ انگیز سبز باغ والا خیال تھا۔ اور یہاں ہندو بھائیوں نے بھی خوشامد کا وہ نفیس پیرایہ جسے تقلید کہتے ہیں اختیار کیا اور لطف یہ کہ تقلید بھی گورانہ۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس یونیورسٹی کے ضبط پر کئی اعتراض جڑ دیے۔ ان میں سے ایک اعتراض۔ خواہ وہ کسی نقطۂ نظر سے ہو۔ یہ تھا کہ تعلیمی مورتیوں کی درخشندہ پیشانیوں پر ڈیڑھ اینٹ میں سنے ہوئے نام "ہندو" اور "مسلم" وطن پرستی کے روشن زمانے میں تحریر نہ کیے جائیں۔ یہ ایسا اعتراض تھا کہ وہ وطنیت کے ہیولی پرست فدائیوں کی زبان سے ہونا چاہیئے تھا۔ مگر زمانہ کی ستم ظریفی کہ گورنمنٹ، عین وطن پرستی کی بات بھی کہے تو نہ مانو۔ ہندو بھائیوں اور مسلمان بھائیوں نے غل مچا دیا "داد وا۔ وہ علم ہی کیا جو ہندو کو ہندو اور مسلمان کو مسلمان نہ رکھے اور وہ تعلیمی مرکز ہی کیا جہاں ہمارے شاندار علوم کی گنگا نہ بہے" غرض بنارس ہندو یونیورسٹی معرض وجود میں آئی اور تھوڑی دیر وطن پرستی نے بیچارے ہندوستان کو بہلا کر بغلوں میں ہتلیاں دے خوب بغلیں بجائیں مگر مسلمان بھائی اپنی نئی تحقیقات کے گھمنڈ میں ایسے اڑے "ہم تو ویسی ہی یونیورسٹی لینگے جو ہمارے خیال میں ہے" کہ یہ ڈیڑھ اینٹ کی تعلیم نما ہندوستان فراموش مسلم صاحبزادی زمانہ کے رحم کے اندر ابھی حالت جنین میں ہے۔ اس خدا جانے کن کن دماغی محنتوں اور ارمانوں کے اکتشاف پر اوس کے پڑ جانے سے بغلی گھونسہ بن کر مسلمان بھائیوں کے دل پر جو آپ ہی بلاد اسلامیہ کے صدموں سے پکّے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ بری طرح ٹھیس لگائی

مسلمان ایک طرف اقبال کے منہ سے اللہ میاں کا شکوہ گانے لگے اور دنیا سے
بیزار ہوگئے اور ہندو بھی رنگ دنیا داری کا خوب عطا ملا کہتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا
سے بھی بیزار ہوگئے۔ اور اس انسیانی دنگ پر ہندو بھائیوں نے ہمدردی کی وہ
میٹھی لوری کان میں ڈالی کہ جھٹ مسلمان بھائیوں نے مسلم لیگ کو، جس کے
وجود کی بنیاد ڈیڑھ اینٹ تھی۔ کانگریس کے نقطۂ نظر سے جا ٹھہرایا۔ وہ گویا رسمی طور پر
ہندوستان کو ماں باپ تسلیم کرلیا۔ ارتقاعِ نوعِ انسان کے طریقے بھی بعض اوقات
کس قدر رگڑے اوٹ پٹانگ اور نرالے ہوتے ہیں! اگر ایسا نہ ہو تو پھر ظرافت کی
دیوی کا وجود اور غیر وجود مسلم یونیورسٹی کی طرح برابر ہوجائے۔

اس اثنا میں قیصر ولیم اپنی موچھوں کو نکیلا کرتے کرتے اور نپولین بازی کے
موقعے کی راہ دیکھتے دیکھتے اکتا چلے تھے کہ ارتقا تاریخی کے حیرت خیز موقع نے
اُن کو اپنے دیرینہ ارمان نکالنے کا موقع دے ہی دیا۔ بسمارک کی خانہ نشینی کے
وقت ظرافت کی دیوی کے خاص فرزند ارجمند لنڈن پنچ نے بڑی بی یورپ کو
جتلا دیا تھا کہ میاں صاحبزادے رنگ لائینگے اگر مضبوط بین الاقوامی رسّے
سے جکڑ بند کرکے نہ رکھا گیا۔ غرض دنیا کی ہیبتناک عظیم جنگ برپا ہوئی اور
متخاصمین سچائی اور نوعِ انسان کی حُرّیت اور ترقی کے لیے جدید ترین آلات
ہلاکت سے نوعِ انسان کو مارنے لگے۔ سپین میں کیا خوب ضرب المثل ہے —
"نیک نیتیں، سنگین ہوکر، دوزخ کا فرش بن گئی ہیں" قیصر ولیم کے خواب میں
مملکت برطانیہ حلوائی کی دکان تھی جس پر وہ نانا جی کی فاتحہ پڑھنے پر تلے تھے۔
ڈیڑھ اینٹ کی پنج میل مٹھائی سے اون کو بڑی توقع تھی کہ یہ جان بل کے معدے

میں شورش کا رنگ لائے گی اور کوئی عجب نہیں اُس وقت دفتر شاہیوں کو بھی
سونے میں غدر کا کھٹکا یاد آنے لگا ہو۔ موقع ہی نہایت نازک تھا۔ مگر کانگریس اور
لیگ نے ہندوستان کی شاندار آواز بن کر برطانیہ کا ساتھ دیا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان
ہندوستانیوں کا ماں باپ ہے۔ برطانیہ کے دفتر شاہیوں کا نہیں اور ہندوستانی
اپنی میراث اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ جن خالہ برطانیہ نے
ہمیں اپنے بچوں کی طرح تو نہیں، یہ کون کہہ سکتا ہے؟ مگر [illegible] کی طرح [illegible]
پالنے میں پالا اور تعلیم کے گڈو لینے کے سہارے شاہراہ حریت پر اپنے پاؤں
چلنا سکھایا۔ بہت نہیں تھوڑا ہی۔ اس احسان کا بدلہ یہی ہے کہ برطانیہ کے
کڑے وقت اُسی پر پل پڑیں اور ڈائن جرمانیہ کے آہنی پنجے میں پھنس جائیں
اس سے اگر بالفرض ایسا ہو بھی سکتا تو نتیجہ کیا ہوتا؟ یہی کہ انگریز دفتر شاہیوں
کے ولنگٹن بوٹ کے بدلے جرمن دفتر شاہیوں کا بلوسٹر بوٹ ہوتا اور وہی
ڈیڑھ اینٹ کی دق سے نکلی ہوئی ہندوستانی پسلیاں۔

قصہ مختصر یہ کہ اعلان جنگ کے ساتھ ہی ہندوستان میں شورش
ختم ہوگئی اور ہندوستانی ان پڑھ گائے بیل سی رعایا سرکار کے نمک کا حق
شیروں کی طرح لڑ کر ادا کرنے لگی۔ برطانیہ کی آنکھوں میں تشکر اور جرمانیہ کی
آنکھوں میں خون کے آنسو بھر آئے۔

ماہرین جنگ صبح وشام اختتام جنگ کی پیشین گوئیاں وثوق کے ساتھ
کرتے رہے اور جنگ شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ اور ختم
کیوں ہوتی۔ جرمانیہ کا نصف صدی کا پکایا ہوا خیالی پلاؤ کوئی ایسا تو تھا نہیں۔

کانگریس کے بے چین دماغوں نے سوچا کہ اوّل تو ہندوستانی سیاسیات کے عادی ہی نہیں ۔ شورش کی مشق نہ رہے تو کیا عجب پھر کورے کے کورے ہو جائیں دوسرے یہ کہ وفاداری وفاداری میں ہندوستان تو برطانیہ کی طرف سے اپنی بساط بھر جان لڑا دے ، شورش سے دست بردار ہو جائے تو جنگ کے بعد کہیں جان بل صاحب یہ تصور نہ فرمائیں کہ ہندوستانی مخلوق وفادار ہے شورش اور غل غپاڑہ گنتی کے ہیولی پرستوں کا مشغلہ امن ہے ۔ اور دفتر شاہیوں کی میٹھی میٹھی لوری سے پھر خراٹے لینے لگیں ۔ لمبے لمبے مشوروں کے بعد آخر کار خالہ بیسنٹ ("BESENT") کی سرگروہی میں "ہوم رول" کی تحریک کا پھریرا اُڑا ہی دیا۔ دفتر شاہی دنیا کچھ ایسی سہمی ہوئی تھی کہ پتا کھڑکا اور اُن کے کان میں جرمن توپ گرجی ۔ گرایک تو ہوم رول کی شورش مدراس جیسے امن پسند صوبے میں شروع ہوئی ۔ دوسری گوری خالہ اس کشتی کی ناخدا تھیں اس لیے یہ شورش ایسی ہولناک نہ تھی ۔ پھر بھی مدراس اور بمبئی کے دفتر شاہی ناخدا اس سیاسی تلاطم سے حواس باختہ ضرور ہو گئے ۔

دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے ۔ اس لیے کانگریس نے سوچا کہ پہلے ہی سے ڈیڑھ اینٹ کے گرگٹ والے رنگوں کا بندوبست کرنا چاہیئے ۔ اور مسلمان بھائیوں کو ذرا کھینچ کر گلے لگانا چاہیئے ۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء کے آخری ہفتے اور لکھنؤ میں ہندو مسلمانوں کا "عقد اخوت" بندھ گیا ۔ اس جوشِ اخوت کے ابل پڑنے پر ڈیڑھ اینٹ کے چھپے پجاری اور نمازی بہت سٹ پٹائے ۔ مگر جیسا کہ رپورٹ میں مسٹر مانٹے گیو اور لارڈ چیمز فورڈ نے اشارہ کر دیا ہے ۔ جوشِ اخوت کے

حامیوں نے ان قدامت پسند پجاریوں اور نمازیوں کو حرف غلط کی طرح محو فرض کرلیا۔* دفترشاہیوں اور شیخ اخباروں نے شعر ملا کر طعنہ دیا کہ آغوش ہندو دب کرلے۔ اس پر ہندو ہمارے ہندسے بنے اور کیوں نہ بنتے۔ جس دن سارے ہندوستانیوں نے ہندوستان کو واقعی اور عملی طور پر اپنا مان لیا اس دن نہ ہندو ہندو رہینگے اور نہ مسلمان مسلمان۔ اور دفترشاہی شاید رہیں ہی نہیں۔ اس مقدس عہد میں نہ تو وہ میری ناک اونچی کرنے کا رجحان رہے گا، نہ ڈیڑھ اینٹ کی عمارتیں رہینگی اور نہ دفترشاہی توڑے جوڑنے رہینگے۔ اپنے گھر کے معاملات میں پھر کہیں گوشت ناخن سے یا ناخن گوشت سے جدا ہو سکتا ہے اور خصوصاً گزشتہ زمانے کے بے رحم ہاتھ کے اتنے تھپیڑے اور دفترشاہی بوٹ کی اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد۔

مگر ڈیڑھ اینٹ کا رجحان بھی ہندوستانیوں کی صدیوں کی میراث ہے پھر فطرت کا یہ عجیب لطیفہ ہے کہ صدیوں کی بھلائی آناً فاناً میں مٹ سکتی ہے مگر برائی کس قدر سخت جان ہوتی ہے۔ کانگریس نے مسلمان بھائیوں کو بغل میں لیا اور پیشانی پر برادرانہ بوسہ ثبت کیا بھائی بھائی اس نئے برادرانہ احساس اور دم دل کی خوشی میں مگن اپنی اسکیم کا پلاؤ پکا رہے تھے کہ پشت پر ایک نوساختہ ڈیڑھ اینٹ غیر برہمن حضرات نے کھینچ ماری۔ جنوبی ہندوستان کے غیر آریہ فرزندوں نے ہزاروں برس کے بعد اب دریافت کیا کہ ہم ہندوستان کے اصلی فرزند ہیں اور سب مصنوعی۔ لہذا ہماری سیاسی ڈیڑھ اینٹ علیحدہ

* [illegible] رپورٹ صفحہ ۲۱۔

قمیت میں بدلنا ہے تو لازم ہے کہ ڈیڑھ اینٹ پر کھلم کھلا اور مضبوط ہاتھ سے
دو لی پڑے۔ چکنی چپڑی پیپیڑوں کی ورزشیں جہاں تک کام دے سکتی تھیں
دے چکیں۔

ڈیڑھ اینٹ کے غارت کرنے کا آسان اور صرف ایک نہایت مزیدار گُر ہے
جس کو سنتے ہی ہر ہندوستانی عقلاً تسلیم کرلیگا اور تصور میں مزے بھی لیگا۔
مگر اس پر عملاً اصرار کیا جائے تو ہر فردِ بشر آپ کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جائیگا۔
اور کیا عجب کہ ڈیڑھ اینٹ کے دانتوں کی تیزی بھی آپ محسوس کرلیں۔ چونکہ اس
ناچیز راقم کو اپنی پیاری پیاری پلاک کو ناراض ہی کرنا ہے لہذا اس گُر کی صراحت قارئینِ کرام
کی نظرِ غائر کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کی جاتی ہے۔

اوّل تو یہ جتا دینا مناسب ہے کہ اصلی اتحاد۔ یہ اور بات ہے کہ آپ ایسا اتحاد
ہی نہ کرنا چاہیں۔ زبانی جمع خرچ سے نہیں ہو سکتا۔ جغرافیائی یکجائی۔ اقتصادی
یکجہتی، سیاسی عقد اخوت اور تعلیمی یکساں خیالی بھی اصلی اتحاد نہیں ہیں۔ یہ
سب اصلی اتحاد کے سونے میں سہاگے کا کام دیتے ہیں۔ اصل سونا ہی نہ ہو
تو ظاہر ہے کہ نرے سہاگے کو لیکر آپ لارڈ مارلے کی اصلاحاتِ ہند کی طرح بیٹھے
چاٹا کیجیئے۔ اصلی اتحاد سماجی اتحاد ہے جو انسان کے جسم کی طرح حرّیت اور مذموم
قومیت اور اقتصادی آزادی کی روح کا قالب ہے۔ جسم انسانی کے اضمحلال کے
بعد کہا جاتا ہے کہ انسان کی روح باقی رہتی ہے۔ مگر جسد سماجی میں اصلی اتحاد
کے نہ ہوتے حرّیت کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ جسم انسان میں بقا کے تسلسل کے لیئے
دوران خون لازمی ہے۔ اسی طرح جسدِ سماجی کے قومی اتحاد کے لیئے شادی

بیاہ کے لطیف اور مسرت خیز وسیلے سے افرادِ سماجی میں جہاں تک ممکن ہوسکیں نیا خون کا دوڑنا ناگزیر ہے۔ لہذا ہندوستان کے مفلوج اور مردہ قومی جسد میں یوں ہی جان پڑ سکتی ہے کہ ہندوستان میں شادی کی دیوی۔ دھوتی اور پاجامے، ساڑی اور کھڑے پائنچے کی بندشیں یک قلم اٹھا دے۔ خواہ مہاتما اس سماجی قانون کے خلاف ستیاگرہی روزے رکھنے لگیں۔ خواہ مولانا عبدالباری صاحب قبلہ اس بلا کے دور کرنے کے سبب کانوں پر ہاتھ رکھ کر اذانیں دینے لگیں۔

ہندوستان کے عظیم الشان مستقبل کا تمام تر انحصار اس لطیف عقدے کے حل ہونے پر ہے اور اس عقدے کو صنفِ نازک کا گرہ کشا ناخن ہی کھول سکتا ہے ساڑی اور کھڑے پائنچے والیاں بات چیت میں، ہنسنے اور رونے میں، اظہارِ تنفر اور محبت میں، ارسطو اور ہیگل کی منطق کا مطلق لحاظ نہیں کرتیں۔ اور اسی لیے صنفِ نازک کی باتیں مردوں کے لیے بھولی بھالی اور دلکش ہوتی ہیں۔ مگر عمل میں صنفِ نازک مردوں سے کہیں زیادہ معاملات کے منطقی پہلو پر نظر رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ نصف بہتر، دولت خانہ کی دنیا کے ہر حصے میں حاکم مجاز ہوتی ہے اور وہ دن بھی اب زیادہ دور نہیں کہ کاروبارِ دولت (STATE) میں بھی صنفِ نازک ہی بازی لے جائے۔ اس شادی بیاہ کے مسئلے کو ہندوستانی صنفِ نازک کی آل انڈیا گھونگٹ والی کانفرنس کے سپرد کر دیجیے اور پھر دیکھیے کہ باوجود اس کے کہ گھونگھٹ والی دنیا قدامت پسند سمجھی جاتی ہے۔ ساڑی اور کھڑے پائنچے کی کانفرنس ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کو چھٹی کا کھایا نہ یاد دلا دے تو سہی۔

سہری کی چھوت ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کی جڑ ہے اور بھارت ماتا کی بیٹیاں ہی اس چھوت کو دور کر سکتی ہیں۔ مرد اس میدان کے ہاتھی کے دکھانے کے دانت ہیں۔ اکبر کے شاندار کارنامے کے اصل معنے اگر سمجھتے بھی ہیں تو اس پر عمل کرنے سے بدکتے ہیں۔ میدان سماجی کی سورما صنف نازک ہی ہے۔

اس مضمون کے دوران میں حتی الوسع اس امر کی کوشش کی گئی کہ جہانتک ممکن ہو قارئین کرام کو ناخوش کیا جائے۔ مگر اس ناخوش کرنے کی کوشش میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ اس مضمون سے جو بدمزگی پیدا ہو وہ سچ کی ضرب المثل تلخی ہو اس لیئے قارئین کرام سے قوی امید ہے کہ اگر وہ اس طولانی تحریر سے ناراض بھی ہوئے ہیں تو ناراض رہینگے نہیں۔ اگر پیارے پبلک پھر بھی خفگی پر ہی آمادہ رہے تو یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ اس کی بھی پرواہ نہیں۔ اس تحریر میں راقم نے جو لفظ لکھا اور جو خیال ظاہر کیا ہے اگر وہ واقعی روح کے اس مقدس دیپک راگ سے نکھر نکھرا رہا ہے۔ جس سے بھارت ماتا کی محبت کی آگ ایک ہندوستانی دل میں ہی بھڑک اُٹھے اور اُس کا روحانی جوالا مکھی سمٹ کر "وندے ماترم" کے عظیم الشان نعرے میں پھوٹ پڑے تو کیا یہ بیش قرار صلہ نہ ہوگا؟

مگر یہاں ظرافت کی دیوی کھل کھلا پڑتی ہے کہ "ایاز قدر خود بشناس" اور یاد رکھ کہ بھارت ماتا اب جس گراں بہا تحفے کی طالب ہے۔ وہ نری "وندے ماترم" کی آگ نہیں ہے۔ بلکہ ایثار ہے اور ایثار بھی کیسا؟ بردست ایثار۔ صدیوں کی ڈیڑھ اینٹ کا جس سے ہندوستانی سماج کا پرانا شیرازہ بکھر جائے۔ سچا اتحادِ قومی ہندوستان کے عمدہ ترین کی بنیادی اینٹ ہمیشہ کے لیئے رکھے۔

نقیب کا ایک ورق

کلام اقبال

ترا جلوہ کچھ بھی تسلیٔ دلِ ناصبور نہ کر سکا
وہی گریۂ سحری رہا وہی آہِ نیم شبی رہی

نہ خدا رہا نہ صنم رہے نہ رقیب دیر و حرم رہے
نہ رہی کہیں اسد اللّٰہی نہ کہیں ابولہبی رہی

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

کلام اکبر

منظور ہے مجھے شکوۂ بیداد بتاں سے
للہ بتا دے کوئی اللہ کہاں ہے

دنیا کی یہ زینت ہے عقبیٰ کے وہ ہیں وعدے
غافل نے اِدھر دیکھا عاقل نے اُدھر دیکھا

صد شکر مری نظریں بہکیں نہیں اے اکبر
دنیا بھی بہت چمکی بُت نے بھی سنور دیکھا

افکار آزاد

اب تاب نہیں، اے دلِ بیتاب سنبھل جا
ہے گرم خبر آنے کی، سیماب سنبھل جا

سورج، لے نقاب اُٹھتی ہے اب راہِ عدم سے
اک برق چمکنے کو ہے، مہتاب سنبھل جا

شب ختم ہوئی نور کا تڑکا ہے سروں پہ
آمد ہے حقیقت کی بس اُٹھ، خواب سنبھل جا

اب طاق ہے اے ابروئے خم صبر کی طاقت
لے اُٹھتے ہیں فرہاد کو، محراب سنبھل جا

تنکے نے بھی اب زور اڑایا ہے فلک کا
ہے کوہِ گراں راہ میں سیلاب سنبھل جا

ہوتا ہے اس ساز کا اک شعلۂ آتش
مضراب کی نہیں خیر ہے۔ مضراب سنبھل جا

گرد اُڑتی ہوئی آتی ہے مدفن کی کسی کے
اندھیر ہے اے دامنِ جلباب سنبھل جا

آتا ہے اب ایک مست نیا بزمِ فلک میں
چو میں ہیں مقابل کی مے ناب سنبھل جا

نادان ہے آزاد یہ دشمن تو نہیں ہے
انصاف کر اے مایۂ احباب سنبھل جا

تحسین

کالج میں کل جو تذکرہ درس آگیا ÷ ہر شخص وصف کرنے لگا اپنے علم کا ÷ مجھ کو بھی دیکھ کر اسے کچھ حوصلہ ہوا

میں نے کہا بہت سی زبانیں ہوں جانتا   مدت تک امتحان دیئے امتحان پر

سب جانتے ہیں مجھ کو زمانے کے ذی شعور ÷ شہرے مرے ہیں آج خدائی میں دور دور ÷ زیبا ہے جس قدر بھی کروں ناز یا غرور

جرمن فرنچ پرشین انگلش پہ ہے عبور   ثابت مرا کمال ہے سارے جہان پر

کچھ دیر تک رہے یہی باہم مباحثے ÷ خاموش ہو کے بیٹھ گئے سب ہی اکتا کے ÷ دعوے کسی طرح جو مرے رد نہ ہو سکے

اک شوخ طبع مس نے دکھائی زباں مجھے   بجلی تھی ابر میں کہ قمر آسمان پہ

ہر چند میں نے کام لیا غور سے مگر ÷ مطلب نہ کمتر آئے سمجھ میں نہ بیشتر ÷ مغموم فکرمند پریشان دیکھ کر

بولی رہو گے زیست کی لذت سے بے خبر   قدرت نہ پائی تم نے اگر اس زبان پر

دریائے سوت

او دلفریب دریا تجھ پر خدا کی رحمت   ڈوبے ہوئے دلوں کو دی تو نے شادمانی

تیزی روانیوں میں نازک خرامیوں میں   اک طرزِ دلربائی اک آنِ دلستانی

آنکھوں کی ٹھنڈکیں تھیں دل کی تسلیاں تھے   وہ تیری نیلی لہریں وہ تیرے سبز پانی

مٹتا ہوا اجالا۔ جھکتا ہوا اندھیرا   دن کی گریز پائی شب کی سیاہ رانی

وہ چرخِ خضری پر کچھ ہلکے ہلکے بادل۔   کرتی تھی جن سے شکوہ تاروں کی ضو فشانی

شاداب کھیتیوں کے وہ سلسلے دو طرفہ   چڑیوں کے خوانِ یغما۔ دہقاں کی زندگانی

خوش قسمت الغرض وہ ٹکڑا زمیں کا جس کی   گودی میں کھیلتا ہے دن رات تیرا پانی

لیکن بتا تو ظالم او پاسبانِ دریا   تو کب سے کر رہا ہے بستی کی پاسبانی

کیوں یاد ہے تجھے وہ گذرا ہوا زمانہ   تھی اپنے خنجروں میں تیری ہی جب روانی

[illegible] نوازیوں کو   پانی دیا تھا تو نے غزنی کے غازیوں کو

رموزِ بیخودی

از جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

ڈاکٹر اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی ملک و قوم میں دو ایڈیشنوں میں اشاعت پا چکی ہے۔ اسرارِ خودی پر بہت کچھ کہا سُنا گیا۔ کہتے ہیں کہ ممالکِ غیر میں بھی پہنچ گئی ہے۔ اور یہ بھی سُنا کہ کوئی صاحب انگریزی میں بھی اُس کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اسرارِ خودی افرادی رنگ میں تھی رموزِ بیخودی اجتماعی رنگ میں ہے۔ منفرداً اور مشترکاً دونوں کی غرض اور غایت تقریباً ایک ہی ہے۔

چونکہ یہ دونوں مثنویاں جداگانہ رنگوں اور جداگانہ ڈاکٹر صاحب کے دل سے نکلی ہیں اس واسطے دونوں ایک خاص اثر لیے ہوئے ہیں۔ جب ہم دل لگا کر اور خوب غور سے پڑھتے ہیں تو متاثر ہوتے ہیں۔ سچ ہے دل سے نکلی ہوئی بات دل ہی میں اثر کرتی ہے۔ درحقیقت بات وہی ہے جو دل پر اثر کرے اور سنتے ہی دل میں اُتر جائے۔ یوں تو ہر شخص باتیں کرتا جاتا ہے مگر اثر بہت کم اشخاص کی باتوں میں ہوتا ہے۔

کیا اگر پائی کسی نے کسی محفل میں جگہ آدمی عرش نشیں ہو جو کرے دل میں جگہ

اسرارِ خودی میں خودداری کے اسرار بتائے گئے ہیں اور رموزِ بیخودی میں بیخودی کی کہانیاں ہیں جس طرح بعض لوگوں نے اسرارِ خودی دیکھ کر خودی (رعونت و تکبر) کا مفہوم لیا تھا۔ اسی طرح کوئی بیخودی سے مدہوشی نہ سمجھے۔ بیخودی سے مراد عشقِ ملت۔ عشقِ قوم اجتماعی رنگ میں

مراد ہو۔ عشق میں جب تک خیالِ صنم میں بیخودی نہ ہو تب تک عاشق فنا فی الصنم کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اجتماعی بیخودی سے گویا اجتماعی خودداری مراد ہے۔ ہر ملت اور ہر قوم کی دو زندگیاں ہوتی ہیں۔

(الف) فردی یا شخصی زندگی

(ب) اجتماعی زندگی۔

فردی زندگیوں سے اجتماعی زندگی ہستی پذیر ہوتی ہو اور اجتماعی زندگی سے افرادی زندگیاں تقویت پاتی ہیں۔ جب ملتوں اور قوموں کی افرادی زندگیاں کمزور پڑ جاتی ہیں اور اُن میں نقص پیدا ہو جاتے ہیں تو رفتہ رفتہ اجتماعی زندگی بھی کمزور پڑ جاتی ہو۔ کوئی ملت اور کوئی قوم اُس وقت تک زندہ نہیں شمار ہوسکتی جب تک اجتماعی زندگی نہ رکھتی ہو۔ جو قومیں اور جو ملتیں اجتماعی زندگی سے محروم ہیں۔ اُن کے افراد اگرچہ عرفی طور پر زندگی رکھتے ہیں مگر دراصل اُن کی زندگیاں برائے نام ہوتی ہیں۔ کیونکہ اُن میں زندگی کے اصلی جذبات نہیں ہوتے۔ زندگی کھانے پینے اور حرکت کرنے یا بولنے چالنے ہی کا نام نہیں بلکہ حس اور ادراک کا بھی ہو۔ اصل زندگی حس اور ادراک میں ہوتی ہو۔

جب دل و دماغ ہی زندہ نہیں اور اُن میں کوئی حس ہی نہیں تو زندگی کیا ہوئی خاک۔ کھانے پینے کو تو مچھلیاں اور مینڈک بھی کھاتے پیتے ہیں وہ بھی حرکت کرتے ہیں۔ اور چلتے پھرتے ہیں ادراکی زندگی اور بے شعور زندگی میں بہت کچھ فرق ہو۔

حس اور ادراک جس میں کچھ نہیں زندگی ہو وہ بھی کچھ اسے مولوی

جب افرادی زندگیاں ادراک اور حس وغیرت کھو بیٹھتی ہیں تو قوم اور ملت بھی رفتہ رفتہ اُس سے محروم ہو جاتی ہو۔ ہاتھ میں پانچ اُنگلیاں ہوتی ہیں۔ ہر انگلی بجائے خود ایک منفرد ہستی

اور منفرد زندگی رکھتی ہے۔ مگر ایک انگلی تنِ تنہا کیا کر سکتی ہے۔ جب پانچوں ملتی ہیں تو وہ سب مل کر کام کرتی ہیں۔ اگر اُن میں کوئی انگلی بیکار ہو تو وہ مل کر بھی کام نہیں دے سکتی۔ کام ادھوری صورت میں دیتی ہے جبکہ صحیح وسالم ہو جب پانچوں مل کر کام کرتی ہیں تو ایک نئی طاقت اور ایک نیا زور پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک رسّی میں بھی کچھ طاقت ہوتی ہے لیکن جب چند رسّیاں اکٹھی کی جائیں تو ان میں کچھ اور ہی طاقت اجتماعی رنگ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مختلف رسّیاں ایک مجموعی طاقت پیدا کرتی ہیں اور مجموعی طاقت منفرد انہ طاقتوں کی جامع اور نافع ہوتی ہے۔ گنتی میں چند اور دیکھنے میں ایک جو قومیں اور ملتیں دوسری قوموں کے مقابلے میں پست اور کمزور ہیں اُن کی اصل وجہ یہی ہے کہ اُن میں قومی اور ملّی طور پر اجتماع نہیں اور وہ اجتماعی زور نہیں رکھتی ہیں۔

جب تک پانچوں ہاتھ کی انگلیاں آپس میں ملتی نہیں اس وقت تک ہاتھ میں پورا زور نہیں آتا اور نہ طاقتِ گرفت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب تک کڑیاں پیوستہ نہ ہوں اُس وقت تک جریب اور زنجیر نہیں بنتی۔ جب تک مختلف اینٹیں جوڑ کر نہ لگائی جائیں اُس وقت تک دیوار نہیں کھڑی ہوتی۔ جب تک کتاب کے متفرق اوراق سیئے نہ جائیں۔ مجلد کا نام نہیں پاتے جب تک پھول یکجا نہ کیئے جائیں گلدستہ نہیں بنتا۔ جب ایک شئے یا ایک چیز دوسری چیز اور دوسری شئے کے ساتھ ملتی اور ممتزج ہوتی ہے تو اپنی طاقت وہ دوسری کے ساتھ ملاتی اور منتقل کرتی ہے۔ اس صورت میں وہ ممتزج ہو کر ایک تیسری طبیعت اور تیسرا مزاج پیدا کرتی ہے گویا اپنی خودی یا خودداری دوسرے رنگ میں منتقل کرتی ہے۔ اسی عمل کا نام دوسرے الفاظ میں بیخودی یا رموزِ بیخودی ہے۔

جب افراد جتنی افراد میں قائم اور زندہ ہو کر۔ آپس میں ملتے ہیں اور ایک امتزاجی رنگ پکڑتے ہیں تو اُس کا نام مجموعی یا اجتماعی امتزاج ہو جاتا ہے۔ جس سے قوم اور ملّت بنتی ہے۔ اور یہ

ارتباط آخر میں پھر ایک دوسری قسم کی زندگی بن جاتا ہے۔ افراد ملت میں مل جاتے ہیں اور ملت
اُن افراد کی جامع اور حامل بن جاتی ہے۔ اسی کے متعلق حضرت اقبال فرماتے ہیں۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است

تا توانی با جماعت یار باش — رونق ہنگامۂ احرار باش

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشر — ملتِ شیطاں از جماعت دور تر

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند — ہم خیال و ہم نشیں و ہمسر اند

فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

یہ اشعار بار بار پڑھو اور سوچو کہ حضرت اقبال کا دردمند اور سوختہ دل کیا کہہ رہا ہے
اور ان اشعار کا مطلب کیا ہے اور سوچو کہ ہمارے افراد کی زندگیوں اور اجتماعی زندگی میں
کہاں تک اور کس قسم کا ارتباط ہے اور کیا ضرورت ہے کہ ہم اس سوال پر غور کریں۔ بے شک
ضرورت ہے کہ ہم اس پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہماری افرادی زندگیاں کہاں تک مجموعی رنگ میں
رنگی ہوئی ہیں اور کیا ہماری ملت کوئی اجتماعی زندگی بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ یہ سوچنے والی بات ہے
اگر ایسی زندگی ہم اجتماعی رنگ میں رکھتے ہیں تو ہماری قوم اور ملت زندہ ہے اور اگر ایسا نہیں ہے
تو ہم مردہ ہیں۔

علامت اجتماعی زندگی کی کیا ہے؟ یہ کہ ایک فرد یا ایک جماعت اور ایک گروہ کی آواز پر جو

قومی اور ملی رنگ میں دی جائے ساری قوم اور سارے افراد باری باری اُٹھ کھڑے ہوں اور بہ مصداق ایک عضو کا درد سارے جسم کو دردمند کر دیتا ہے متوجہ ہوں تو زندہ ملت ہوگی اور اگر یہ صورت اور یہ حالت اور یہ احساس نہیں تو سمجھو کہ قوم اور ملت بدقسمتی سے مردہ اور بے حس ہے فرداً فرداً آواز کا سننا اور اجتماعی رنگ میں اُس کا نہ سننا اور نہ کوئی عملی کوشش دکھانا زندگی کی علامت نہیں ہے۔

یہ حالت اور یہ کیفیت اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی کہ جب تک ملی رنگ میں سارے افراد کا ایک ہی نصب العین نہ ہو کیونکہ سوائے ایک نصب العین ہونے کے افراد کی زندگیاں یوں جمع نہیں ہو سکتیں وہ نصب العین کیا ہے۔؟

حمیت۔ غیرت۔ اعتصام بحبل اللہ

ایسے مقامات پر افراد کو صرف ایک غیرت اور وہ غیرت جو ملی اور قومی ہو جمع کرتی ہے اور کوئی طاقت ایسا نہیں کر سکتی اور یہ صورت کب صورت پذیر ہوتی ہے۔ جب اندر وہ غیرت خودداری سے کام لیا جائے اور اپنے مسلمات کو مدنظر رکھا جائے اور اُن زریں اصول کو نہ چھوڑا جائے جو ملت کے قیام اور ثبات کے واسطے موضوع ہیں اس کمی اور نقص کو دور کرنے کے واسطے حضرت اقبال فرماتے ہیں۔

اے نظر بر حسن ترسازادۂ　　اے ز راہ کعبہ دور افتادۂ

دستور سوز آموز از پروانۂ　　در شرر تعمیر کن کاشانۂ

طرح عشق انداز اندر جانِ خویش　　تازہ کن با مصطفیٰ پیمانِ خویش

یہہ چند الفاظ جو شعری لباس رکھتے ہیں کیا ظاہر کرتے ہیں۔ وہی بات جس کی فی الواقع ہمیں ضرورت ہے ہم اغیار کی طرف کشاں کشاں جا رہے ہیں اپنے گھر کی خوبیوں سے بے خبر ہو کر غیروں کی اکثر نمائشی خوبیوں کے شیدا ہو رہے ہیں مصطفےٰ۔ عمرؓ و عثمانؓ۔ ابو بکرؓ اور علیؓ کے اقوال۔ ائمہ کے مقولات کو بالائے طاق رکھ کر سمندر کے پار بھٹکتے ہیں اور اسپنسر کے اقوال پر غش ہیں۔ وہ تعلق جو ۱۳ سو سال سے ہمیں اپنے بزرگوں کے ساتھ تھا وہ رفتہ رفتہ چھوٹتا جاتا ہے جس سے اجتماعی زندگی بھی بودی اور کم زور پڑتی جاتی ہے اور وہ رشتہ ٹوٹتا جاتا ہے جو ملی رنگ میں جوڑا گیا تھا۔ رسول کریم سے جو ہمارا پیمان تھا وہ بدقسمتی سے ہمیں یاد نہیں رہا ورنہ اُس کی وقعت کا ہمیں خیال ہے۔ ہم نمائشی معاہدات میں لگ گئے اور وہ پرانا اور صادق معاہدہ ہمیں رفتہ رفتہ بھول گیا۔ وہی معاہدہ ان ابیات اور اس مثنوی بے خودی میں حضرت اقبال بار بار ہمیں یاد دلاتے ہیں:

باز آمدم کہ وعدۂ فردا وفا کنم

مختلف الاثر اور بیرونی تحریکات نے ہمیں اس معاہدہ سے رفتہ رفتہ رُوگرداں کر دیا ہے۔ ہم اپنی فریب دہ کشادہ دلی کے خیال سے اپنے معاہدات سے ہٹ کر جدید معاہدات کے پابند ہوتے جاتے ہیں۔ قرآن مجید اور اُسوۂ حسنۂ رسول میں کیا کچھ نہیں۔ سب کچھ ہے کسر ہے تو یہہ کہ ہم جدید تحریکات کے خواہ مخواہ شکار ہو رہے ہیں۔ ملتِ ابراہیمی سے نکلکر ہم اُن ملتوں میں شامل ہوئے ہیں جن کے مقابلے میں ہمیں بہت کچھ حاصل ہے۔

ما مسلمانیم اولاد خلیل
از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل

ملت ما را اساسِ دیگر است

ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

آگے ہی نہ دوڑے جاؤ جو راہ نہیں سیدھی نظر آتی ہو اس میں مغاک اور گڑھے بھی ہیں دوسری ملتوں کی اچھی اور معقول باتوں کی قدر نہ کرنا اور بہ مصداق خذ ما صفا ودع ما کدر عمل کرنا معیوب نہیں ہو لیکن اُن سب باتوں پر جو ہمارے اپنے نقطۂ خیال سے محض بے سود ہوں متوجہ ہو کر دامن رسول اور اسوۂ حسنہ کو چھوڑ دینا اور ملت کی اس رنگ میں تحقیر کرنا فراست سے بعید ہو۔

ہر کہ آخر مصطفیٰ است

شرک را در خوف مضمر دیدہ است

ہمیں فکر اور خوف کس بات کا ہو ہم تو لا تقنطو کے پرستار ہیں۔ اور ہمت کے معترف بہ مصداق لیس للانسان الا ما سعیٰ یہ بڑی کم ہمتی ہے کہ ہم فریب دہ کشادہ دلی سے خواہ مخواہ اپنی خودداری کا خون کریں اور ذاتی اغراض کے تحت قومی اور ملی اغراض سے نفرت گزیں ہوں۔

ہر ملت اور ہر قوم کی اجتماعی زندگی آئین سے نشو و نما پاتی ہو۔ کیونکہ آئین ایک ایسا قانون ہو جو مراحل پیش کردہ سے بہ سہولت قوموں اور ملتوں کو عبور کراتا ہو۔ اور اُن خدشات اور مناقص سے بچاتا ہو۔ جو کہ اس راہ میں کبھی کبھی حائل ہو جاتے ہیں۔ ملت اسلامی کا آئین کیا ہو۔؟

(الف) آئین محمد صلعم۔

(ب) آئین قرآن مجید۔

بس یہی دو باتیں اور دو اصول آئینِ ملت اسلامیہ ہیں۔ اِن سے جو ہٹا ملت سے ہٹا۔ ان دو مضبوط رسیوں کا چھٹنا گیا ہو ملت کا مرنا یا کمزور ہونا۔

ملتے را رفت چوں آئیں ز دست مثلِ خاک اجزائے اُو از ہم شکست

ہستیِ مسلم ز آئین ست و بس باعثِ دینِ نبی این است و بس

برگِ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے چوں پریشاں شد صدا غوغاستے

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ اُو لا یزال است و قدیم

نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ اُو رحمۃ للعالمیں

کیا ہم مسلمان ہو کر اِن دونوں آئین سے باہر جا کر اپنی عزت اپنا احترام اور ملت کا شیرازہ قائم رکھ سکتے ہیں؟ جب تک یہ دونوں رسیاں مضبوط نہ پکڑیں گے تب تک اجتماعی زندگی اور حرمتِ ملت مفقود۔

• جس غور سے قرآن مجید پڑھنا چاہیئے افسوس کہ ہم پڑھتے نہیں اور جس سوچ سے ہمیں رسول کہنا چاہیئے افسوس کہ وہ نظر ہم نہیں رکھتے اور نہ اس سوچ سے کام لیتے ہیں ملی اور قومی زندگیاں اور پائمالی کی جتنی باتیں ہیں وہ سب کی سب ان دونوں کتابوں

میں لکھی ہیں۔ عمل کی ضرورت ہے۔ ہم ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہیں۔ گھر کے موتی چھوڑ کر دوسروں کے گھونگوں پر مرتے ہیں۔

اجتماعی زندگی کی بنیاد رکھو۔ فرقہ بندی کے زہر سے اپنے تئیں محفوظ رکھو جو افتراقی فرقوں نے ڈال رکھی ہے جو درگت اس عمل سے بن رہی ہے وہ ہماری قوم اور ملت کو پنپنے سے روکتی ہے۔

ہم ذلیل ہو گئے ہماری آبرو پر پانی پھر گیا ہم بے بس ہیں ہم بے گھر ہیں۔ باوجود اس کے کہ ہم میں افراد کی کمی نہیں پھر بھی ہم اس تفرقہ اندازی میں پڑے ہیں۔ کاش ہم چند روزہ ہی سہی اس کشمکش سے باز آئیں بعض رسائل اور بعض اخبارات کو دیکھو خواہ مخواہ کی تو تو میں میں اور دعوت کفر سے لبالب ہیں۔ ہم سب ایک ماں کے اور ایک باپ کے ہیں خدا نے بھائی بھائی بنایا ہے۔ علم اور دین کی بدولت ہم اس کے نام لیوا ہو کر ایک ہی ملت کے افراد ہیں مگر ذاتیات میں پڑ کر ایک دوسرے کے دشمن اور بدخواہ ہو رہے ہیں اور زمانہ اس آڑ میں اپنے وارے نیارے کر رہا ہے۔ ہمیں تو ضرورت ہے کہ دوسری بھی ہمسایہ قوموں اور برادران وطن سے بھی یک جہتی پیدا کریں بجائے اس کے ہم اپنے آپ میں جوتا پیزار کرتے ہیں۔ "رموز بیخودی" پڑھو۔ اور خودداری سیکھو اخوت کا سبق لو اجتماعی زندگی کے زندہ ہو کر وارث بنو۔ آمین۔

سلف و خلف

(جناب [illegible] مصطفیٰ صاحب [illegible])

دیکھتے ہیں جو نیرنگِ دوراں　　دل پہ چھاتی ہیں غم کی گھٹائیں
ہم تو اس غمکدہ میں ہیں مہماں　　کیا خوشی دیکھ کر غم گھٹائیں

ہر بیاں کذب بھی راستی بھی　　کذب زائد مگر صدق کم ہے
ہر بیاں صلح بھی آشتی بھی　　عدل کم اور افزوں ستم ہے

لوگ اچھے بھی ہیں اور برے بھی　　ہیں ہزاروں میں دس بیس اچھے
ان میں کھوٹے بھی ہیں اور کھرے بھی　　بیسیوں جھوٹے ہیں بیس سچے

یوں تو کہنے کو انسان سب ہیں　　جن میں شر کچھ نہ ہو وہ بشر ہیں
مردم آزار انسان کب ہیں　　انس جن میں ہو وہ اک گہر ہیں

ایک انسان کو ایک انسان　　دیکھتا ہے بچشمِ حقارت
کسطرح کے ہیں یہ لوگ نادان　　آدمی ہیں نہیں آدمیت

اے بشر ہو اگر کچھ فراست　　غور کر پہلے کیا تھا ہے اب کیا
اک زمانے میں تھی تیری شہرت　　اک جہاں میں عجم کیا عرب کیا

اولیا جتنے گزرے بشر تھے　　نیکیاں ان کی سب پر ہیں اظہر
انبیا جتنے گزرے بشر تھے　　خیر ہی ان میں تھی کچھ نہ تھا شر

تھے ہمارے سلف کیسے عالم　　جانتا ہے جنھیں ایک عالم
تھے بشر ہی تو معن اور حاتم　　تھے بشر ہی تو سہراب و رستم

تھے بشر ہی سکندر، فریدوں　　جانتا ہے جنھیں اک زمانہ
تھے بشر ہی ارسطو، فلاطوں　　مانتا ہے جنھیں اک زمانہ

ہیں ذہین آدمی ہم بھی لیکن　　حیف ہم میں نہیں ہے وہ جوہر
ان سے ہو جائیں کب ہو یہ ممکن　　ہم خزف ہیں تھے اسلاف گوہر

نقیب ثم

کلام اکبر پر ایک نظر

(از جناب قمرالدین صاحب بی اے بدایونی)

فلسفہ (گذشتہ سے پیوستہ)

۵- وسیع المشربی

ایک موحد کے کمالِ عرفان کا اندازہ اس کے مشرب کی وسعت سے ہوتا ہے سچے طالب اُس معشوقِ حقیقی کی جھلک ہر مذہب میں دیکھتے ہیں۔ نہ اُس کو کسی خاص نام سے مخصوص کرتے ہیں اور نہ اپنے آپ کو کسی خاص ملت سے منسوب کرتے ہیں۔ عرفی کہتا ہے ؎

مسلمانی کسے داند کہ در یکرنگیٔ وحدت ز ہر موچشمۂ خوں ریزد از خوانی مسلمانش

یعنی توحید کا سچا جاننے والا وہ ہے جسے مسلمان کہلائے جانے سے بھی عار آئے یعنی عار ہی نہیں بلکہ ناقابلِ برداشت سوہانِ روح ہو کیونکہ یہ کہکر کہ سوائے ایک مذہب کے کوئی اور ذریعہ اُس تک پہنچنے کا نہیں۔ ہم اس لامتناہی ذات کی حد بندی کئے دیتے ہیں۔ اور اس کو اُس تخلیق کنندۂ عالم کی عظمت پر حرف آتا ہے۔ ایک انگریزی مصنف "ہیوم بین" کہتا ہے کہ اگر لوگ ایک دوسرے کے مذہب کی نکتہ چینی کریں تو ایک مذہب بھی درست نہیں نکلے گا۔ اور اگر لوگ اپنے اپنے مذہب کے متعلق رائے زنی کریں تو ایک مذہب بھی غلط نہیں ثابت ہوگا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا تو سب مذاہب صحیح ہیں یا سب غلط ہیں۔ اسی کو سید اکبر حسین صاحب کہتے ہیں کہ روحانیت میں کمال، کسی خاص شخص خاص زمانے یا خاص مذہب کے لئے مخصوص نہیں مذہب کا مایہ ضمیر خلوص ہے۔

انظہارِ حال کے لیے محفل کی کیا تلاش بن خاکِ راہ ناچ لیا گرد ہوا کے ساتھ

بیخودی میں بھی فرماتے ہیں :-

۱ یہ میرے سامنے شیخ و برہمن کیا جھگڑتے ہیں
اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہوں دونوں کا قائل ہوں

کوتہ بینوں کو کفر و دین میں فرق معلوم ہوتا ہے۔

در حیرتم کہ دشمنیٔ کفر و دیں چرا است   از یک چراغ کعبہ و بُت خانہ روشن است

سچے سالک کے نزدیک دونوں ایک ہی شے ہیں - بقول عرفی :- پروانہ چراغ حرم و دیر نداند۔

۲ طلب ہی حق کی تو ل آئے ہم سے مستوں سے
نہیں ہے میکدہ خالی خدا پرستوں سے

صرف تنگ خیال لوگ وجود باری تعالےٰ کو مسجد یا کلیسا میں محدود کرتے ہیں حق بیں نگاہوں کے نزدیک وہ ہر جگہ موجود ہے۔ فیضی کہتا ہے :-

آنکہ می کرد منع پرستیدنِ بُت   در حرم رفتہ طوافِ در و دیوار چہ کرد

۳ جنھوں نے طاعت میں جان دی ہے انھیں کے حصہ میں زندگی ہے
مُقدمے کی ہوں لاکھ شکلیں۔ یہی نتیجہ نکل رہا ہے

سچ ہے خدا نکتہ نواز ہے۔ انسان کا طریقۂ عبادت خواہ کیسا ہی ہو۔ اُس کے یہاں خلوص خاطر کا تحفہ قبول ہوتا ہے۔

طاعت آں نیست کہ برخاک نہی پیشانی   صدق پیش آر کہ اخلاص بہ پیشانی نیست

ایک اور جگہ صاف الفاظ میں کہتے ہیں -

خدا کی ہی عبادت جن کو ہو مقصود اے اکبر   وہ کیوں باہم لڑیں گو فرق ہو طرزِ عبادت کا

نقیب ۳

کلام اکبر پر ایک نظر

ہیں ہر اک مذہب میں کچھ کافر بھی کچھ دیندار بھی

بات رکھو یاد یہ اک محترم اسرار کی

توخ کیا ذ۔

کہوں کس سے کہ یہ وقت میں زیادہ اور یہ کم ہیں — یہ آپ نے کو دعویٰ ہے کہ ہم بھی جزوِ عالم ہیں

قایم ہی بوٹ اور موزا ۔ کھینے — دل کو مشاق مس ڈیوزا رکھیے

ان باتوں پر معترض نہ ہوگا کوئی — پڑھیے جب نماز اور وضو رکھیے

مولانا کا مذہب ضد۔ لاعلمی اور کوتہ نظری سے محدود نہیں۔ اُن کی تعلیم مذہب اُن

زاہدان خشک سی نہیں بن کا (بقول اسمٰعیل میرٹھی)

مدار دین ہے اس پر کہ جھٹ کتر ڈالیں — جو پائیں ٹخنے سے نیچے اگر کسی کی ازار

وہ ممنوعات کی فہرست دانستہ اس قدر طویل نہیں بتاتے کہ سننے والا بد دل ہو جائے

جانتے ہیں کہ عبدیت کے فرائض کا خلوص کے ساتھ انجام دینا اصل مذہب ہے۔ پس وہ

الفت اللہ کی تعلیم دیتے ہیں کہ جب یہ شمع انسان کے دل میں نور پھیلائے گی تو نفس پرستی کی ظلمت

خود بخود کافور ہو جائے گی۔ نماز کیا ہے؟ خدا کی جانب گرویدگی۔ ظاہر ہے کہ دل کے ایک فریم میں

دو فوٹو نہیں آ سکتے۔ جب اُس میں عشق خدا کو جگہ دی جائے گی تو "مس ڈیوزا" کا خیال

خود بخود دور ہو جائے گا۔ نماز کا فلسفہ اسی طرح ایک جگہ خود سمجھایا ہے۔ کہتے ہیں۔

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ — معنی یہ ہیں کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

اسی قسم کی وسیع تعلیم دوسرے موقعے پر یوں دیتے ہیں۔

تم شوق سے کالج میں پھلو۔ پارک میں پھولو — جائز ہے غباروں پہ اُڑو چرخ پہ جھولو

پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اگر غباروں میں اُڑنے کی قابلیت بہم پہونچا کر اس پر غرّہ کیا تو یہ اُصول مذہب پر کاربندی نہوئی اگر اپنی قابلیت کو خدا کی عنایت پر محمول نہیں کیا تو وہی فرعون بے سامان کا سا حال ہوگا کہ :-

جو اپر شپ پر چڑھے تو گویا کہ بس ہمیں ہیں خدا نہیں ؟ جو اپر شپ سے گرے تو ایسے کہ لاش کا بھی پتہ نہیں ؟

سید صاحب کے نزدیک سب سے بڑا جرم اپنے فرائض کا سچا احساس نہ رکھنا ہے۔ کہتے ہیں

مذہب کسی سے میں نے سیکھا پڑھا نہیں ہے اتنا ہی جانتا ہوں بندہ خدا نہیں ہے

فلسفہ طبعی

دنیا عالمِ خیال کا نام ہے بذات خود نہ کوئی شے اچھی ہے نہ بُری - ہر چیز کی اچھائی بُرائی یا کمی بیشی ہمارے خیال پر مبنی ہے - آج ایک شے ہماری نظر میں بھلی معلوم ہوتی ہے - کل اُسی کو لغو سمجھ کر ٹھوکر مار دیتے ہیں - پرسوں پھر اُسی کو عمدہ تصور کرنے لگتے ہیں - غرضکہ ہر شے کی قدر و منزلت کا انحصار ہمارے خیال پر ہے - بقول "نوئی اسٹیونس" سید اکبر حسین کے فلسفے کا لب لباب یہی ہے کہ "حُسن ہمارے دماغ میں ہے نہ کہ کسی خاص شے میں" منجملہ اور باتوں کے اُن کے کلام کی مقبولیت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ اگر اُن کو کسی معمولی چیز کی بھی حالت بیان کرنا ہوتی ہے تو اس کو فلسفیانہ رنگ میں رنگ کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ انوکھی معلوم ہونے کے علاوہ غضب کی دلفریب بن جاتی ہے کہتے ہیں :-

۱ ہو طلب کامل تو بس نعمت اسی کا نام ہے
بھوک نے نانِ جویں کو من و سلوا کر دیا

مراد یہ کہ لذت کسی خاص شے میں نہیں ہے - اصل مزا بھوک میں ہے - شکم سیری کی حالت میں بریانی کے نام سے طبیعت بریاں ہوتی ہے - بھوک میں جو کی روٹی نعمتِ عظمیٰ بن جاتی ہے -

۲ مزاج ابتو ہموں کا ہی چرخِ چہارم پر

بڑھا دیا میری خواہش نے تھیں جو کچھ بھی ہیں

حقیقت یہ ہی کہ ہر چیز کی قیمت کی کمی یا بیشی ہماری خواہش کی کمی یا بیشی پر مبنی ہی علمِ معیشت کا یہ ایک بڑا اصول ہی کہ کسی چیز کی گرانی ہماری خواہش کی زیادتی کی وجہ سے ہوتی ہی داغ کہتے ہیں:۔

دیکھنے جاتے ہیں وہ اپنے خریدار کی آنکھ ہوتی جاتی ہی دو سوا بوسہ لب کی قیمت

ایک دوکاندار کا کمال بس یہی ہی کہ خریدار کی خواہش کا صحیح اندازہ کرلے کہ اُس کو اس شے کی کتنی ضرورت ہی۔ اُسی حساب سے اُس کی قیمت بتادے۔ نہ ہماری رغبت اُن صاحب کی جانب اس درجہ ہوتی اور نہ اُن کا مزاج یوں آسمان پر پہنچ جاتا۔

جانتے ہیں مجھ دلدادۂ انداز خرام ناز سے اور اُٹھاتے ہیں قدم گن گن کر

اس کے ساتھ چرخِ چہارم کے تذکرے نے شعر میں عجیب لطافت پیدا کردی۔

۳ جو دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقین آیا

اُسے جینا نہیں آیا جسے مرنا نہیں آیا

زندگی کے معنی یہ نہیں کہ سانس کا ڈورا لگا رہے خواہ ایسے جینے سے روح پر کرب ہی کیوں نہ ہو۔ اصل جینا وہ ہے کہ انسان موت سے بے خوف ہوجائے۔ اسٹیولس کہتا ہی کہ زندگی کے واسطے ہر وقت فکر بند رہنا اور اُس کے قیام کی خاطر آزادی اور دیگر لذائذ دنیا سے روگرداں ہوجانا خلافِ شانِ بشریت ہی۔ واقعہ یہ ہی کہ زندگی کا لطف وُہی اُٹھاتا ہے جو موت کے خوف کو بالائے طاق رکھ کر غباروں میں بیٹھ کر فضائے عالم کی سیر کرتا ہی کشتی میں سوار ہوکر خوفناک آبشاروں کے دامن میں تفریح کو جاتا ہی۔ اور قومی کاموں میں حصہ لیکر نیلسن کی طرح

کا ہنہیگاں کی لڑائی میں جبکہ اس پر گولیوں کی بوچھار ہو رہی تھی، خوشی سے چیخ اُٹھتا ہے کہ یہ غضب کا دلفریب منظر ہے۔ مجھ کو کوئی لاکھ روپیہ بھی دے تو یہاں سے نہ ہٹوں گا۔ اگر کوئی مرنے سے ڈر کر سخت ناز زندگی کی خاطر معتدل ہوا کے کمرہ میں بند ہو کر قید تنہائی کی زندگی گذارے۔ بدہضمی کے خوف سے محض مونگ کی دال کے پانی پر اکتفا کرے۔ عرق گاؤزبان کے علاوہ کسی دیگر نوشیدنی سے زبان کو محظوظ نہ ہونے دے اُس کی زندگی پر ہزار افسوس۔ وہ جیا کیا۔ زندگی ہی میں ہزار مرتبہ مرگیا ؎

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

؎ ہنگامۂ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے

کھلتا نہیں رازِ دہر شکوہ ہے تو یہ اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

واللہ کتنی سچی بات کہی ہے انسان خدا سے تکلیف کا شکوہ کرتا ہے اور اس کی عنایت پر شکر۔ ایک شخص اُس سے افلاس کا شاکی ہے تو دوسرا کسی عزیز کی جدائی کا۔ ایک دوست ملنے پر خوش ہے تو دوسرا ذلت پر مغموم۔ اکبر حسین اِن فروعی باتوں کو دھیان میں نہیں لاتے۔ وہ شکوہ و شکر کے لیے بدترین اور بہترین شے منتخب کرتے ہیں۔ بیکن کہتا ہے "لوگ موت سے ایسا ڈرتے ہیں جیسا کہ بچے اندھیرے میں جانے سے۔ حالانکہ انسان کے لیے مرنا ایک ایسا ہی فطری امر ہے جیسا کہ پیدا ہونا" موت ایک ایسی بلا ہے جو ہم کو کبھی نہیں نقصان پہونچاتی جب تک ہم ہیں تب تک موت نہیں آسکتی۔ اور جب موت آتی ہے تو ہم نہیں ہوتے ؎

سُنا یہ ہوش ہو جاتا ہے انساں جبکہ ہے مرتا وگرنہ میں تو بیحد اپنے مرنے کی خوشی کرتا

اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو موت بہترین نعمت ہے۔ ایک سی حالت فطرت انسانی کے لیے زہر ہوا کرتی ہے۔ یہ موت ہی ہے جو انسان کو اسی دنیا کی بھول بھلیاں سے نکالتی ہے جس کا

ہردم یہی سوہانِ روح ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں کہاں جائیں گے ہمارے اعمال کا کیا نتیجہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اگر موت نہ ہوتی تو زندگی عذابِ جان ہو جاتی۔ لوگ کنویں ندی میں گر کر جان دیتے مگر زندانِ حیات سے نجات نہ پاتے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے موت کا تحفہ عطا کر کے ہم کو عذابِ دائمی سے بچایا۔ ؎

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

۵ جو خوش کرے گا چاہے گا مجھ کو بھی خوش کرو

دنیا میں بے غرض کوئی راحت رساں نہیں

واقعہ یہ ہے کہ آدمی کو محبت اپنی آسائش سے ہوتی ہے نہ کہ انسان سے۔ ایک اور فلسفیانہ نکتہ دوسری جگہ یوں بیان کرتے ہیں ؎

خیر خواہ آج زمانے میں کہاں ملتے ہیں یہی لاکھ غنیمت کوئی بدخواہ نہ ہو

۶ خدا شناس تو ہونا نہیں ہے سہل اکبر

یہی بہت ہے کہ دنیا شناس ہو جاؤں

جب یہ سمجھ لیا کہ "دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد" پھر اس سے رُوگرداں ہو کر خدا کی جانب رُخ نہ ہوگا تو اور کس کی طرف

۷ مرضِ عشق بھی کیا چیز ہے جس سے صحت

آرزوئے دلِ رنجور یہی ہے کہ نہ ہو

فلسفۂ عشق نہ کوئی آجتک پورے طور پر سمجھا ہے اور نہ سمجھیگا۔ اپنی اپنی بیتی بیان کر کے اکثر لوگوں نے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے مگر بے سود۔ سید صاحب اس رازِ سربستہ کو کھولنے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ صرف اتنا کہکر خاموش ہو جاتے ہیں کہ عشق کوئی ایسا آزار ہے

جس سے شفایاب ہونے کو طبیعت نہیں چاہتی ؎

مرضِ عشق میں صحت سے بھی جی ڈرتا ہے	تم نہ رک جاؤ کہیں درد کے تھم جانے سے

سچے عاشق کو عشق کی دل آزاری ہی میں راحت ملتی ہے۔ عرفی نے دردِ عشق کو من وسلوا کہا ہے۔ کہتا ہے ؎

کامِ جاں را تازہ کردی اے غمِ لذت سرشت	سفے غلط گفتم۔ چہ غم۔ اے من وسلوائے من

سید صاحب بھی اسی بات کو فارسی میں یوں کہتے ہیں ؎

دل غلط کردی ہمہ قربانِ احسانت شوم	دردِ بخشیدی بہ دل این باشد احسان دگر

بالکل سچ کہا ہے ؎

مصیبت عین راحت ہے اگر ہو عاشق صادق	کوئی پروانے سے پوچھے کہ جلنے میں مزا کیا ہے

۸	فرقتِ یار میں بدلی کا مزا کچھ نہ ملا
میری نظروں میں تو رونق تھی برستی کیا تھی

گھنگھور گھٹاؤں کا لطف بس اسی وقت ہے جب یار زیب بزم ہو۔ پھر کہتے ہیں ؎

ہمنفس شاہد دلجو ہو تو جاڑا اچھا	ہمنشیں ساقی مہوش ہو تو برسات اچھی

۹	جستجو ہی میں وہ لذت ہے کہ اللہ اللہ
یاد اس میں ہو جو آرام ملے گا کہ نہیں

تمام حکما اس بات پر متفق ہیں کہ جتنا لذت کسی شے کی جستجو میں ہے۔ نہ کہ اس کے حصول میں۔ اس کے ملنے سے پہلے جو خیالات کہ دورانِ تجسس میں آتے ہیں اصل مزا ان میں ہے۔ جوں جوں اس شے کے حصول کا زمانہ قریب آتا جاتا ہے اس کے خیال میں مسرت۔ کن دونی رات سوائی بڑھتی جاتی ہے ؎

ہر قدم پر ہی فزوں لذتِ سرگرمی سعی شوق نے خوب مزے دوریِ منزل کو دیے

جب شے مطلوبہ حاصل ہو جاتی ہے تو وہ تخیل کا لطف خواب و خیال ہو جاتا ہے ہر شخص محسوس کرتا ہو کہ اُس کے حصول میں اتنا لطف ہرگز نہ آیا جتنا کہ اُس کی امیدوں میں تھا۔ اِس بنا پر داغ نے کہا ہے ؎

خدا کرے کہ مزا انتظار کا نہ مٹے مرے سوال کا وہ دیں جواب برسوں میں

کوئی رضی احمد شرر بدایونی سے پوچھے کہ آپ کو اس اصرار میں زیادہ لطف آیا کہ۔

دل میں کہتا تھا کوئی دم میں اب آتے ہونگے رل رہے ہوں گے مِسّی سُرمہ لگاتے ہونگے
شانے سے کاکلِ پر پیچ بناتے ہوں گے رنگ مہندی کا کفِ پا پہ جماتے ہونگے

یا وصل سے زیادہ محظوظ ہوئے۔؟

حرص گھٹ جائے وہی نعمتِ عظمیٰ ہوگی
میری دولت نہیں بڑھنے کی تو اچھا نہ بڑھے

حرص کم ہو جانا ایک بڑی نعمت ہاتھ آنا ہے۔ جبتک حرص موجود ہو اس وقت تک خواہ کتنی ہی دولت بڑھ جائے انسان کی طبیعت مطمئن نہیں ہو سکتی۔ ذوق کا شعر ہے ؎

منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

حرص کی موجودگی میں قناعت نہیں آسکتی اور بغیر قناعت اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیئے عقلا ہمیشہ خدا سے نعمت کے بجائے قناعت چاہتے ہیں۔ ایک انگریزی مثل ہے کہ غریب وہ لوگ نہیں ہیں جن کا اثاثہ کم ہو بلکہ وہ ہیں جن کی خواہش زیادہ ہے

ہے اگر منزلِ راحت کی طلب اے اکبرؔ وہ جگہ ڈھونڈھ تمنا کی جہاں راہ نہو

پھر کہتے ہیں ؎

عقیلہ۔ نہیں نہیں۔ کہو۔ میں احسان مانتی ہوں کہ تم نے مجھے گھر میں پڑا رہنے دیا۔ ورنہ جیسے دری۔ چوکیاں۔ لوٹے پاندان۔ دیگچی۔ پلنگ۔ بیچ ڈالے مجھے بھی بیچ ڈالتے تو کیا کرتی۔ مجھے جہیز کا سامان جب یاد آتا ہے تو کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ تو نے مجھے لوٹ لیا۔ غارت کر دیا۔

عبداللہ۔ یہ تو میاں بیوی کی محبت کا ثبوت ہے

عقیلہ۔ بھاڑ میں جائے محبت اور چولھے میں جائے اس کا ثبوت۔ دیکھ مجھے زیادہ نہ چلا۔ گھر میں ایک تنکا نہ چھوڑا اب ایک ایک کوڑی کے لیے ہم محتاج ہیں۔ اور ایک ایک دانے کو ترستے ہیں۔

عبداللہ۔ دنیا میں رزق کی کمی تو عاقبت میں آرام کی نشانی ہے۔

عقیلہ۔ بس مجھے تو دن رات کھانے اور شراب پینے اپنا دوزخ بھرنا آتا ہے۔

عبداللہ۔ بیکار رہنے سے تو یہ اچھا ہے۔

عقیلہ۔ خدا کی مار اس سمجھ پر۔ ان بچوں کو کیا سنکھیا کھلاؤں۔

عبداللہ۔ بچوں کے معاملے میں میں بالکل دخل دینا نہیں چاہتا۔ آپ کو پورا اختیار ہے سنکھیا کھلائیں یا افیون۔

عقیلہ۔ ظالم میں روتی ہوں تو ہنستا ہے میں فاقے پر فاقہ کر سکتی ہوں مگر یہ معصوم تو ایک گھڑی بھی بھوکے نہیں رہ سکتے

عبداللہ۔ بچوں کو بھوکا رکھنا ٹھیک نہیں ہے جو مانگیں فوراً دو۔

عقیلہ۔ دام کہاں سے لاؤں۔ تیرے سر پیٹے جو کچھ تھا وہ تو تیرے شراب کباب کے نذر ہوا۔ تیرے نشے کی بدحواسی۔ تیری قے کی غلاظت کب تک برداشت کروں۔ یا اللہ یا تو اسے موت دیدے یا مجھے اٹھا لے۔ اس مصیبت سے تو مرنا ہی بہتر ہے۔

عبداللہ۔ بیوی اس میں خفا ہونے کی

کونسی بات ہے۔ تم تو مذاق میں بگڑ گئیں

عقیلہ۔ بے ایمان تجھے خدا رسول کا بھی
خوف نہیں۔

عبداللہ۔ یہاں خدا رسول کا کیا ذکر ہے۔
اور ہاں یاد آیا خدا کا تو حکم ہے کہ مرد عورتوں کے
حاکم ہیں۔ اور جب میں حاکم ہوں تو اس
گستاخی کی سزا دینا مجھ پر فرض ہے

عقیلہ۔ آہاہ یہ بھی سزا دینگے! خدا کی
شان!!

عبداللہ۔ تم نے میرا غصہ دیکھا نہیں ہے
دیکھو اب آیا۔

عقیلہ۔ ایسے ایسے غصے جانے کتنے دیکھے
ہیں۔ آتا ہے تو میری پاپوش سے ایک بار
نہیں ستر بار آئے۔ جب تک لحاظ
تھا۔ تھا۔ اب نہ لحاظ ہے نہ خوف۔

عبداللہ: معلوم ہوتا ہے تمہاری شامت
آئی ہے۔ ایسی سزا دوں گا کہ یاد رکھو

عقیلہ۔ پہلے منہ تو بنوا آؤ۔ بے حیا۔ ذلیل
دن رات نشے میں چور رہتا ہے۔

عبداللہ۔ تم لے دیکھو۔ تو ایسے تھوڑے ہی
مانے گی۔

. . . .

. . . .

عقیلہ۔ ہائے میرا کان گیا۔ ارے میرا
ہاتھ ٹوٹا۔ ارے مار ڈالا اس ظالم نے

عبداللہ۔ تمہارا علاج یہی ہے۔ لاتوں کے
بھوت باتوں سے تھوڑے ہی مانتے
ہیں۔ اب زبان نہیں چلتی۔ بتاؤ
مردوں کی اطاعت کرنی چاہیئے یا نادانی؟

عقیلہ۔ (آنسو پونچھ کر) تمہارا خدا بھلا کرے
کہ تم نے مجھ بے وارثی کا کچومر نکال دیا۔
تمہارے بس میں ہوں اور مار دو۔

عبداللہ۔ مجھے مارنے کا شوق نہیں ہے میں
کیوں ماروں گا۔ بعض وقت تم ہی مجھے
مجبور کر دیتی ہو۔ لو بس اب رونا دھونا
ختم کرو۔ پیاری جان۔

عقیلہ۔ مارتے مارتے جب جی بھر گیا تو اب
چوہیا مار کر . . . . . سنگھانے چلے۔

عبداللہ۔ آخر ان باتوں سے فائدہ؟

بیویوں کی سی باتیں کرو۔ میری کلہاڑی کس
کونے میں اور بوتل کس طاق پر ہے۔ لاؤ
جلد دو۔ مجھے دیر ہوتی ہے۔ لو میں جاتا ہوں
کواڑ بند کرلو۔ آج اتنی لکڑیاں لاؤں گا کہ
تم بھی خوش ہو جاؤ۔

(عقیلہ کواڑ بند کرنے جاتی ہے تو دروازے کے
پیچھے گفتگو سنتی ہے)

کلیم: یار شہر میں کوئی اچھا طبیب ڈھونڈھو
نہیں ملتا۔ صاحبزادی کا اچھا ہونا مشکل
معلوم ہوتا ہے۔ سرکار کو بھی مایوسی ہو چلی ہے
سمجھ میں نہیں آتا کوئی اچھا طبیب کہاں ملے
اوّل تو یہاں اِنے گنے پانچ چھ طبیب ہیں
اور ان میں سے بھی کوئی ایسا نہیں جو
کامل ہو آخر تم نے بھی کبھی غور کیا کہ کیوں
دفعتاً گونگی ہو گئیں۔

سلیم: جب طبیبوں کی سمجھ میں نہیں آیا تو میں
کیا سمجھ سکتا ہوں حکیم مجرالبہود نے تشخیص
کیا کہ دماغ کی عروق ماساریقا میں پھری
ہوئی ہو گئی اور اسی وجہ سے زبان کی
رگیں اپنی غذا جرام مغز سے حاصل نہیں
کر سکیں اور خشک ہو کر رہ گئیں۔

اس کے بعد "حکیم قرابادین" نے بتلایا کہ قلب
کے بائیں طرف کے پٹھوں پر کسی غیر معمولی
اذیت کا اثر پڑ گیا ہے اور اس لیے
غدود رلقیہ میں یبوست آگئی جس کا نتیجہ
ظاہر ہے کہ زبان نے جواب دیدیا۔ مگر
اس تشخیص کی صحت اُن کے علاج سے
ثابت نہ ہو سکی۔ بڑے بڑے نسخوں کے
ذریعے سے سارا دواخانے کا دواخانہ
مریضہ کے پیٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ اور
بدن کی ایک ایک رگ عرق و شربت کی
بوتل ہو گئی مگر آرام کچھ بھی نہیں ہوا۔ "حکیم
اسہالی" کے مسہلوں نے ناک میں دم
کر دیا مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ یہی کہتے
رہے کہ زبان کے عضلات میں مواد
سوداوی کا اجتماع ہو گیا ہے۔ جب تک
تنقیۂ عام و خاص نہ ہو گا آرام نہیں ہو سکتا۔
"حکیم بی مار" کی تشخیص پر تو میں بھی حیران تھا

کہ نئی ترکیب سے علاج ہوگا۔ اُن کی رائے تھی کہ خراب ہوائیں جو دل میں داخل ہوئیں اُن کی وجہ سے دل نے کمزور ہو کر ارادۂ کلام کو خارج کر دیا جس سے آلات حنجرہ مری بیکار ہو گئے اور ناطقہ بند ہو گیا۔ مگر سرکار نے کسی بدگمانی کی وجہ سے علاج نہیں کروایا۔ حکیم "راس کلان" نے تجویز کیا۔ جگر کے سست ہونے اور کمی خون کی وجہ سے مرض ہوا۔ لہذا مریضہ کو کسی گاؤں میں رکھا جائے اور جنگل کی نباتات کھلائی جائے تاکہ سبزی خوروں کی طرح آواز بلند ہو جائے۔ ہندوستانی اخبارات سے روزانہ معلوم ہوتا ہے کہ آج پنڈت جی کے لکچر نے شملے کو ہلا دیا اور آج مہاتما جی کی آواز لندن پہنچ گئی۔ سرکار اس علاج سے خوش تھے مگر صحت پھر بھی نہیں ہوئی۔ اب صرف حکیم "موصلی" رہ گئے جو بجائے ذکریا رازی کے اسحٰق موصلی کو استادِ فن مانتے ہیں۔ اُن کی تجویز ہوئی کہ مریضہ کو ہر وقت گانا سنایا جائے۔

کلیم۔ اب سرکار دہلی کیوں نہیں لے جاتے۔ سنا ہے حاذق الملک تو حکمی علاج کرتے ہیں۔

سلیم۔ بھئی میں کہتے ہوئے ڈرتا ہوں اصلی بات یہ ہے کہ مرض ورض کچھ بھی نہیں۔ شادی کا معاملہ ہے سرکار جن بڈھے رئیس سے اُن کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کو وہ پسند نہیں کرتیں کیونکہ تم جانتے ہو کہ سرکار نہ علم دیکھیں نہ عمر۔ دولت کو دیکھتے ہیں۔ اُن کا ایمان ہے کہ پڑھے لکھے اگر دولت نہیں رکھتے تو انسان ہی نہیں ہوتے۔ اب اس بیماری کی خبر سن کر بڈھے رئیس کو بھی شادی کرنے میں پس و پیش ہے۔

کلیم۔ بھئی خدا کرے کہ وہ جلد اچھی ہو جائیں اور انھیں رئیس صاحب سے شادی ہو جائے تو یقیناً ہمیں بہت کچھ دینگے۔ یار جس طرح ہو کسی علاج کرنے والے کو ڈھونڈھو۔ خدا جانے شہر میں چھپے ہوئے کتنے کامل پڑے ہونگے جو ہمیں نہیں معلوم۔ تلاش کرنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔

عقیلہ کواڑ کی آڑ میں سے یہ سب سن رہی تھی اپنے میاں سے انتقام لینے کی فکر میں تھی کہ .... اندر سے بول اُٹھی،

"ایک صاحب کو میں جانتی ہوں جن سے آپکا مطلب پورا ہو سکتا ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے حکیم ہیں اور دور دور تک ان کا نام ہے"۔

سلیم۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی اگر ان صاحب کا پتہ بتا دو۔

عقیلہ: سامنے والے جنگل میں لکڑیاں کاٹتے ملنگے

کلیم: لکڑیاں کاٹتے ؟

عقیلہ: ہاں وہ لکڑیاں کاٹا کرتے ہیں یا دیوار بنایا کرتے ہیں وہ کوئی ایسے ویسے آدمی تو ہیں نہیں اُن کی عجیب عجیب باتیں اور عادتیں ہیں۔ اپنے علم کا وہ کبھی اقرار نہیں کرتے دنیا والوں سے بچنے کے لیے پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے جنگلوں میں پھرا کرتے ہیں۔ صورت شکل سے کبھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ ایسے ہیں مگر دنیا جہان کے علم اور بیماریوں کا علاج جانتے ہیں۔ اپنے علم دِ پیٹ بھرنے کو حرام سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ پُرانے مولوی اور حکیم سب ہاتھ پاؤں چلا کر کھایا کرتے تھے۔

سلیم: کسبِ حلال بیشک پُرانے بزرگوں کا دستور تھا دیکھیے شمس الائمہ حلوائی تھے اور ابو بکر اسکاف (موچی) تھے۔

سلیم: اصل یہ ہے کہ ان زیادہ علم والوں کو کسی نہ کسی قسم کا مراق ضرور ہوتا ہے۔

عقیلہ: مگر ان کا جنون سب سے بڑھا ہوا ہے۔ کتنا ہی کہو کتنی ہی خوشامد کرو مگر وہ کبھی اقرار نہیں کرتے کہ میں حکیم ہوں اور علاج کرونگا۔ ترکیب یہ ہے کہ پہلے اُنھیں خوب پیٹا جائے اس کے بعد جب وہ اپنے آپ کو حکیم مان لیں تو علاج کا وعدہ لیا جائے ہم لوگ تو یہی کرتے ہیں۔ بغیر پٹے ہوئے وہ بھلا قابو میں آنے والے ہیں۔

سلیم: قسم خدا کی یہ نیا جنون ہے۔ اُن کا نام کیا ہے۔

عقیلہ: اصلی نام تو حکیم قطرب ہے لیکن اس لیے کہ دنیا والے دق نہ کریں انھوں نے اپنا سادہ نام عبداللہ رکھ لیا۔ سُنیے کل ہی کا ذکر ہے کہ محلّے میں ایک بیوی ایسی بیمار تھیں کہ تمام بید اور حکیم جواب دے چکے تھے۔ پرہیز تک اُٹھا دیا تھا۔ مرنے لگیں۔ سانس اُکھڑ گیا۔ جان نکل رہی تھی۔ بدن ٹھنڈا ہوئے چار گھنٹے گذر گئے تھے۔ کفن دفن کی طیاریاں ہونے لگیں کہ کوئی ان حکیم جی کو پکڑ لایا جب اچھی طرح مار کھانے کے سبب علاج کرنے پر راضی ہوئے تو ایک دوا خشخش کے دانے کے برابر نکالکر مریضہ کے زبان پر رکھدی۔ خدا کی قدرت کہ اُدھر منہ میں دوا پہونچی حلق سے ابھی اُتری بھی نہ ہو گی کہ ایک چھینک آئی۔ بدن چلنے لگا کروٹ لی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کھڑی ہو گئی اور پہر دیکھتے دیکھتے گھر کا کام کاج کرنے لگی۔ اور معلوم ہوتی تھی کہ وہ بیمار رہی نہ تھی۔

سلیم: واقعی یہ تو بڑا کمال ہے۔

کلیم: شاید وہ دوا سونے کی اکسیر ہو گی۔ ایسا آدمی کیمیا ضرور جانتا ہو گا۔ اگر مل گئے تو نسخہ پوچھ کر ہی رہونگا۔

عقیلہ: کیمیا ویمیا تو میں جانتی نہیں۔ ایک دن میں نے سُنا تھا کہ ایک سنار کو کوئی چار سیر سونا دے گئے تھے

کلیم: تو بھی اُن سے ضرور ملنا چاہیے وہ تو بڑے کراماتی معلوم ہوتے ہیں۔

عقیلہ: اس میں شک کیا ہے۔ کئی دن ہوئے ایک شخص پر دیوار گر گئی تھی بیچارے کا سر پھٹ گیا پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں چور چور ہوگئیں۔ تمام بدن لہولہان ہوگیا۔ اتنے میں حکیم جی کو پکڑ بلایا۔ اور خوب مار پیٹ کر علاج پر آمادہ کیا اُنھوں نے ایک شیشی نکال کر اس میں کا تیل پھریری سے ناخنوں پر لگا دیا۔ وہ فوراً اُٹھ بیٹھا۔ اور سب کے سامنے چلنے پھرنے لگا۔ نبض تو ایسی دیکھتے ہیں کہ سات پُشت کا حال بتا دینا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک پردہ نشین بیگم صاحبہ سخت بیمار تھیں اور کسی غیر مرد کو اپنا ہاتھ تک نہیں دکھانا چاہتی تھیں انھوں نے ہاتھ پر ڈورا باندھ کر پچھلا حال سب سُنا دیا اور اُن کے لڑکے کا ہاتھ دیکھ کر اگلا حال بتا دیا جیسے کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ کوئی دو مہینے ہوئے کلکتے سے اُن کی تلاش میں ایک صاحب آئے جو بڑے رئیس تھے جب اُنھوں نے تلاش کر کے اور اُن کا علاج کر کے معالجہ پر راضی کر لیا تو حکیم جی نے بتا دیا کہ تمہارے دادا کا یہ نام تھا اور تم اُن رئیس کے پوتے ہو۔ وہ بڑے حیران ہوئے۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ یہ کیسے کیا جانیں؟ تو حکیم جی نے بتایا کہ میں ایک شخص کا علاج کر چکا ہوں جس کی نبض میں اور تمہاری نبض میں اس قدر یکسانیت ہے جس قدر کہ دادا اور پوتے میں ہونی چاہیئے۔

سلیم: یہ تو بالکل نئی بات ہے۔

کلیم: شاید سرخ گندھک کے تیل کا یہ اثر ہے جس سے ادھر تو وہ اکسیر بنا لیتے ہیں۔ اُدھر خود اُن کے ذہن و حافظہ کا یہ عالم ہے۔ کیوں صاحب اُنکی عمر کتنی ہے۔

عقیلہ: یوں تو اُن کی عمر کچھ اوپر تین سو کی ہوگی اکبر بادشاہ کے حکیموں کے ساتھ پڑھے ہوئے ہیں لیکن سُنا ہے ایک عرق کے استعمال سے جو بڑی محنت سے ایجاد کیا ہے وہ بالکل جوان معلوم ہوتے ہیں۔ چالیس پینتالیس سے زیادہ اُن کی عمر نہیں جچتی۔

کلیم: ہم اتنے پریشان کیوں ہوتے اگر پہلے سے ان بزرگ کا حال معلوم ہو جاتا۔ اس دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر باتیں کرنا تو کام دیگیا۔ ان سے ملکر کیمیا کا نسخہ ضرور لینا چاہیئے۔

سلیم: تمہیں کیمیا کی سوجھی ہے۔ بھائی اگر وہ ایسا ہے تو ملنے کے قابل ہے۔ بہن آپ کی بڑی مہربانی ہے جو ہمیں اُن کا حال بتا دیا۔

کلیم: جلد چلو۔ سامنے جنگل میں وہ ملنگ ہے۔ اگر نسخہ بتا دیا تو تو کری کو میرا سلام ہے اور اگر علاج پر راضی ہو گئے تو سمجھو کہ وہ اچھی ہو گئیں پھر کیا ہے۔ اسی ہفتے میں شادی ہو جائے گی اور وہ رئیس ہیں مالا مال کر دیں گے۔ اُن سے میں نے سب پکّی کر لی ہے۔

سلیم: کیا لغو بکتے ہو۔ چلو۔ ..... (جنگل کے قریب پہونچ کر) یار کوئی شخص کچھ گا رہا ہے ایک مصرعہ تو میں نے سُن لیا ؎

"اب تو سے پیتے ہیں ایمان رہے یا نہ رہے"

کلیم: سوائے حکیم صاحب کے اور کون ہو سکتا ہے دیکھو بوتل بھی رکھی ہوئی ہے یار وہی عرق ہے جلد چلو۔ ....

سلیم: السلام علیکم۔

کلیم: آداب عرض ہے۔ آپ ہی کا نام حکیم تعلرب ہے۔ آپ ہی کو عبد اللہ کہتے ہیں۔

عبد اللہ: کیوں۔

سلیم: اگر آپکا نام عبد اللہ ہی تو آپ سے ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

عبد اللہ: اگر کوئی اچھی بات ہے تو میں عبد اللہ میرا باپ عبد اللہ نہیں تو ....

کلیم: خدا کا شکر ہے کہ جناب تک رسائی ہو گئی۔ حضور کی زیارت کا ہمیں بیحد اشتیاق تھا حضور جیسی قابلیت کے بزرگ سُنے جاتے تھے ویسے ہی نکلے۔

عبد اللہ: بالکل صحیح۔ میں ہی وہ شخص ہوں جو لکڑی کاٹنے میں اس وقت اُستاد ہے اگر میرے پیشۂ شریف کے متعلق کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔

سلیم: جناب یہ کیا فرماتے ہیں۔ ہمارا یہ مطلب نہیں۔

عبد اللہ: آپ کا جو مطلب ہے میں سمجھ گیا یہ بوجھ ۔۔ روپیہ میں آپ لے جا سکتے ہیں

سلیم: یہ کیا فرماتے ہیں۔

عبد اللہ: بس اس سے کم میں نہیں دے سکتا

کلیم: کیا حضور سمجھتے ہیں کہ میں نے حضور کو نہیں پہچان لیا۔

عبد اللہ: اگر مجھے جانتے ہو تو سمجھ لو کہ میں دوسری بات کبھی نہیں کہتا۔ آپکے ساتھ یہ رعایت کیا کم ہے کہ میں نے خود ہی دام کم کر دیے۔ لینا ہو تو لیجیے۔ پھر یہ مال اتنے میں نہیں مل سکتا (خود بخود) اس وقت اگر میری بیوی ہوتی تو دیکھتی کہ میں کس طرح

مول تول کر رہا ہوں۔ ہاں جناب میں اس سے
کوڑی کم بھی نہیں دے سکتا۔ دیکھ لیجیے دو پونڈ
کی دوا ہے

سلیم: آپ بھی اتنا نہ بنائیے کچھ ارشاد فرمائیے
حضور کیا مذاق فرما رہے ہیں۔

عبداللہ: بازار میں تمہیں دوگنے داموں پر بھی
اتنا نہیں مل سکتا۔ آپ وقت نہیں دیکھتے
لکڑی کا بھاؤ آسمان پر ہے۔

سلیم: جناب خود خیال فرمائیں کہ آپ جیسے طبیب
حاذق کے لیے یہ باتیں کہاں تک مناسب ہیں
آپ جیسے قابل و فاضل بزرگوں کی مخلوقِ
خدا کو سخت ضرورت ہے اس طرح پوشیدہ رہنا
ہرگز زیبا نہیں۔

عبداللہ: ارے میاں سٹری ہو گئے ہو۔ میں اور
طبیب! آپ کو دھوکہ ہوا۔

کلیم: جناب ہم سے آپ کو نہ چھپائیے۔ ہم جو جانتے
ہیں وہ جانتے ہیں۔ ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں

عبداللہ: آپ کیا جانتے ہیں؟

سلیم: یہ کہ آپ طبیب ہیں۔ ہم صاف صاف عرض کیے
دیتے ہیں کہ ناگوار باتوں کے لیے ہمیں مجبور نہ فرمائیے
اور اپنی زبان سے طبیب ہونے کا اقرار کر لیجیے۔

عبداللہ: وہ کیا باتیں ہیں۔؟

سلیم: جن کوشش کرنا آپ کبھی خوش ہو کر نہ ہوں گے
براہ کرم کہیے میں طبیب ہوں۔

عبداللہ: میں قسم کھا کر کہتا ہوں میں طبیب نہیں
نہ میرے باپ طبیب تھے۔ ان بیچاروں نے
مرتے دم تک ڈھلیا ڈھوئی ہیں لکڑیاں کاٹتے
کاٹتے مر جاؤں گا۔ کیوں میرے سر ہوتے ہو۔

سلیم: حضور طبیب نہیں۔ حضور اقرار نہیں کریں گے
اچھا بھائی کلیم اب علاج کرو۔

عبداللہ: نہیں نہیں میں طبیب نہیں ہوں تم کیا بکتے ہو

کلیم: اچھا میں خبر لیتا ہوں۔ کیوں صاحب نہیں کہیے گا
کہ میں حکیم ہوں . . . .

. . . .

عبداللہ: مارتے کیوں ہو۔ جو کہو تو میں حکیم ہوں

کلیم: معاف کیجیے میں تو پہلے ہی عرض کر چکا تھا

سلیم: مجھ کو سخت افسوس ہے کہ حضور نے فضول اس گستاخی پر مجبور کیا

عبداللہ: مجھ کو آپ سے بہت زیادہ رنج و افسوس ہے
کہ خواہ مخواہ آپ نے اذیت دی۔؟
یہ بھی کوئی مذاق ہے۔ زبردستی اقرار کرانے
سے کیا فائدہ

سلیم: تعجب ہے کہ حضور اب بھی انکار فرما رہے ہیں
واقعی حضور طبیب نہیں۔؟

عبداللہ: خدا مجھ پر لعنت کرے اگر میں طبیب ہوں
یا میں نے کسی سے ایک حرف طب کا پڑھا ہو

کلیم: اچھا پھر انکار۔ حضور ابھی نہیں مانتے

. . . .

عبداللہ: میں حکیم۔ میرے باپ حکیم تھے
عطا بھی۔

دو بہنوں کی سرگذشت

ہمشیرہ کی شادی کو برس گذر گئے اور اُسکے بطن سے چوبیس کا بچہ بھی وجود میں نہ آیا بات یہ تھی کہ سمیع اللہ آوارہ تھا
بیوی کو منہ لگانا نہ اُسکی سنتا اور نہ اپنی کہتا اسی تنگ رہتی اور آپس کی ناموافقت نے اس گھر کو مدتوں تباہ رکھا بالآخر میاں
نے بیوی کا منہ دیکھا اور سلسلہ اولاد شروع ہوا۔ آج سے کوئی برس پہلے خدا خدا کرکے پیدا بھی ہوئی تو ایک لڑکی
خبر جہاں دہشت ہیں وہاں انڈے دو کو بڑے اعلیٰ پیمانہ پر جشن کی تیاریاں شروع کی گئیں بمبئی کی سرزمین اول تو ویسے
ہی دلکش ہے اور اس واقعہ نے اس کی ہمہ گیری سخت تر کردی بنگال کے بادشاہ جن کا تاج محض قدرتی پھولوں
سے مرصع ہوتا تھا لکھنؤ کے رئیس پٹنہ کے مہاراج لاہور کے سیٹھ جی غرض ہندو مسلمانوں میں ایسا کون تھا
جس کو دعوتی رقعے نہ بھیجے گئے۔ البتہ علیگڈھ والے سید صاحب کے آدمی یہ رقعہ پہنچتے ہی انکار کر دیا کہ یہ اس
پیرانہ سالی میں بلیچ رنگ کی تحمل اُن کے شاہانہ شان کب تھی۔ بہت خوشامد کی گئی۔ اُن کے کاتب کے لئے ماہانہ رقم مقرر
کرنے کے وعدے کئے گئے لیکن سید صاحب اسی طرح اڑے رہے جس طرح اہل افغانیہ تمیم کے مسئلے پر بڑی دھوم دھام
یہ رسم منائی گئی اور سب سے پہلے گھٹی بنے صاحب نے (جن کو لوگ بھی کہتے تھے) پلائی

آرائش کا کیا کہنا ہے۔ طلسم بنگالہ تکلفات اودھ۔ پنجاب کی صبح اس کی ملاحت اور صوبہ متحدہ
کے تقدس سے جو کچھ ہو سکتا تھا کسی نے کسر نہ اٹھا رکھی۔ ماشاءاللہ اٹھان خوب تھا بچے کے پیر پالنے ہی
میں معلوم ہو گئے اور اگلے سال جبکہ وہ چھٹے پایا تھا۔ اس نے کلکتے کا سفر اختیار کیا۔ اس کی سالگرہ
کا تمام صرفہ بھی بنگالی رشتہ داروں کے سربراہ نے پچا کے بعد دادا بھائی تھے جنھوں نے دست شفقت اس
ہونہار بچی کے سر پر رکھا کلکتہ راجہ رام موہن رائے کا مولد تھا بغیر مذہب کے جامے کے کیسے آنے دیتا۔ چنانچہ اس
یادگار میں برہمو سماجیت غالب آئی اور اُس کے مذہب میں ہندو مسلمان پارسی عیسائی کی قید نہ رہی اور
فیصلہ کر دیا گیا کہ ہر سال ایک نئے مقام پر جنم اشٹمی کی رسم ادا کی جائے۔ ہندو کو کیا مشکل تھا۔ ہما بہت لیکر اس کماری
کہ انھیں کا پورا سے پیلی ہوئی ہو۔ اگلے سال بمبئی کے ملا کو طلب کیا گیا جو کہ طبیب خاطر اور نہایت ذوق شوق سے شریک ہوئے
کلمہ پڑھانے کی ہزاروں تدبیریں کیں لیکن ملاجی کی ایک پیش نہ چلی اور اس تقریب سالگرہ کے نظام میں اتنا بھی
فرق نہ پڑا جتنا کہ پریذیڈنٹ لوسی کی صلح کانفرنس میں شرکت کا۔ جسطرح اب وہ ترکی اور خلافت کمیٹی کے متعلق کوئی
خوشگوار فیصلہ کرانے سے قاصر ہے اور اسی طرح دین اسلام کا یہ بھی نکحاط و سقوط کی نذر ہو گیا۔ اس دوران
میں کئی مرتبہ الٰہ آباد کی زینت بنی۔ لکھنؤ کی گومتی کا مجرا بھی ہوا۔ ٹیگور کے ہم وطن شعراء نے قصیدہ خوانیاں بھی کیں۔ مہاتما
گاندھی کے نظارہ فردوس حسن کی سرکاریں اور جنوب ہند کے نوابوں کی شاہانہ عظمت و جبروت نے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا

کر سکو سنا کے ہم آغوش کروں لیکن کال امپرھون یا دِتا تنہا ہندوستان کے چپے چپے میں اس منچلی کماری کی شیر یائی اینکو لی خبر مشہور ہو چکی
تھی اور ہر سال ایک نئے گوشے سے دیدار و جلوہ کی تمنا ظہور میں آتی اور ترانی سے اُنکی آواز دنکو کبھی خاک میں ملایا جاتا چنانچہ للهعه سے پونہ
امراوتی۔ بنارس۔ سورت۔ بانکی پور سب نے حق ادا کیا اور ہر جگہ ملک کے فرش پر اس نازنین نے شرف استراحت بخشا۔

تیرہ سے پندرھواں برس تھا۔ ہنگو نکے دن۔ جوش جوانی اور پھر واجد علی شاہ مرحوم کا دار الحکومت لکھنؤ تو لگتا کیسا یہ کہیئے آنکھ لگے
بغیر کیسے رہتی۔ اگر اس دوشیزہ کے پاس شیوہ بیانیوں۔ ہوش ربا طلسم آرائیوں اور گوناگوں عشوہ طرازیوں کی کمی نہ تھی
تو لکھنؤ کے رنگین اور منچلے عشاق کے پاس شاہد پرستی اور محبوب پرستی کے جذبات کی قلت کب تھی۔ غرض خوب بسنت
کا رسمی چپنی اور رومیش بابو کی سرپرستی میں خوشی خوشی رسم نکاح ادا کرا دی گئی۔ "نہی ہوں" جیسے ہمارے خواہ مخواہ کی جدت کے
ما حسل کہتے ہیں لاہور میں ہوا اگر یقین نہ ہو تو رولٹ کمیٹی والے جسٹس چندر وارکر کو شہادت میں پیش کرنا پڑیگا آٹھ برس
تک دولہا دولہن چین کی بنسی بجاتے رہے۔ ڈرائنگ روم کی دیگر آرائشوں کا لکھنا فضول ہے البتہ یہ کتبہ خط طغرا میں
نہایت جلی قلم سے لکھا ہوا ہم نے بھی دیکھا تھا کہ آہستہ خرام بلکہ مخرام۔

باب الملک (سورت) میں پریاگ کے پنڈت جی۔ مہاراشٹر کے پنڈے ایک بنگالی بابو کی سرکردگی میں جمع کیے گئے تھے
کہ نہایت بے لکیلالہ صاحب آ دھمکے۔ اس مختلف اللون دستر خوان پر بدمزگی نہونے کے کیا معنی۔ چنانچہ ایک طرف سے بھات
اور ماشلی (مچھلی خشکہ) کی مانگ تھی دوسری جانب کا چوکا علحدہ ٹیکر کی تمنا اور زیادہ چھوٹ پٹے مال کی تھی لہذا جوتہ چلا
اور خوب چلا۔ ان تعلیم یافتہ براتیوں نے جوڑے چماروں کو تھوڑی دیر کے لیے شرما دیا۔ رپورٹ پولیس
میں پہونچی۔ پریاگ کے پنڈت جی تو تھوڑے دنوں کے لیے سرکاری گواہ بن گئے۔ بابو جی مظلوم ثابت ہوئے
لیکن مہاراشٹر کے مہاراج لپیٹے میں آگئے۔ پولیس ویسے ہی بہت خوش تھی۔ خوب کس کے چالان کیا اور
دس برس کو نپوا دیا۔ قہر درویش۔ درویش کی جان پر۔ ہا اور دشمن نعلیں بجاتے ہوئے گھر آئے۔

(باقی آئندہ)

جنوری کا رسالہ حسب معمول آخر ماہ میں شائع ہوگا۔
لہذا سال نو کا خیر مقدم اسی نمبر میں کیا جاتا ہے

سال نو مبارک

"رسالہ نقیب" ۔ بدایوں

محمد علی . شوکت علی

وحید احمد قاضی عبدالغفّار

فہرست مضامین

جنوری سنہ ۱۹۲ء

جنوری نمبر کی قیمت ۴ر

سالانہ قیمت قسم اول للعہ قسم دوم عہ نمونہ کے لیے ۳ کے ٹکٹ پیشگی۔

کسی خاص نمبر کی قیمت بلحاظ قسم آٹھ آنے نقیب آخر ماہ میں شائع ہوتا ہے۔

نقیب

جلد ۲ — جنوری سنہ ۱۹۲۰ء — نمبر ۱۲

پانچ سال بعد!

(بہ تقریب تہنیت)

اِن وارفتگانِ عشق کی رودادِ زندگی اور پھر اُس کا وہ کیف۔ کہ اُس نے دو معمولی انسانوں کی زندگی میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا:۔ ایسی چیز نہیں کہ اڈیٹر صاحب نقیب نے فرمائش کی اور میں نے قلم برداشتہ لکھدی!

آیندہ نسلیں بہت سی جستجو کے بعد شیرازۂ حیات ملّی کے اِن زرّیں اوراق اور اُن کے منتشر پُرزوں کو یکجا کرینگی اور زندگی کے شاہراہ پر جہاں ہم سے پہلے گذرنے والی قوموں کے آثار آج بھی اہلِ بصیرت کے لیے تازیانۂ عبرت ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کے مجاہدینِ راہِ حق کا ہر نقشِ قدم نشانِ راہ بنایا جائیگا۔ اگر آپ مجھ سے کہیں کہ میں **شوکت علی** اور **محمّد علی** کی زندگی پر کچھ لکھوں تو میں کہوں گا کہ یہ [illegible] ہے باوجود اس عقیدت کے جو مجھے اُن کے ساتھ ہے باوجود

اُس محبت کے جو اُن کو مجھ سے ہے، باوجود اُن مخلصانہ مراسم کے جو میرے اُن کے درمیان ہیں اور باوجود اس امر کے کہ میں نے اپنی ابتدائی زندگی کے چند سال شب و روز اُن کی صحبت میں گزارے ہیں۔ میں اپنے اندر وہ اہلیت نہیں پاتا کہ اُن کی سیرت پر چند سطریں بھی لکھ سکوں! اُس روحانی عظمت کا صحیح اندازہ میرے امکان سے باہر ہے، نہ میں حوصلوں کی اُس بلندی تک پہونچ سکتا ہوں جو دنیا کے سامنے عزائم عالیہ کا ایک حیرت انگیز نمونہ پیش کرتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ میں اور میری طرح **شوکت علی** اور **محمد علی** کے بہت سے عقیدت کیش بتا نہیں سکتے کہ وہ کیا چیز تھی جو چھنڈواڑہ اور بیتول میں جیلخانے کی دیواروں کے اندر اُس جوہر عالی کے نشو و نما کا باعث ہوئی جس کی صرف ایک جھلک **شوکت علی** کی دلچسپ شخصیت اور کامریڈ کے صفحات پر **محمد علی** کے رشحات قلم میں کبھی کبھی نظر آجاتی تھی!

جب قدرت کی کارفرمائیاں انسان کی خود بیں و خود پسند عقل کو اس کی نارسائی اور معذوری کی خبر دیتی ہیں اور معلوم ہو جاتا ہے کہ قوئی انسانی کی کرشمہ کاریوں کے لیئے ایک حد مقرر ہے۔ جہاں عالمِ اسباب ختم ہو جاتا ہے۔ اُس حد کے آگے جو کچھ ہے ایک رازِ سربستہ ہے۔ پھر کون بتلائے کہ وہ مقلب القلوب کمزوالنسانوں کے قوئی عمل کو یہ تفوق کیونکر عطا فرماتا ہے۔ جب ہم کمزور اور مجبور و معذور قوموں کے اندر بھی جہد حیات کے اِن مظاہروں کو دیکھتے ہیں اور کارسازئ فطرت الٰہی کے یہ نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ عقل کے سارے دعوے باطل ہو جاتے ہیں۔ اور اسباب و عقل کی الجھنوں سے گھبرا کر آخری فیصلہ یہی ہوتا ہے کہ ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مجھے وہ زمانہ یاد ہے کہ دہلی میں ہمدرد پریس قائم کیا جا رہا تھا۔ اور میں اخبار کے ابتدائی انتظامات میں مشغول تھا۔ غالباً ۱۹۱۲ء کا موسم سرما بھی شروع نہ ہوا تھا کہ **محمد علی** کلکتے کو چھوڑ کر اس مرکز عمل پر آ گئے جس کی خاک کا ہر ذرہ عظمت اسلامی کی یادگار رہے۔ وہ عظمتِ اسلامی جس کی بنیادوں کو زمانے کا دستِ دراز بھی ابتک نہ مٹا سکا۔ اور انشاءاللہ نہ کبھی مٹا سکے گا۔

مجھے وہ صبح خوب یاد ہے جب آخری دفعہ کلکتے سے رخصت ہو کر **محمد علی** دہلی پہنچے تھے۔ اس صبح کو میں اسٹیشن پر موجود تھا۔ آج جس محمد علی کو ہم دیکھ رہے ہیں یہ وہ محمد علی نہ تھے جو اس صبح کو مجھے دہلی کے اسٹیشن پر سر سے لیکر پانوں تک مغربی تہذیب اور اکسفورڈ کی تعلیم کا بہترین نمونہ نظر آئے ان میں ذہانت کی ایک غیر معمولی چمک تھی جو عام طور پر تعلیم یافتہ نوجوانوں میں نہیں پائی جاتی ہیں! ورنہ اس کے علاوہ لباس، وضع طرزِ معاشرت سب کچھ وہی تھا جو ہم بسا اوقات کچہریوں کے وکالت خانوں میں، قومی مجلسوں میں۔ کلکتے، بمبئی کے ہوٹلوں میں۔ یا کبھی کبھی دیوالیوں کی عدالت میں دیکھا کرتے ہیں۔!

میری زندگی میں وہ ایک یادگار صبح تھی، یعنی وہ پہلا دن تھا۔ جب بحیثیت استاد شاگرد میرے اور محمد علی صاحب کے مستقل تعلقات شروع ہوئے۔ آج جب میں ۱۹۱۲ء کے گلابی جاڑوں کے دس بجے صبح کو یاد کرتا ہوں تو اسلام کی روحانی طاقت کا

یہ معجزہ میری سمجھ میں آتا ہے کہ اسلام نے بلاکسی امتیاز ذاتی کے ہر انسان کے لیے روحانی عظمت کے تمام دروازے کھول دیے ہیں اور دنیا میں حُبِ اسلام اور تقویٰ کے سوا کوئی دوسرا معیارِ شرافت نہیں رہا۔

اُس دن جب محمدؐ علی دہلی آئے ہیں تو اسٹیشن پر میرے سوا نہ کوئی استقبال کرنیوالا تھا۔ نہ باہر جلوس کا کوئی سامان تھا، نہ اللہ اکبر کے نعرے تھے نہ چاندنی چوک اور فتحپوری اور جامع مسجد پر مشتاقانِ دیدار کا کوئی اجتماع تھا اور نہ سڑکوں پر "درشن" کرنے والے ہندو بھائی ان کی گاڑی تک پہونچنے کے لیئے بیتاب تھے۔ ایک گاڑی میں محمدؐ علی، راجہ غلام حسین مرحوم اور میں اس طرح اسٹیشن سے نکلے جیسے ہر روز ہزاروں اجنبی اور مسافر نکلا کرتے ہیں!

پھر مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب دلّی کے قصّابوں نے ایک عام ہڑتال کردی تھی اور محمدؐ علی نے اُن کے حقوق کی اس دردمندی کے ساتھ حمایت کی تھی کہ وہ اُن پر پروانہ وار قربان ہو رہے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ایک زمانہ گذر چکا تھا کہ دلّی کو کوئی حامی اسلام یا داعی حق نصیب نہ ہوا تھا اور ساتھ ہی ان کو ایک استبداد پسند حکومت نے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا تھا۔ وہ جس چیز سے محروم تھے، جس آب طربناک کے پیاسے تھے محمدؐ علی ان کے لیے لیکر آیا اور زیادہ عرصہ گذرا تھا کہ انھوں نے اس پہلے چراغ کو جو دلّی کی تاریکی میں روشن کیا گیا۔ اچھی طرح دیکھ لیا۔ اُن کے قلوب میں کوئی چیز تھی جس نے ان کو بتا دیا کہ یہ شخص جس کے قلم میں طاقت ہے جس کی آواز ملیند ہے، جس کے قدم استوار ہیں۔ اس اسلامی دارالسلطنت میں حقوقِ شہریت کا

مدعی اور عزت نفس کا حامی صادق ثابت ہوگا۔

جامع مسجد کے شامیانوں کا سوال پیدا ہوا تو پھر لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ شخص جس کا نام بحیثیت ایک قابل انگریزی لکھنے والے کے صرف تھوڑے سے تعلیم یافتہ اصحاب جانتے تھے ان کے دل میں جگہ لے رہا ہے۔ ادھر خود محمد علی کے قلب میں ان کا جوہر اصلی نشو و نما پا رہا تھا اور ان کی معاشرت بھی اسلامی رنگ اختیار کرتی جاتی تھی

حادثۂ کانپور نے نہ صرف محمد علی کی اخلاقی جرات اور قوت ایمانی کو اچھی طرح واضح کر دیا بلکہ دنیا کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ شخص جو ہمدرد کا مرتب کے ذریعے سے تمام مسائل قومی رہا گیا ہے۔ آیندہ رہنمایان ملت کی صف اول میں ایک ممتاز جگہ پانے والا ہے ساری قوم کا فطری احساس اور محمد علی کی شخصیت اور ان کی قوت جاذبہ ان دو عناصر نے ملکر اسلامی سیاسیات کا رنگ یکسر بدل دیا اور آخرکار وہ زمانہ آگیا کہ قومی مسائل محمد علی کی رہنمائی کے محتاج سمجھے جانے لگے۔ لیکن محمد علی نے یہی نہیں کیا۔ بلکہ اخلاق ، خلاص ، ایمان اور استقامت کا صحیح معیار لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اور مسلمانوں کی فطرت اسلامی خود تقاضا کرنے لگی کہ

کہاں ہیں آبلہ پایان دشت جانبازی
کہ خار راز ستم چشم انتظار ہے آج!

واقعات کانپور کے بعد ہی جنگ بلقان کی وہ انسانیت سوز آگ مشتعل ہوئی۔ جس نے گذشتہ ، سال میں یورپ کے تمام شیرازہ کو درہم و برہم کر ڈالا اور ہنوز کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تہذیب و تمدن مغربی کی یہ خونخواریاں کب ختم ہونگی۔ اور کیونکر ختم ہونگی محمد علی کی تحریک اور ڈاکٹر انصاری کی مردانہ وار تائید سے مسلمانان ہندوستان کا

ایک وفد ٹرکی گیا۔ محمد علی کا یہ وہ کارنامہ تھا جس نے ان کو قطعی طور پر مسلمانانِ ہندوستان کے دلوں کا مالک بنا دیا۔ اور ڈاکٹر انصاری کی مخلصانہ خدمت اسلام نے انہیں کو بھی قائدین ملت کی صفِ اوّل میں جگہ دیدی۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب ڈاکٹر انصاری کا وفد ٹرکی سے واپس آیا تھا۔ اُس دن مسلمانانِ دہلی نے جس جوش وخروش کے ساتھ محمد علی اور ڈاکٹر انصاری کا استقبال کیا تھا وہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ جس کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوسکتی۔ اس دن نے اہلِ نظر کو بتا دیا تھا کہ اگر توپیں اور تلواریں ملک فتح کرسکتی ہیں تو خدا کے بندے بے تیغ وتفنگ دلوں کے مستحکم قلعوں کو بھی تسخیر کرسکتے ہیں۔ جہاں دنیا کی حکومتیں دم نہیں مار سکتیں۔

جس ماں کی گود میں محمد علی نے پرورش پائی تھی۔ اسی گود میں۔ محمد علی سے پہلے شوکت علی دین و دنیا کی سعادت حاصل کرچکے ہیں جس نے آپ کو سرکاری ملازمت کے مکروہات سے متنفر کر کے آخر کار صراطِ مستقیم کی طرف کھینچ لیا اور ہنوز محمد علی کی قومی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا کہ شوکت علی کی دلفریب اور طاقتور شخصیت، اپنی تمام دلفریبی اور پوری طاقت کے ساتھ میدانِ عمل میں آگئی۔ پرانی مثل ہے کہ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اُس کا عملی ثبوت دیکھنا ہو تو شوکت علی اور محمد علی کے اُس اتحادِ عمل کو دیکھیے۔ جس نے آج زبانِ خلق پر اِن دونوں کے ناموں کو اس طرح ملا دیا ہے کہ گویا وہ ایک ہی نام ہے اور حقیقت یہ ہے کہ **علی برادران** کی قومی اور شخصی

زندگی کے جس پہلو کو دیکھئے معلوم یہ ہو گا کہ یہ دو اب دو نہیں ہیں۔ نہ اپنے لیئے نہ اُس قوم کے لیئے جس کے وہ محبوب ترین رہنما ہیں۔ دونوں کا طریقۂ کار، دونوں کا راستہ، دونوں کی منزل اور دونوں کا مرکزِ عمل ایک ہے۔ اور آج یہ دونوں بھائی اپنی قوم کے لیئے اتحادِ عمل کی بہترین مثال ہیں جو بہت سے اُن مدعیانِ حُریت کی رہنمائی کرے گی جو ایک لمبی زبان اور خالی دماغ لیکر قوم کی رہنمائی کا دعوے کرتے ہیں!

یوں تو علیگڈھ کی تعلیمی تحریک میں شوکت علی اپنی قوم کی بہت کچھ خدمت کر چکے تھے۔ لیکن "انجمن خدامِ کعبہ کی تحریک وہ اصلی کام تھا جس نے ظاہر کر دیا کہ نوکدار موچھوں والا **شوکت علی** (جس کی نورانی داڑھی پر آج مجاہد نفس کی روحانی کیفیات کا عکس نظر آ رہا ہے) جسد حیاتِ اسلامی کے صحیح مرکزِ عمل کا پتہ پا گیا۔ میں اس زمانے کو بھول نہیں سکتا (کیا زمانہ تھا!) جب ہمدرد کا مرڈیکے دفتر میں صبح اور شام تمام ممبرانِ اسٹاف اخبار کے متعلق "مشورہ" میں شریک ہوتے تھے، شوکت علی محمد علی، سید محفوظ علی، راجہ غلام حسین مرحوم، میں اور دو چار اور ہم سب زیرِ بحث مسائل پر گفتگو کرتے تھے اور محمد علی صاحب ایک ایک کو اس کے کام کے متعلق ہدایات دیتے تھے۔ ان کے دماغ کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ جب ایک چھوٹا سا نوٹ لکھنے کے لیے بحث کے خاص خاص پہلو بتانا شروع کرتے تھے تو بعض اوقات آدھے کالم کے نوٹ کے لیے اپنی معلومات دے دیا کرتے تھے۔ جو اگر سب حیطۂ تحریر میں لائی جاتی تو ہمدرد کے آٹھ دس کالم پُر ہو جاتے۔ پھر شوکت صاحب کی آواز جو بلا مبالغہ دفتر کے در و دیوار میں سما گئی تھی۔ ان کا صبح شام دفتر کے تمام کمروں میں آکر جھانکنا اور ہر ایک سے جلدی جلدی دو چار باتیں کر کے چلا جانا! کاش میرا قلم شوکت بھائی کے مخصوص طرزِ گفتگو کا خاکہ کھینچ سکتا! ہمدرد کے دفتر کی آب و ہوا بھی کچھ عجیب تھی، وہ صحبتیں اور

دل کی امنگوں کی وہ شورشیں، اقبال کی نقلیں اور شوکت بھائی کا ترنم، غلام حسین مرحوم کے ذوقِ
مذاق، معظم علی صاحب کی شیریں گفتاری کہ ہر لفظ جو دہانِ موزوں سے نکلتا تھا شکر، ملائی اور
مکھن کی مجموعی خصوصیات کے ساتھ گویا ایک برکت "فلک سیر" سے کم نہ ہوتا تھا! اس تمام ہجوم کا۔
اور انہماک عمل میں نہ جانے کیونکر تفریح و تفنن کے لیے اتنا وقت مل جاتا تھا۔ تاہم خوش وقتی کا
یہ عالم تھا کہ جس وقت نظر بندی کا حکم آیا ہے میں دفتر میں نہ تھا لیکن بلا لیا گیا اور جب محمد علی صاحب کے
کمرے کے پاس پہونچا تو میں نے ایک شورِ مبارکباد سنا اور یہ خیال ہوا کہ شاید کوئی بہت
اچھی خبر کہیں سے آئی۔ لیکن دیکھتا ہوں تو کمرے کے وسط میں میز پر احکام نظر بندی کھلے
رکھے ہیں اور ایک غلغلۂ تہنیت برپا ہے جس میں دونوں بھائیوں کی آواز جو ایک دوسرے کو
ہنس ہنس کر مبارکباد دے رہے تھے۔ سب سے زیادہ بلند ہے! یہ وہ روح پرور تاب تھی
تھی جس میں کم و بیش دو سال گذرے۔!

پھر جب وہ دن آیا کہ دلّی والوں کے، اور محض دلّی والوں کے کیوں کہوں، سارے
اسلامی ہندوستان کے یہ محبوب رہنما اُن سے جدا ہوں۔ اُس وقت بھی میں نے
مفارقت کے ابتدائی مظاہر دن کو دیکھا۔ وہ آخری جھوچکے یاد ہے۔ جب جامع مسجد کے
سیڑھیوں پر یہ دونوں اہلِ دہلی سے رخصت ہو رہے تھے۔ اور دل کی کیفیات سے
بے قابو ہو کر رونے والوں کو تلقینِ صبر و استقامت کر رہے تھے۔ مسجد شاہجہانی کی
سیڑھیوں پر یہ دو انسانی پیکر کے دو مینا رتھے۔ جن پر زمانے کی طوفان انگیزیاں بے اثر
تھیں، یوں تو ایک عالم و قوم کی منتظر نظروں نے پہلے ہی آپ کے جوہرِ اصلی کی تجلیات
دیکھ لی تھیں۔ لیکن آرا دیکھا کا یہ آخری دن درحقیقت پہلا دن تھا۔ جب وہ دنیا کے سامنے

مہر واستقامت کی ایک زندہ مثال بنکر آئے اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر زبانِ حال سے اپنے اہلِ قوم کو بتا دیا کہ دل کے اندر ایمان کا جو چراغ روشن ہوتا ہے۔ اُس کو کفرو استبداد کی آندھیاں کبھی نہیں بجھا سکتیں۔

نورِ حق وہ شمع نورہی کہ بجھ سکتی نہیں
ہو خدا حافظ چراغِ رہگذارِ باد کا! (محمد علی)

کم و بیش پانچ سال تک نظر بندی اور قید کے جو مصائب اُنھوں نے برداشت کیے آج ان ایام مسرت میں۔ جبکہ ان کی رہائی ہمارے لیے عہدِ جدید کی ایک نوید کامرانی ہے، میں اُن مصائب کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ شوکت علی و محمد علی سے پہلے خدا کے مقبول بندے ہر قرن اور ہر صدی میں اپنے خدا کے لیے، اپنے ایمان کے لیے، اپنے مذہب کے لیے۔ اسی طرح قربانیاں کرتے رہے ہیں اور فطرت الٰہی کا لازوال قانون ہر عہد میں مصائب و آلام کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسے لوگ پیدا کرتا رہا ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور جبر و استبداد کے دیوتا کی قربان گاہ پر کھڑے ہو کر مردانہ وار حقوقِ بشریت کا اعلان کرتے ہیں:

گذشتہ رجنوری کو شوکت علی و محمد علی پانچ سال کے بعد پھر شاہانِ مغلیہ کے دارالسلطنت میں تشریف لائے۔ جس طرح اُن کا خیر مقدم کیا گیا، جس طرح اہل دہلی نے اپنے وفورِ شوق کی بیتابی کا مظاہرہ کیا، محبت و عقیدت کی نذریں پیش کی گئیں، اس کیفیت کا اظہار کرنے سے الفاظ قاصر اور قلم معذور ہے۔ دلّی کی سڑکوں پر کتنے ہی جلوس گذر گئے

چاندنی چوک میں خیر مقدم و تہنیت کے کتنے ہی ہنگامے برپا ہو چکے۔ جامع مسجد کے بلند مینار نے کتنے ہی جلیل القدر انسانوں کی سواری گذرتے دیکھی۔ مسجد فتح پوری کی محراب و منبر نے کتنے ہی اولی العزم انسانوں کی آوازیں سنی، لیکن اس دن کے بعد سے جب عروسِ دہلی کا آخری دولہا رنگون سدھارا تھا۔ آج تک حقیقی جوش، (وہ جوش جو قوموں کی ترقی کا ضامن ہے، وہ جوش جو دنیا کی تاریخ تمدن میں ہمیشہ عظیم الشان انقلابات کا پیش خیمہ رہا ہے) کا وہ مظاہرہ آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا جو ۹ جنوری کو دہلی کی سڑکوں پر اہلِ بصیرت کے لیے مسلمانوں کی قومی زندگی کے مستقبل قریب کا ایک پیام امید تھا۔ جس نے بہت سے حقائق حیات ملی کے منکرین کو دم بخود کر دیا، جامع مسجد کے قرب و جوار میں بہت سے انگریز "تماشہ" دیکھنے کو بیٹھے جلوس کے منتظر بیٹھے ہوئے تھے ۔ یہ تو خدا کو معلوم ہے کہ متحدہ قومیت کے اس عظیم الشان مظاہرے نے ان کے دل و دماغ میں کس قسم کے خیالات پیدا کیے ہونگے ۔ مگر ان کی موجودگی میرے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا کر رہی تھی ۔ میں سوچتا تھا کہ اے کاش یہ لوگ جن کو خدا نے ہمارا حاکم بنایا ہے ۔ اہلِ ہند کی اُن حسیات قومی کو سمجھنے کی کوشش کریں ۔ جو آج دہلی کی سڑکوں پر آئینے کی طرح اُن کے سامنے ہیں ! اور ان کو سمجھ کر فطرتِ انسانی کے اس ناقابلِ انکار حقیقت کو بھی پہچان لیں کہ جب ایک دفعہ یہ دریا بہنے لگتا ہے ۔ تو پھر کسی کے روکے نہیں رُکتا ۔ اور خوش نصیب ہے وہ ملاح جو اپنی کشتی کو دھارے کے ساتھ ساتھ لیجائے اور حیف ہے اُس پیراک پر جو دھارے کے خلاف تیرنے کی کوشش کرے !

یہ چند پریشان خیالات ہیں جو دلی کے ہنگامۂ خیر مقدم کو دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوئے تھے ۔ شوکت علی ۔ اور محمد علی کی قومی زندگی کے کارناموں سے قطع نظر کرکے میں تو

صرف ایک چیز کو دیکھتا ہوں، کون ہے جو شوکت علی کے عزم صادق یا محمد علی کی اعلیٰ دماغی قابلیت و ذہانت سے انکار کر سکے، کون ہے جو ان نفوس محترم کی عظیم الشان قومی خدمات کو نظر انداز کر سکے، کون ہے جو ایک محترم ماں کے ان دو فرزندان رشید کی ہستی اور کسی چیز سے مرعوب نہ ہونے والی حُبِ اسلام کی دل سے قدر نہ کرے، لیکن میں ان سب چیزوں سے قطع نظر کر کے صرف ایک چیز کو سب سے آگے رکھتا ہوں کہ وہی سب سے پہلے ہمارے لیے شمع ہدایت ہے! بدنصیب ہندوستان کے بدنصیب تر مسلمان محتاج تھے کہ ان کے سامنے جہادِ نفس اور عزم و استقلال کے کوئی ایسی زندہ مثال پیش کی جائے جو ان کے اندر انفرادی اور اجتماعی سیرت کی اس بجھی ہوئی آگ کو پھر روشن کر دے۔ جو قرونِ ماضی میں امتِ مرحومہ کا تمغۂ امتیاز تھی! ان کے سامنے مذہب کو اس طرح پیش کرے کہ گویا دنیا میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز ہے مسلمان اسی کے لیے زندہ رہتا ہے اور اسی کے لیے مرتا ہے۔ میدانِ عمل کا یہ مطمح نظر تھا جس کو ہندوستان کے مسلمان قطعاً بھول گئے تھے، علما، حاملانِ شریعت حقہ۔ مدعیانِ جانشینیِ پیغمبر (روحی فداہٗ) گوشۂ عزلت میں ناشاد و نامراد بیٹھے ہوئے تھے اور بہ استثنائے معدودے چند ان کے نزدیک ملتِ مرحومہ کی خدمت کرنے کا معیار یہ تھا کہ مسلمانوں کو نماز روزہ وضو اور غسل کے مسائل سکھا دیے جائیں، یا اوراد و وظائف کی تعلیم دے دی جائے، یا ان کو داڑھی منڈانے اور مونچھیں بڑھانے کی سزا سے مطلع کر دیا جائے۔ بس! درس مذہبی کے فرنگی محل اور دیوبند جیسے مرکز قبرستان تھے کہ ان میں سیکڑوں اجسام بے روح صبح سے شام تک دنیوی زندگی کی بھاری گاڑی کھینچتے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ جہدِ حیات اور عزتِ نفس بھی کوئی چیز ہے۔ علما کا یہ حال تھا، اور غیر علما، اصحابِ اقتدار۔ اربابِ

دولت وجاہ، یہ سب اپنی نفس پرستیوں میں مبتلا تھے (اور ہیں!)! پھر چھوٹے صاحب اور بڑے صاحب کا آستانہ بے نیاز تھا اور ان کی جبین نیاز، تمدنی اور اقتصادی مشکلات نے عامۃ الناس کے لیے زندگی وبالِ جان کر دی اور کوئی نہ تھا جو ان کو صراطِ مستقیم کا پتہ بتا۔۔ یہ حالت تھی جب ان دو بھائیوں نے اپنی قوم کو عزتِ نفس اور مطالبۂ حقوقِ شریعت کی پہلی دعوت دی۔ اور ساتھ ہی قوم کے سامنے اپنی زندہ مثال پیش کر کے بتا دیا کہ مذہب اور انسانیت کے لیے کس طرح قربانیاں کرنی چاہئیں۔ اور اعلائے کلمۂ حق کا فرض کیونکر ادا کرنا چاہیئے۔ شوکت علی اور محمد علی، جس دن نظر بند ہوئے۔ اُس دن بھی اُنھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے خدا اور اپنے مذہب، اور اپنے حقوقِ بشریت کے لیے جان تک دے دیں گے۔ لیکن صراطِ مستقیم سے قدم نہ ہٹائینگے اور پھر جب ۹ جنوری کو وہ رہا ہو کر۔ دلّی میں آئے تو پھر ایک دفعہ اُنھوں نے اپنے عزائمِ عالیہ کا صاف الفاظ میں اعلان کر دیا۔ جب سپاسنامہ پیش ہو چکا تو محمد علی صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں صاف کہہ دیا کہ وہ فساد اور جھگڑے کے لیے نہیں آئے ہیں نہ اُن کے دلوں میں اپنے دشمنوں اور بدخواہوں کے متعلق بغض و عناد ہے، وہ صلح اور آشتی کے ساتھ اپنی قوم اپنے مذہب، اور ہندوستان کے ہندو و مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں لیکن اُنھوں نے فرمایا کہ مذہب کے متعلق خلافِ احکامِ شریعت وہ کسی سے کوئی "سمجھوتہ" نہیں کر سکتے! یہی ان کی عملی زندگی کا وہ اصولِ کار ہے جو خلوت اور جلوت میں ہمیشہ ان کا رہنما رہا ہے۔ اور انشاء اللہ رہیگا! ۱۹۱۹ء میں جبکہ اسیرانِ چھنڈواڑہ کی رہائی کے مسئلہ پر گورنمنٹ غور کر رہی تھی۔ اور عام طور پر دلوں میں یہ قوی امید پیدا ہو گئی تھی کہ اب وہ جلد آزاد ہو جائینگے۔ محمد علی صاحب نے صرف دو مصرعوں میں سب کچھ کہہ دیا تھا یعنی ؎

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی ؎ پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے!

(جناب) قاضی عبدالغفار (صاحب)

بُلبلانِ اسیر کی رہائی

گر شکرِ عشق - گاہ شکایت شنیدہ ام   ایں قصہ را بہ چند روایت شنیدہ ام

(۱)

چھوٹا بچہ:۔ اوہو ہو۔ بڑے زور زور کی برات ہے! اور چچا میاں کیا یہ سب براتی ہیں؟

نوجوان چچا:۔ ہاں سب براتی ہیں۔ کیوں۔ ہم نے نہ کہا تھا کہ بڑے زور کی برات دکھائیں گے؟

بچہ:۔ کہا تو تھا۔ اور آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ دولہا بھی دکھائیں گے۔

چچا:۔ لو دیکھو۔ وہ آگئے۔ یہ دونوں جن کے گلے میں گوٹے اور پھولوں کے سہرے پڑے ہیں اور جو دونوں ہاتھوں سے سب کو سلام کرتے جاتے ہیں۔ یہ دونوں اس برات کے دولہے ہیں۔

بچہ:۔ کیا دو براتیں ہیں۔ جو دو دولہے جا رہے ہیں؟

چچا:۔ نہیں برات تو ایک ہی ہے

بچہ:۔ واہ یہ خوب بات ہے۔ برات ایک اور دولہے دو! اور ان کی دولہن کہاں؟

چچا:۔ دولہن کیا سب کے سامنے طباق سا منہ کھولے سٹپر سٹپر کرتی نکلتی؟ وہ پردے میں ہوگی۔

بچہ:۔ چچا اس کا نام کیا ہے؟

چچا:۔ دولہن کا نام؟ (دھیمی آواز سے) بے ڈھب سوال ہے! اس معصوم کو نام کیا بتاؤں! (اونچی آواز سے) لو سنو۔ دولہن کا نام ہے "قوم"

بچہ:- واہ نئی طرح کا نام ہے! باجی جان اور امی جان اور چھوٹی بہنو کے نام تو ایسے نہیں ہیں -

بچے کا باپ:- (جو قریب کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا) بیٹے! برات ورات کچھ نہیں ہے یہ دونوں جو ہار پھول پہنے موٹر میں جا رہے ہیں۔ بڑے پکے مسلمان اور سچے ہندوستانی ہیں جنھیں دیکھنے اور سلام کرنے شہر کے سب مسلمان ہندو آئے ہیں -

بچہ:- ابا جان یہ کیا کام کرتے ہیں ؟

باپ　یہ اس ملک کے ہندو مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں -

بچہ　تو کیا جسے ضرورت ہو سودا سُلف لا دیتے ہیں ؟ -

باپ　ہماری محبت تو انھیں ایسی ہی ہے کہ اس کے لیے بھی تیار رہیں لیکن اصل میں یہ اَور بڑے بڑے بھاری کام کرتے ہیں -

بچہ　تو کیا یہ بوجھ اُٹھاتے ہیں ؟

باپ　(آنکھوں میں آنسو آگئے) حقیقت میں بڑے بھاری بھاری بوجھ اُٹھاتے ہیں!

بچہ　اچھا چھا! میں جان گیا - یہ حمال ہیں جبھی ایسے موٹے تازے ہیں -

باپ　(آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ)- نہیں بیٹے - یہ ہمارے سردار ہیں - ہمارے ذمے جو مشکل اور ضروری کام ہیں جنھیں ہم کاہلی اور بزدلی سے نہیں کرتے یا نالائقی سے نہیں کر سکتے - اُنھیں یہ کرتے ہیں -

بچہ در تو یہ آپ سے اور چچا جان سے زیادہ لائق ہیں ؟

باپ ہم اور تمہارے چچا جان تو ان کے جوتوں کے تسمے کھولنے کی بھی لیاقت نہیں رکھتے۔ آج اس ملک میں کوئی بھی مسلمان ان کی قابلیت کو نہیں پہونچتا۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو کتابوں میں ان کے نام اور ان کے کام پڑھ پڑھ کر خوش ہوا کرو گے کہ ہم نے بھی انہیں دیکھا تھا اور جب تم بڈھے ہو گے۔ انشاء اللہ۔ تو اس زمانے کے جوان ان کے نام سے تمہاری عزت کریں گے کہ تمہاری آنکھیں ان کی زیارت کر چکی ہیں

بچہ ابا جان تو ان کے نام کیا ہیں تو میں یاد کر لوں۔

باپ ان کے نام ہیں۔ شوکت علی۔ محمد علی

بچہ شوکت علی محمد علی۔ شوکت علی محمد علی۔ شوکت علی محمد علی۔ اب اس میں یاد ہو گئے جب آپ چاہیں۔ پوچھ لیں۔

---

(۲)

ضعیفہ: بیٹیو! میری نگاہ موٹی ہے۔ ذرا دیکھنا وہ آگئے ؟

ایک خاتون ابھی نہیں آئے۔ مگر لوگوں کی بھیڑ سے معلوم ہوتا ہے اب آیا ہی چاہتے ہیں

دوسری خاتون اے لو۔ بجن آں وہ آگئے! یہی ہیں نا ؟

بجن (دیکھ کر آہستہ سے) السلام علیکم۔ اللہ عمر میں ترقی کرے۔ دین ہی سے بڑھائے۔ ہاں بیٹیو یہی ہیں۔ میں تو ابھی رامپور میں دیکھ چکی ہوں یہ ۔۔۔ بجو کے ہتے طرف بیٹھے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک خاتون: جن کی داڑھی میں سفید بال ہیں؟ ۔

تجن ہاں ہاں وُہی وُہی ۔ یہ شوکت علی ہیں اور اِن کی برابر اِن کے چھوٹے بھائی محمّد علی ۔ شوکت علی وہ شخص ہیں جنھیں ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں سب سے پہلے کعبہ شریف کی خدمت ۔ اور غیروں سے اُس کی حفاظت کا خیال ہوا ۔ اور اُنھوں نے کعبے کی انجمن بنائی ۔ آج سب نے دیکھ لیا کہ یہ کام کیسا ضروری تھا ۔ اور سارے مسلمانوں کو اِس میں شریک ہونا چاہیئے تھا ۔ بیٹیو! میں نے تو اُنھیں دنوں رام پور رہا کر انجمن میں نام لکھا لیا تھا ۔ دیکھ لو اِس وقت بھی میرے کُرتے کے گریبان پر نشان لگا ہوا ہے ۔ محمّد علی نے اخبار نکالا اور اِس کے ذریعے مُسلمانوں کی بڑی خدمت کی ۔ چھ سات برس ہوئے جب سُلطان روم سے اور عیسائیوں سے لڑائی ہوئی تھی محمّد علی نے سارے ہندوستان سے چندہ جمع کیا ۔ اور ڈاکٹر انصاری کی ڈاکٹری جماعت کو مُسلمان زخمیوں کے مرہم پٹی کرنے کے لیئے روم بھیجا ۔ اب کی لڑائی چھڑنے کے بعد سے یہ دونوں نظر بند کیے گئے اِن کے کارخانے درہم برہم ہو گئے اور بڑے بڑے بیمپری وقت پڑے ۔ مگر آفرین ہے اِن بندوں کی ہمّت پر کہ ایمان میں ذرا فرق نہ آیا ۔ بڑے سچّے مسلمان ہیں ۔

ایک خاتون بہن ہمارے تمہارے دینی بھائی اور باپ ہیں ۔ تم نے دیکھا اِن کے چہروں پر نور کیسا تھا!

دوسری:۔ نور! بہن ایک وقت کی نماز قضا نہ ہو۔ صبح کا قرآن ناغہ نہ ہو
جمعرات کا روزہ ترک نہ ہو۔ دل میں ہر وقت خدا کا خوف۔ رسولؐ کا
ادب۔ شریعت کا پاس رہے۔ پھر اُن کے چہروں پر نور نہ ہو تو کیا
اِن موؤں مُرداروں۔ نام کے مُسلمانوں کے چہروں پر ہو جو.....
اب کیا کہوں۔

تیسری:۔ قدم لینے کے لائق ہے وہ نیک بی بی جس نے اِنھیں دودھ پلایا۔
اور زیارت کے قابل ہیں وہ شریف لڑکیاں جنھیں اِن کی بیویاں
بننے کی عزّت ملی!۔

چوتھی:۔ سُنا ہے کہ بڑے بھائی صاحب کی بی بی مر چکی ہیں۔

پانچویں:۔ ہاں مگر اللہ رکھے اولاد ہے۔

جمن:۔ میں تو اِن کی والدہ سے مِل چکی ہوں۔ وہ بھی حج کر آئی ہیں۔ کیا شیر دل
بیوی ہے! پچھلے دنوں جب سرکار نے شرطیں لگا کر انھیں آزاد کرنا
چاہا تو ماں نے بیٹوں سے کُھلے خزانے کہدیا کہ اگر دین اور ایمان
کے رستے سے تِل بھر بھی قدم ہٹایا تو یاد رکھنا نہ صورت دیکھوں گی نہ
دودھ بخشوں گی۔

بہت سی خاتونیں (آبدیدہ ہو کر) سُبحان اللہ! کیا ایمان والی بیوی ہے! اللہ اُسے
دین دنیا میں سُرخ رُو رکھے!!! الٰہی اُس کے اور اُس کے بچوں کے
سروں پر حضرت بیوی رضؓ کے آنچل کا سایہ!!!

جمن بڑے بھائی کی بیوی کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ چھوٹے بھائی کی

بیوی نے میاں کی نظربندی کے زمانے میں جس ہمت اور حوصلے سے
کام لیا تم نے سُنا ہوگا۔ میاں کے سامنے کے نوکر چاکر لگے بندھے
سب بدستور رکھے۔ میاں کے کام دھندے اور حساب کتاب کی
دیکھ بھال رکھی۔ جس جس محتاج اور مستحق کو میاں جتنا اور جس جس وقت
دیتے تھے برابر دیا۔ جس پر سُنا کہ مصیبت آئی آفت پڑی۔ منی آڈر
بھیج بھیج کر امداد کی۔

ایک دولتمند خاتون: سچ بھی تو ایسی خوش نصیب بھی ہے جو میاں ایسا ملا!

دوسری خاتون: نصیب تو بہن تمہارا بھی چاند سا ہے۔ تمہارے میاں کیا تو بڑے
رئیس ہیں!

دولت مند: ہر بیچ کوئی اُن جیسا ہو۔ دن رات ناپاک پانی پیئے بھوت بنے پڑے
رہتے ہیں۔ اور جب ہوش آتا ہے تو خطاب حاصل کرنے کی دُھن بندھتی ہے
نہ دین سے غرض نہ ایمان سے مطلب۔ جس وقت سے سُنا کہ یہ بھائی
آرہے ہیں۔ ان کی زیارت کیسی اپنا منہ چھپانے کی فکر پڑ گئی یہاں تک
کہ رات سوتے چُپکے چُپ چُپاتے کلکتہ بھاگ ہی گئے۔

---

(۳)

سر اسمٰعیل جی ولی بھائی: کہیئے دستور صاحب۔ علی برادرس سے بھی ملے؟

فیروز جی مرزبان دستور: امرت سر میں بہت تھوڑی دیر ملاقات ہوئی
استقبالوں سے انھیں ذرا فرصت ملے تو ارادہ ہے کہ رام پور
جا کر لمبی چوڑی ملاقات کروں۔ گلہاٹے! تم تو مل لیے؟

مسٹر لکشمن راؤ لگھاٹے :- مل لیا! بمبئی میں تو ایک ہفتہ لگاتار اُن کی خدمت میں رہا۔ رام پور سے دہلی کے جلوس تک برابر اُنھیں کے ساتھ تھا۔ مجھے تو اُن سے ایسی دلی محبت ہوگئی ہے کہ اگر ہم سگے بھائی ہوتے تو شاید ہی اس سے زیادہ ہوتی۔ پریکٹس کی وجہ سے اُن کی پاس زیادہ رہ کر ملکی خدمت نہیں کر سکتا۔ پھر بھی آپ لوگ تعجب نہ کریں اگر کسی دن جی پر آجائے اور میں سب کام دھندا چھوڑ کر اُن کے ساتھ ہو لوں۔

سیٹھ مول جی کلیان جی جیٹھا :- بھئی جس روز تم نے یہ ارادہ کیا اُسی دن میں بھی بزنس کا چارج رتن کو سونپ کر تمہارے اور اُن کے ساتھ ہو لونگا۔ دھن بھاگ جو آریہ ورت کے ایسے سپوتوں کے ساتھ نیشنل کام کرنے کا موقع ملے!

دیوان ٹیوں مل واٹومل منگھرانی :- ملکی اور قومی خدمتوں اور استقلال اور ... کے علاوہ اخلاقی خوبیاں ان میں اس قدر رچی ہیں اور ایک ایسا جادو ... ان کی شخصیت میں ہے کہ آدمی بے اختیار اُن کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ میں کئی دفعہ دونوں بھائیوں سے ملا ہوں۔ ہر دفعہ یہی جی چاہا ہے کہ ان سے اور بہت زیادہ ملئے۔

میاں چندو ڈے شاہ :- آپ صاحبوں کی واقفیت تو غالباً اُن کی پبلک لائف شروع ہونے کے بعد سے ہوگی۔ مجھے محمد علی سے اُس زمانے سے نیاز حاصل ہے جب وہ بروده میں ملازم تھے اور ریاستی کام سے ہر مہینے بمبئی آیا کرتے تھے۔ ٹائمس آف انڈیا اور بمبئی گزٹ میں اُن کے مضامین اور اُن کی کتاب "موجودہ بے چینی پر خیالات" پڑھ کر مجھے اُن سے ملنے کا اشتیاق ہوا

اسی عرصے میں ڈاکٹر اقبال آئے۔ اُن کی وساطت سے ملاقات ہوئی۔

سردار اُس دن تم بھی تو تھے۔؟

سردار لہنا سنگھ:۔ وہ ملاقات اور اُس کی لذّت ابھی تک یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گی محمد علی کی زبردست شخصیت اُس کے علم کی وسعت اور جوش کی کثرت کا اُسی دن میرے دل پر گہرا نقش ہوگیا تھا۔ اُس کے بعد تو علی جان کے یہاں اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ کیوں علی جان یاد ہے نہ؟

سید علی جان۔ ارے بھائی سب یاد ہے! ایک روزانہ انگریزی اخبار نکالنے کا منصوبہ تو اُنھوں نے پیسی کا کا بلڈنگ ہی میں بیٹھ کر سوچا تھا جو عملی جامہ پہن کر کامریڈ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش ہوا۔ ہمدرد کے ٹائپ کے لیے مصر و بیروت کی کتابوں اور اخباروں کی دیکھ بھال لو مریم لین کے اسٹیشن کے پاس سمندر کے کنارے ہی پر بیٹھ کر ہوا کرتی تھی۔ جہاں محمد علی گنڈیریاں کھاتے تھے اور میں پان۔

پنڈت اقبال بہادر رائے زادہ۔ محمد علی سے میری پہلی ملاقات بانکی پور میں ہوئی۔ نام تو بہت پہلے سے سُنا تھا۔ مگر ملاقات سے قبل یہ خیال تھا کہ لٹریری آدمی ہیں خاموش اور خشک مزاج ہوں گے۔ مگر پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہوگیا کہ نہایت خوش گپ اور شگفتہ مزاج ہیں اس کے بعد مسٹر مظہر الحق کے یہاں شوکت علی سے بھی ملاقات ہوئی۔ بے تکلفی کے بعد دونوں کے دل و دماغ اور اعلیٰ قابلیت کے جوہر کھلے

اِن کی قابلیت اور جوش اور اسلامی مسائل میں دلچسپی و سرگرمی دیکھ دیکھ کر طبیعت بہت للچاتی تھی کہ مادر ہند کے ایسے قابل اور پُر جوش اور سرگرم فرزندوں کو گاندھی۔ تلک۔ نہرو اور مالوی کے دوش بدوش کانگریس پلیٹ فارم پر موجود ہونا چاہیئے۔ گذشتہ سات آٹھ برس سے یہ خیال برابر میرے دماغ میں چکر کھاتا تھا جو اُس وقت محض خیالِ خام معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس دفعہ جب شوکت علی محمد علی نے امرتسر کانگریس میں آکر ڈیلی گیٹوں کی فہرست میں نام لکھایا اور گاندھی۔ تلک۔ نہرو اور مالوی کے دوش بدوش کانگریس پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تقریریں کیں تو میں نے خدا کا شکر کیا اور پنڈال کے دروازے پر شوکت علی محمد علی کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ آج کے مقدس دن نے میری ہشت سالہ خواب کی تعبیر حرفاً حرفاً پوری کر دی ؎

بہ زنار برہماں لبستند عُنی رامیاں۔ آرے

میانے ایں چنیں شایستہ بے زنّار کے ماند

بابو رجنی کانت چٹرجی: صاحبو! میں ایک **پروپوزل** پیش کرتا ہوں امید کہ آپ منظور کریں گے۔ جب ہماری انجمن کے ہر ممبر سے علی برادرس کی ملاقات بلکہ گہری دوستی ہے اور ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو دوستی کے علاوہ **اُن کی نیشنل سروس** کا اعتراف اور اُن کی سچائی اور **سیلف سکریفائیس** کی قدر نہ کرتا ہو تو کیوں نہ ہم اس انجمن کی طرف سے اُنھیں **اِن وائٹ** کریں اور درخواست کریں کہ وہ **انجمن فرزندانِ ہند** میں تشریف لاکر ہمارا اڈریس قبول فرمائیں؟

سر جگدوٹی ایرن ناد: مسٹر چیٹرجی! میں سب ممبروں کے اتفاق رائے سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے یہ تجویز پیش کرکے ہمیں اپنی ایک نہایت ضروری ڈیوٹی کی طرف توجہ دلائی۔ علی برادرس کی تشریف آوری یقیناً ہماری انجمن کے لیے باعثِ فخر ہے اور ہم نہایت خوشی سے مستعد ہیں کہ مادرِ ہند کے ان سپوتوں اور ملک و قوم کے اِن سچّے خادموں کا اُس سے زیادہ جوش و مسرت سے استقبال کریں جتنا کہ اب تک کسی شہر میں کیا گیا ہو۔

ممبر صاحبان! کیا آپ مجھے اختیار دیتے ہیں کہ میں بہ حیثیت صدر انجمن علی برادرس کو تار دوں کہ انجمن فرزندانِ ہند جس میں اس وسیع برّاعظم کے ہر خطے اور ہر مذہب و ملّت کے نمایندے شریک ہیں آپ سے استدعا کرتی ہے کہ جس تاریخ آپ کو آسانی ہو تشریف لاکر اور ایڈریس قبول فرماکر ممبرانِ انجمن کی عزت افزائی کریں۔

سب ممبر: (یک زبان ہوکر) بے شک۔ بے شک۔

---

(۴)

نواب دولت یار خاں: ارے ماں مرزا صاحب! یہہ کیا ہنگامہ ہے؟

مرزا صاحب: حضور۔ شوکت علی۔ محمد علی چھوٹ کر آ گئے۔

نواب: بھئی۔ یہہ شوکت علی محمد علی کون صاحب ہیں اور چھوٹ کر کہاں سے آ گئے؟

مرزا صاحب: اصطبل سے ملا ہوا جو مکان ہے۔ اُس میں ایک ماسٹر صاحب

آکر رہے ہیں۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ مسلمانوں کے سردار
اور بڑے سچّے دین دار ہیں۔ سرکار نے کسی شُبہ پر نظر بند
کر دیا تھا۔ اب پانچ برس بعد رہا ہوئے ہیں۔

مُنّے آغا: پیر و مرشد، ہمارے مرزا صاحب تو ہمیشہ بے پر کی اڑاتے ہیں۔ اب اگر یہی بات ہے تو
میں پوچھتا ہوں سرکار نے انہیں شُبہ اور بدچلنی کی بنا پر قید کر دیا تو وہ مسلمانوں کے سردار
اور پکّے دیندار کیسے رہے اور جب سرکار نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا تو
آج رعایا میں کس کی مجال اور کس کا جگر ہے جو ان کی رہائی پر
اتنی خوشی کر سکے۔ حضور اصل حال غلام سے سُنیئے۔
خدا بخش جو خود جنگی لاٹ رابرٹ صاحب کا خانساماں رہ چکا ہے
مجھ سے کہتا تھا کہ یہ دونوں سرکار کی اُس فوج کے سردار
ہیں جو لڑائی جیت کر آئی ہے اور اسی لیے اُن کی اس قدر
آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ سُنا ہے ڈھاکے بنگالے کے
رہنے والے اور گھر کے بڑے تعلقدار ہیں۔

طُرّہ باز خاں: حضور، یہ مُنّے آغا سچ کہتے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ میں نے
سُنا ہے دونوں میں سے ایک صاحب ڈھاکے بنگالے
کے اور دوسرے دکھن حیدرآباد کے رہنے والے ہیں۔

مرزا صاحب: حضور! ہمارے مُنّے آغا تو ہمیشہ گزٹ کی خبریں لایا ہی
کرتے تھے تعجب ہے کہ خان صاحب بھی اُن کے چھینٹوں
میں آکر اُن کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اصل بات وہی ہے جو

میں نے عرض کی۔ ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا جس میں
سے پڑھ کر وہ فرماتے تھے کہ دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ اصل وطن
رام پور رہے اور سید احمد صاحب کے مدرسے کے پڑھے
ہوئے ہیں۔ بڑے بھائی کسی گورنمنٹی اعلیٰ عہدے پر تھے
اور انگریزوں کی برابر تنخواہ پاتے تھے۔ چھوٹے بھائی ولایت
کا پاس کر آئے ہیں۔ انھوں نے بھی شروع شروع میں کسی
ریاست میں نوکری کر لی تھی اور بعد میں دہلی سے ایک بڑا
زوردار اخبار نکالا۔ پہلے دونوں بھائی وضع قطع۔ تراش
خراش۔ نشست برخاست میں پورے "صاحب لوگ"
تھے لیکن دل میں اسلام کی محبت کا ذرّہ اس زمانے میں
بھی چمکتا تھا۔ یہی ذرہ بڑھ کر آفتاب ہوگیا۔ اب دونوں بھائی
نہایت پکّے دین دار اور خدا اور رسول کی محبت میں سرشار
ہیں۔ لڑائی شروع ہوتے پر سرکار نے خدا جانے کس شبہ پر
نظر بند کر دیا تھا۔ اب جاکر کہیں چھوڑا ہے۔

نواب:۔ بھئی اگر یہ سچ ہے تو ہماری یہ بات بھی یاد رکھو کہ جو لوگ
ان سے ملنے ملانے آتے اور ان کی رہائی پر اس قدر
خوشی مناتے ہیں اُن سے ~~سرکار دولت مدار بہادر دام اقبالہٗ~~
خوش تو ہو نہیں سکتی۔

منّے آکا:۔ اے سبحان اللہ! کیا دور کی بات فرمائی ہے حضور نے!!

ماشاءاللہ کیا نکتہ رس دماغ پایا ہے ـ !!!

سنیئے مرزا صاحب یہ بڑی گہری اور پتے کی بات ہے ! اگر سرکار بہادر انھیں قید فرما چکی ہے تو وہ رعایا کی اس بے جا خوشی اور بے موقع اچھل کود سے کیسے خوش ہو سکتی ہے ـ

مرزا صاحب : حضور گستاخی نہ سمجھی جائے تو عرض کروں ؟

نواب : کہیئے کہیئے شوق سے بلا تکلف کہیئے

مرزا صاحب : یہ گورنمنٹ کی توہین ہے کہ ایسی تنگ دلی اور چھچھورپن کا خیال اس کی طرف منسوب کیا جائے ـ مسلمان اور ان کے ساتھ ان کے ہندو بھائیوں نے اس پانچ برس میں برابر ان کی رہائی کے لیئے لگاتار کوششیں کیں ـ ملک کے ہر گوشے میں جلسے کیئے ـ تار دیئے ـ محضر بھیجے اور کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ ہمارے خیال میں یہ بے گناہ ہیں اور ہمیں ان کی گرفتاری کا سخت صدمہ ہے ـ اگر گورنمنٹ ہماری خوشی چاہتی ہے تو یا تو انھیں فوراً آزاد کر دے یا ان پر مقدمہ چلائے اور بھری کچہری میں صاف الزام اور بیّن قصور ان کے سر ثابت کر دے جب تک یہ نہ ہوگا ہمیں چین اور قرار نہ آئے گا ـ اب جبکہ گورنمنٹ نے انھیں آزاد کیا ہے تو پہلے یہ اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے کہ ہمارے اس فعل سے ہماری ساری رعایا نہال اور باغ باغ ہو جائے گی اور اس کی پانچ سال کی مراد برآئے گی ـ ایسی

حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کام سرکار نے محض اپنی
رعایا کو خوش کرنے ہی کی غرض سے کیا ہو اس پر رعایا کے
خوش ہونے سے ناخوشی کے کیا معنی۔ ماسٹر صاحب کہتے تھے
کہ امرتسر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے جلسوں میں جب یہہ
خبر پہنچی کہ شوکت علی محمد علی آزاد ہو گئے تو بلا مبالغہ لاکھوں
آدمیوں نے جن میں ہر طبقے اور درجے کے ہندو مسلمان
تھے خوشی کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پھر جب یہہ
دونوں بھائی امرتسر گئے تو راستے کے ہر اسٹیشن پر اور
خود امرتسر میں اور اس کے بعد دہلی میں اس زور کا استقبال
ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہیں کے راجے مہاراجے نواب بادشاہ آئے
ہیں۔ ماسٹر صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ اخباروں میں چھپ گیا ہے
کہ ان دونوں بھائیوں نے ہندوستان کے معزز ہندو
مسلمانوں کے ساتھ حضور والسرائے بہادر کی خدمت میں حاضر
ہو کر ایک محضر پیش کیا۔ اور حضور والسرائے بہادر نے ان سے
ملاقات فرمائی اور ہاتھ ملایا۔ اب اگر سرکار ان بھائیوں سے
ملاقات کرنے پر لوگوں سے ناخوش ہوتی تو خود حضور والسرائے
بہادر ایسے مجمع سے ملاقات ہی کیوں فرماتے۔ جس میں یہ دونوں
بھائی شامل ہیں۔ اور وہ محضر ہی کیوں قبول فرماتے جو انھوں نے
تیار کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ سرکار خوب اچھی طرح سے واقف ہے کہ

مسلمان اِن دونوں بھائیوں کو اپنا مذہبی مقتدا اور ہند و مسلمان اپنا سیاسی رہنما مانتے اور جانتے ہیں اور لہٰذا اُن کی رہائی پر خوشی کرنے اور ان کا استقبال جوش و خروش سے کرنے میں تہنید و مسلمان بالکل حق بجانب ہیں -

۵

روشن خیال: آیئے جناب - یہہ آپ ہانپتے کانپتے آ کہاں سے رہے ہیں ؟

تاریک خیال: شوکت محمد آئے ہیں اُن سے ملنے گیا تھا - آپ ملے ؟

روشن خیال: نہیں - میں مجبوریوں کی وجہ سے نہ جاسکا اور یہہ تو جانتے ہی ہو کہ میرے اُن کے پولیٹیکل عقائد میں کس قدر اختلاف ہے -

تاریک خیال: کیا عقائد بھی پولیٹیکل ہونے لگے ؟ جل جلالہٗ - اس ترقی کے زمانے میں جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے - شوکت محمدؐ کے عقائد تو بحمداللہ اسلامی ہیں تمہارے عقائد اگر ارتقائی مدارج طے کر کے پولیٹیکل ہوگئے تو مبارک ہو -

روشن خیال: بھئی - تم پر تو مُلّائیت ایسی چھا گئی ہے کہ تمہاری منطق بھی اندھی ہوگئی میرا مطلب یہ تھا کہ میرے اُن کے سیاسی نقطۂ نظر میں فرق ہے

تاریک خیال: نقطۂ خیال میں بھی فرق ہے اور اس کا علم مجھے کیا ہند وستان کے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں تک کو ہے - مگر مجھے یہ معلوم نہیں کہ دونوں نقطوں میں کتنے فٹ یا کتنے گز کا بُعد و فصل ہے -

روشن خیال: آپ مجھے بنا رہے ہیں ؟

تاریک خیال مجھے حسنِ تعزیہ ہے اس قدر کم حصّہ ملا ہے کہ احباب کو میرے مزخرفات پر اکثر یہی دھوکہ ہوتا ہے۔ آپ ایسا خیال نہ فرمائیں۔

روشن خیال خیر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل سیاسی اُمور میں جو روش مسلمانوں کے اُس خاص طبقے نے اختیار کر رکھی ہے جس میں شوکت علی محمد علی ہردل عزیز ہیں وہ سر سید علیہ الرحمتہ کے نقش قدم پر ہے ؟۔

تاریک خیال بیشک نہیں ہے۔

روشن خیال میں پوچھتا ہوں کیوں نہیں ہے ؟

تاریک خیال تبدیلیٔ زمانہ۔ اختلافِ حالات اور تقاضائے وقت کے لحاظ سے

روشن خیال بس یہیں یہی اختلاف ہے ہمارے اُن کے نقطۂ نظر میں۔ جس کے فرق کو آپ گزدوں سے ناپنے بیٹھے تھے۔ یہہ تبدیلی کیوں کی گئی اور یہہ تقاضائے وقت کی رَٹ کیوں لگائی گئی ؟

تاریک خیال خدا را انصاف ! حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابۂ کرام اور ائمۂ عظام رضی اللہ عنہم کے تعامل کو تو آپ حسبِ مقتضائے وقت تاویل طلب ماننے میں باک نہ کریں۔ مذہبی اوامر و نواہی میں ایسی ترمیم کر دیں کہ پرانی بنی ہوئی فہرست اور آپ کی نئی بنائی ہوئی فہرست میں ایک عنوان بھی مشترک نہ رہے۔ نصِ قطعی میں سے جتنے حصّے کو آپ چاہیں مختص الوقت اور

مختص المقام کہہ کر منسوخ العمل قرار دیدیں۔ چاہے آپ پر اَفتؤمنون
ببعض الکتابِ وتکفرون ببعضٍ والی وعید ہی کیوں نہ عاید ہوتی
ہو۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں مگر سرسید کی سیاسی تعلیم کو آپ جف القلم
بما ھو کائن مانیں اور اس میں ایک نقطے کی کمی بیشی کو
گناہِ عظیم اور موجب عذاب الیم جانیں۔

جناب اب یہ بحث اس قدر فرسودہ ہو چکی ہے کہ بجائے اس کے
کہ آپ خاکسار کو تاریک خیال سمجھیں مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کا ہی
شمار اہلِ ظلمت میں سے نہ ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا سرسید نے
مسلمانوں کو سیاسیات میں حصّہ لینے سے ہر حالت میں اور
ہر زمانے کے لیے قطعی ممانعت کر دی تھی۔ یا اُن کے نزدیک اُن
کے زمانے میں اس کا وقت نہ تھا؟ پہلی بات تو ہو نہیں سکتی۔
اب رہی شقِ آخر۔ سو اُن کے بعد اہل الرائے مسلمانوں نے
طے کر دیا کہ اب وقت آگیا کہ مسلمان دیگر اقوام کے دوش بدوش
سیاسیات میں پورا حصّہ لیں۔ میں تو کس شمار قطار میں ہوں
مگر اہلِ بصیرت تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی سیاسی ابجد خوانی بہت
دیر میں شروع ہوئی۔ اب تک تو انھیں فارغ التحصیل ہو جانا چاہیئے تھا۔
دنیا نے سیاست میں ایک منٹ کی دیر برسوں پیچھے
ڈال دیتی ہے۔

ماندم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

بھائی صاحب! آب ہوا اور چلنے لگی ہے اور اس کے جھونکے
اب ڈرائنگ روم اور کونسل ہال سے گزر کر مسجدوں۔ مدرسوں
خانقاہوں اور تکیوں تک میں پہنچ گئے اور اب اُن کی جنبش سے
ترکی ٹوپیوں کے پھندنے ہی نہیں ہلتے بلکہ عماموں کے شملے اور
عباؤں کے دامن اور گدڑیوں کے چیتھڑے تک لہرا لہرا کر جھنڈیوں
کا کام دینے لگے۔ اب یہ ہوا نہ تمہارے روکے تھم سکتی ہے نہ
خان بہادروں اور آنریبلوں کے روکے رک سکتی ہے۔ جی چاہے
تو چادریں تانئے اور پردے لگانے کی کوشش
کر کے دیکھ لو ع چراغِ رہگذر باد کا انجام روشن ہو
ہندو بھائی تو منزلوں آگے بڑھے ہوئے ہیں بس کہتا ہوں کہ کوئی
مسلمان نہیں جسے تعلیم، حالات گرد و پیش نے اور کچھ نہیں تو لوکنگ
کے رستے ہی اپنی جگہ سے کوسوں آگے نہ پہونچا دیا ہو۔ بیچارے
شوکت علی محمد علی یا اُن جیسے رہ نوردانِ بادیۂ
عشق تو کھلے بندوں اس پر چلنے کی وجہ سے

بدنام ہیں۔

ہیچ کس بے دامن تر نیست آں اد یگراں ‏ ‏ باز می پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

فقصو بصداق۔ اور تو اور خود جناب بھی اس نشۃ الاخریٰ
سے متاثر و متکیف بلکہ متمتع و متلذذ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کھانے
اور غرانے کی تو اور بات ہے لیکن کیا یہ آنریبلی مسلمانوں کی

سیاسی جد و جہد ہی کا ثمر پیش رہن نہیں ہے۔ جس سے جناب کے نمو و نمائش کے کام و دہان لذت اندوز ہو رہے ہیں ......

روشن خیال: ارے بھائی تم تو بھرے آئے تھے کہ ایک زمان میں کیا کچھ کہہ گئے ....

ابلق خیال: السلام علیکم

روشن خیال: وعلیکم السلام۔ آئیے آئیے آپ ہی کی کمی تھی۔

ابلق خیال: (تاریک خیال سے) کہو بھئی۔ شوکت علی محمد علی سے ملے؟ ہم نے بھی اسٹیشن پر دیکھا تو تھا مگر بات چیت نہ ہو سکی۔

تاریک خیال: ہاں میں تو مل آیا۔

روشن خیال: سنا ہے شوکت علی۔ پہلے سے بھی زیادہ موٹے تازے ہیں۔

تاریک خیال: جی ہاں "صید از ذوقِ گرفتاری بخود بالیدہ است"

ابلق خیال: کچھ قیدِ فرنگ کے مصائب بھی بیان کرتے تھے؟

تاریک خیال: وہ سماں دیکھنے کے قابل تھا جب شوکت سے ایک دوست نے پوچھا۔ "کہو بھئی کیسی گذری؟" اور اُنھوں نے جھوم کر سر کو ایک مستانہ اور پُر کیف جنبش دے کر نیم باز آنکھوں سے تکتے ہوئے کہا ع

"مستیِ آں ساغرِ سرشار ما دانیم و دل"

روشن خیال: اور محمد علی کا کیا حال ہے؟

تاریک خیال: اُن کا جوشِ قلزم آشامی ابھی العطش العطش ہی پکارتا ہے۔

آں قدر زخمے کہ دِل می خواست و پیکاں نہ بود

ابلق خیال:۔ مجھی میں اُن کا خیر طلب ہوں۔ ملاقات ہوئی تو کہوں گا بس اب

خاموش بیٹھو۔

تاریک خیال:۔ بُرا نہ مانو تو کہوں؟

ابلق خیال:۔ کہو۔ بُرا کیوں مانوں گا۔

تاریک خیال:۔ آپ اُن کے کہنے سے حصولِ خطاب کی کوشش سے دست بردار

ہو جائیں گے جو وہ آپ کے کہنے سے حصولِ ثواب کی کوشش

سے دست بردار ہو جائیں۔

مرا بہ ترکِ تو تعلیم می کنند اما اگر چہ خود نتوانست ترکِ دنیا کرد۔

ابلق خیال:۔ یار عجیب آدمی ہو! میں اُن کے بھلے کی کہہ رہا تھا یا بُرے کی؟

تاریک خیال:۔ میں نے بھی تو تمہارے بُرے کی نہیں کہی۔ تمہیں ایک چیز پسند ہے

اُنھیں دوسری چیز۔ اپنی اپنی طبیعت اور اپنی اپنی ہمّت!

ہر کس بہ قدرِ ہمّت خود خانہ ساختند بلبل بہ باغ چغد بہ ویرانہ ساختند

ابلق خیال:۔ تو ہم چغد ہوئے؟

تاریک خیال:۔ نہیں یہ لفظ شوکت کے بہت زباں زد ہے۔ اور وہ لوگ ویرانہ پسند

بھی ہیں۔ بہر حال جو چاہو سمجھ لو۔

روشن خیال بھائی میں اتنی دیر سے یہی بک رہا تھا کہ بہتر ہو اب دونوں بھائی اپنی

قابلیتوں کو مُفید کاموں میں صرف کریں۔

ابلق خیال:۔ نہیں۔ غیر مفید کام تو اب تک بھی نہیں کیے۔ محمد علی نے اخباروں

کے ذریعے مسلمانوں کی بہت کچھ خدمت کی۔ مگر جیل آکر اُن کا قلم

گسستہ مہار ضرور ہوگیا تھا۔

تاریک خیال مگر گسستہ مہاری سے آپ کی مراد اعلانِ حق اور اعلائے صدق ہو تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اُنھوں نے دلّی آنے سے بہت پہلے بجائے قلم کی زبان پر قط رکھنے کے اُس کی ناک پر قط رکھ دیا تھا تاکہ مہار ڈالنے کی جگہ ہی نہ رہے۔ بندہ پرور! جس حالت کو آپ گسستہ مہاری کہتے ہیں۔ اسی مقام کو حضرات آشفتہ سرانِ لغتہ جگر زادہا اللہ جنونہم اپنی اصطلاح میں دعوت سنگباری سے موسوم فرماتے ہیں۔ اسی نشر دعوت ہی کا اہتمام تو تھا جو محمد علی قلب ہذا پر چڑھ چڑھ کر پکارتے تھے :۔

طفلان شہر بے خبر اند از جنون ما　　　یا ایں جنوں ہنوز سزاوار سنگ نیست

ابلق خیال: مگر اس میں شک نہیں کہ دونوں بھائیوں کے استقبال۔ ملک کے عرض وطول میں اس زور و شور اور جوش و خروش سے ہوئے اور ہو رہے ہیں کہ مشکل سے کسی اور کو نصیب ہوئے ہونگے امرتسر۔ رام پور۔ مراد آباد۔ دہلی۔ میرٹھ۔ آگرہ۔ کانپور۔ علیگڈھ لکھنؤ۔ ہر جگہ ہند و مسلمان آنکھیں بچھا رہے ہیں!

تاریک خیال: اب تو آپ کے مُنھ میں بھی پانی بھر آیا۔ جناب والا! یہی چٹخارے تو ہیں جو نظر بندی اور جیل کی تلخیوں کو مغلوب کردیتے ہیں!

عاشقی بدنامیئے دارد ولے کارے خوش است

جناب مُلّا سے آق ستقال۔ یہ ۱م۔

شہباز و شاہین

ہو اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند　　قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے　　مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر　　کم ہیں وہ طائر جو ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن از بندِ قید و صید نیست

ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند　　اقبال

"علی برادرز"

گذشتہ پانچ سال کی مدّتِ قلیل کو، ماہرینِ علمِ سفر و سولتش، غیر معمولی واقعات کے ظہور پذیر ہونے کی امید میں، نت نئی کونچلیاں اُتارنے والا موسم بہار بتاتے اور سمجھتے رہے! واقعاتِ عالم کی داستانِ پر لطف کی کئی نئی جلدیں وجود میں آگئیں اور اب مورخینِ خشک دماغ بھی پیشین گوئی کے غلط کہنے کی جرأت نہیں کرسکتے! رُوس بالشویک اکھاڑہ بن گیا، سرمایہ داروں کی نوبت آگئی، بلجیم کا وجود عنقا کے ساتھ لافِ ہمسری مارنے لگا، اِٹلی، ملک گیری کی گرمی میں عمان ہی تھان پر تھہتا رہا، برادرانِ کابل برطانیہ عظمیٰ سے خم ٹھونک بیٹھے، اور جرمانیہ نے تمام جرائم پیشہ اقوام کو (جن میں باستثنائے عاملانِ وحامیانِ" ڈارونزم" کُل ذرّیاتِ ابوالبشر اور ڈارون صاحب والی ہیمونہ صفات وآدم نما حشرات الارض شامل ہے) طاقِ پر اٹھا دیا! انقلابات اقوام کو علیحدہ کر دینے پر بھی انفرادی تبدیلِ ہیات کا مصالحہ مہینوں، ہندوستانی اخبارات کو سیاہی کی جگالی کرنے کا موقعہ بہم پہنچاتا رہا! انور پاشا ہی نہیں۔ تاتاریوں کے قبلۂ حاجات بن گئے، شریفِ مکہ نے اپنی عبا سے خدمتِ کعبہ کو سلطانِ حجاز کی سنہری جھول سے بدل لیا، پریسیڈنٹ ولسن کس نشنود یا من گفتگوئے میکنم" کے بے نظیر اصول پر تمام سلاطین و اقوام عالم کے بوجھ بجھکڑ ہوگئے، مسٹر مختار احمد انصاری تمام امراضِ سیاسی کے حلِ جرّاحی میں چیچک کے ٹیکے سے زیادہ مشہور ہوگئے، حاذق الملک صاحب عضوِ ضعیف پر گرنے والے

سیاسی نزلہ کے علاج بالضد میں یگانۂ ہند قرار پائے، اور مسیرز محمد علی وشوکت علی اپنے خاص جنس کو بھائی اور علیگڈھ کے بذلہ سنج کھلنڈروں سے "علی برادرز" کی ڈیڑھ مٹ لمبی شکل بنا بیٹھے! راقم کا خیال ہے کہ راوی نے "علی برادرز" کے چہروں کی لمبائی بیان کرنے میں غالباً روئے زیبا پر قائم ہونے والے خودرو جنگلات کی بھی پیمائش شامل کرلی ہے!

ممکن ہے، پہلی نظر "میسرز محمد علی وشوکت علی" اور "علی برادرز" میں کوئی بین فرق معلوم نہ کرسکے؛ لیکن تمام محققینِ علم الابدان ان دونوں حالتوں میں ایک "بیل والے" اور "ماقبلِ بیل" کا فرق پاتے ہیں! ان دونوں بھائیوں کی سوانح حیات کا مواد اس قدر کافی اور نظر فریب ہے کہ خالص ہندی نژاد اخباروں سے لیکر دوغلے رسائل واخبار تک ہر ایک فکرِ ہرکس بقدرِ ہمتِ اوست" کا اظہار اپنے کالموں میں اسی مواد سے کرتے رہتے ہیں! لیکن گرم دماغ والے احباب کہتے ہیں اور بڑے افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ "ہائے کیسے جیتے جاگتے، دوڑتے بھاگتے، کھلنڈروں کے سرتاج برادران کی کایا پلٹ کردی گئی" ! کایا پلٹ ہو جانے کا الزام بعض دقیقہ رس پادش بخیر مرحوم کا مربیؔ" کے سر تھوپتے ہیں اور بعض ماہرینِ علم نباتات محکمۂ جنگلات کا وجود اس کی اصلی جڑ بتاتے ہیں! یہہ مسئلہ نہایت متنازعہ ہے اور سوائے "علی برادرز" کے اور کوئی اس پر روشنی نہیں ڈال سکتا! جو کچھ بھی ہو۔ اس قدر مسلمہ ہے کہ ان بھائیوں نے "نظربندی وجلاوطنی" کو زمانۂ حال میں۔ اسی قدر معزز وممتاز بنا دیا جس قدر مسز ماڈ ایلن نے نظارۂ عریانیٔ مطلق کو فنون لطیفہ کی جان ثابت کردکھایا!۔

کہا جاتا ہو کہ "علی برادرز" جمعہ ہی کے روز دہلی سے نظر بند کر کے روانہ کیئے گئے تھے اور اب جمعہ ہی کے روز آزادانہ دہلی میں داخل ہوئے۔ یہ گویا زمین کے گول ہونے کا ایک اور بیّن ثبوت ملا، کیونکہ "علی برادرز" اپنے راستے پر بلا دائیں بائیں مڑے ہوئے۔ غالباً قصداً۔ برابر رات دن سرگرم راہ نوردی رہے اور بالآخر جہاں سے چلے تھے اسی جگہ پھر موجود ہیں! جمعہ کی نماز کے بعد سے نظر بندی کا آغاز، اور جمعہ کی نماز ہی پر داخلۂ دہلی کا انحصار، ایسے واقعات عجیب ہیں جو جامع مسجد دہلی کے ممبر پر چڑھ کر دیکھے جانے سے بڑا ہولناک مستقبل سوچنے والے کے تخیل میں پیش کرتے ہیں! امید قوی ہے کہ آئندہ جمعتہ الوداع میں امام صاحب جامع مسجد اس کے متعلق بڑے دلچسپ واقعات بیان فرمائنگے!

"علی برادرز" کا داخلۂ دہلی دیکھ لینے کے بعد تمام راویانِ ثقہ و غیر ثقہ متفقہ طور پر اس نتیجے تک پہونچے ہیں کہ یہ دونوں گردش کرنے والے بڑا علمی نہایت زہریلے اور متعدی الاثر اجسام ہیں جن کی سمیت کی کیفیت و کمیت نسخہ "قانونِ مطابع" اور عملِ "قانونِ تحفظ ہند" بھی مطلق کم نہ کر سکے! ماننا پڑتا ہے کہ ان کا محض سونگھا ہوا نہ جنرل ڈائر کے عملِ جراحی سے جانبر ہو سکتا ہے اور نہ سر مائیکل اوڈائر کے طریقۂ تبدیلِ آب و ہوا سے!! ان بھائیوں کے رامپور بدر ہونے کی تاریخ اور ان کے "علی برادرز" بننے کی تاریخ بعض وقائع نگارانِ ہند کو ایک ہی نظر آتی ہے!

زمانۂ ماضی کے سیدھے سادے قاضی ہمیشہ شہر کے اندیشے سے دبلے ہی ہوتے رہتے۔ مگر زمانۂ حال کے سیاسی قاضی باوجود خطرۂ جان و "اندیشۂ شہر" بفضلہ خاموشی کے ساتھ خونِ صالح اور جسم قوی بناتے رہتے ہیں! دروغ برگردن

راوی ہے سنتا جاتا ہے کہ محمد علی صاحب نے وزن کی صورت میں۔ باوجود ذیابطیس
۷ اسیری کی ترقی کی ہے اور اسی قلیل مدت تنہائی میں کی ہے! اس سے قطعی طور پر
ثابت ہوتا ہے کہ ہماری سرکار عالیہ قیدیوں اور نظربندوں کو نہایت مرغن غذا
بہم پہونچاتی ہے اور غالباً جرائم کا وجود ہندوستان میں ابھی تک اسی وجہ سے
باقی ہے!

کہتے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب اور حاذق الملک صاحب۔ دونوں نے تصفیہ
کرلیا ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ء سے مریضانِ ضعفِ معدہ و قلب اور مدقوق اشخاص بجائے
الموڑہ کے چندواڑہ تبدیل آب و ہوا کی غرض سے بھیجے جایا کریں گے۔ معلمان ندوہ
و دیوبند بھی عنقریب وائسرائے بہادر کی خدمت اقدس میں وفد روانہ کرنے والے ہیں
کہ قرآن حفظ کرنے کے لیے اُن کے ہر ایک طالبعلم کو حسب ضرورت نظربند رہنے کا
موقعہ دیا جایا کرے! اس میں اب بہت کم شبہ ہے کہ جلاوطنی کی مرزاان بھائیوں کے شعار رنیطیر نے
ایسی قابلِ رشک چیز بنادی ہے کہ معلم الملکوت نہ سہی تو حضرت آدم کو اپنی جلاوطنی پر افتخار رہوگا
" جلاوطنی" ان دونوں بھائیوں کے حق میں " جلائے وزنی" ثابت ہوئی ہے
معلوم ہوتا ہے کارپردازان با اقتدار کو ایسے اعراب کا خیال نہیں رہا۔ ورنہ کبھی بھول کر
بھی ایک " بیل والے" کو " جوہر" بننے کا موقعہ نہ دیا جاتا! " بیل والے" کا وجود اس قدر
شمیت انگیز اور مہلک نہ تھا جس قدر " جوہر" کا ہوسکتا ہے!

تحقیق طور پر معلوم ہوا ہے کہ دہلی کی خلقت میں سے گروہ لم فروشان اور جماعت
جوہریان نے استقبال کے موقعہ پر ضرورت سے بہت زیادہ گرمجوشی کا اظہار کیا ۔
جس کی منطقی وجہ یقینی یہی ہو سکتی ہے کہ محمد علی صاحب غدر سے پیشتر " بیل والے"
رہ چکے ہیں اور اب " جوہر" ہیں!

بیان کیا جاتا ہے کہ "علی برادرز" کا لقب محض "علی برادرز" ہی نہیں ہے بلکہ "علی برادرز اینڈ کمپنی" ہے!
جس طرح فراشخانہ کے پھاٹک کے متصل "انصاری برادرز" ترکی ٹوپیوں کے کاروبار کی دوکان رکھتے ہیں
اسی طرح کسی بڑی مسجد کے زیر سایہ "علی برادرز اینڈ کو" اپنا کارخانہ "احرار سازی" جاری کر چکے ہیں! اس
کارخانے کی جنس نوجوان پر "ہلالِ احمر" کا ٹریڈ مارک اکثر موقعوں پر دیکھنے میں آیا ہے! ابھی تک
اس قدر پردۂ راز میں ہے کہ یہ جماعت غیر محدود ہے یا محدود! جہاں تک شہادت ہم پہنچ سکی ہے
"علی برادرز اینڈ کمپنی" کے ساتھ "لمیٹڈ" کا لفظ نظر سے نہیں گذرا ہے! اس کمپنی کے شرکا دہلی میں
اس قدر نہیں ہیں جس قدر دیگر شہروں میں ہیں مثلاً بدایوں جیسے گوشۂ عافیت میں بھی ایک نہایت
پیمانے شریک جماعت حتی الامکان "او کھلی کے اندر اور چوٹ سے باہر" والی زندگی بسر کر رہے
ہیں! غالباً راقم کے اس فقرے کو وہ محض شرارت کے سوائے اور کچھ نہ سمجھینگے! علی برادرز
کی آزادی سے خدا کا شکر ہے۔ سی۔ آئی۔ ڈی پلز کو دہلی کے حدود اربعہ میں واقعات بٹنے
اور خبریں بننے کا موقعہ پورے عرصے کے بعد ہاتھ آیا ہے! اس پلز کو کچھ عرصے سے مصالحہ
کی کمی کی شکایت پیدا ہو چلی تھی!

خوف کیا جاتا ہے کہ مستقبلِ قریب میں۔ سقط کی کھجور، کابل کے سردہ، روس کے
بالشوک، پنجاب کے ڈائر، اور بدایوں کے پیڑے کی طرح۔ دہلی کا کارخانۂ احرار سازی
"علی برادران و شرکا" مشہورِ عالم نہ ہو جائے!!

سلطان حیدر۔ جوش

تذکرہ

نقیب کی یکسالہ زندگی کی یہ بارھویں منزل ہے۔ رسم قدیم کے مطابق ہم اگر چاہتے تو گزشتہ بارہ مہینے کے متعلق نقیب کی بڑی بھلی خدمات کا تذکرہ کرنے اور سال آیندہ کا پروگرام پیش کرتے مگر خدا کا شکر ہے کہ مادر ہند کے دو قابل فرزندوں اور مہذب مسلمانوں کے دو محترم بھائیوں کی رہائی نے ہمیں نقیب کے متعلق کچھ لکھنے سے آزاد کر دیا۔ شوکت علی محمد علی کی رہائی کی تقریب مسرت میں نقیب نے یہ اہتمام کیا کہ اس کے آخری نمبر کے تمام تر صفحات انھیں دو بھائیوں کے لیے وقف ہوں۔ اس بات کا اعتراف ہے کہ جس قدر دلچسپ اس نمبر کو بنانا چاہیے تھا اس قدر دلچسپ نہ بن سکا۔ عذر کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ گزارش شاید کسی قدر قابل پذیرائی ہو کہ خاکسار ایڈیٹر ۲۸ جنوری تک تقریباً۔ ان حضرات کے ہمراہ رہا۔ باوجودیکہ اس نمبر کو شوکت علی محمد علی کے لیے وقف کرنا پیش نظر تھا پھر بھی اس عرصے میں نقیب کے لیے کچھ سامان نہ کر سکا۔ ۲۸ جنوری کے بعد سے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

تصویریں جس عجلت میں طیار ہوئی ہیں اس کا حال کارکنان نقیب جانتے ہیں یا کارکنان ٹائمز آف انڈیا۔ موقع اس کا مقتضی تھا کہ اس سلسلے میں عالیجناب حاذق الملک بہادر اور عالی جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کی تصویریں بھی شائع ہوتیں مگر جس کمپنی کو کلکتے میں یہ تصویریں بلاک بنانے کے لیے دی گئی تھیں اس پر خدا کی رحمت۔ اس کی سست رفتاری نے آخری منٹ تک مونتظر رکھا۔

روزنامۂ علی برادران

۱۹ ستمبر صبح کے وقت ایک روش پر جس کے چوبیس چکر ایک میل کی برابر ہوتے تھے چار پانچ میل کی مسافت طے کرنا جیلخانے میں جناب شوکت علی صاحب کا معمول تھا ورزش صبحگاہی ہو رہی تھی تقریباً تین میل کا چکر ہو گیا تھا کہ بتول سے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر صاحب بہادر نے انگریزی میں رہائی کی خوشخبری سنائی۔ قید خانے سے غالباً اس خبر کو شہر میں ہوا اڑا لے گئی۔ دروازے پر اژدہام جمع ہو گیا اور اصرار ہوا کہ "علی برادران" کو فوراً باہر آنا چاہیئے۔ جیلر صاحب موجود نہ تھے اور برادران موصوف اسباب باندھنے میں مصروف تھے۔ اصرار سے تنگ آکر دس بجے کے قریب باہر نکلے اور جلوہ دکھا کر پھر اندر چلے گئے۔ شہر میں ایک صاحب کی شادی تھی پوری برات کی برات پیشوائی کے لیئے آگئی۔ ایک بجے کے قریب جیلخانہ کو خیرباد کہا اور پھولوں کی بارش میں مسجد تک پہنچے یہاں فریضۂ ظہر ادا کیا بعد نماز عقد نکاح میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر صاحب کے مکان پر پہنچے پھر مرحوم جیلر کی قبر پر ہوتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔ ریل پہلے ہر اسٹیشن پر خود بخود رہائی کی خبر پہنچ رہی تھی۔ اٹارسی کے اسٹیشن پر خوشامدید کہنے کے لیے مجمع کثیر موجود تھا جھانسی کے اسٹیشن پر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ استقبال ہوا۔ چونکہ یہاں سے بمبئی میل سے سفر کرنا تھا اس لیئے تقریباً ایک گھنٹہ قیام کیا

۲۰ ستمبر آگرہ اور متھرا کے جن احباب کو خبر ہو گئی تھی وہ سب یدسے اسٹیشن پہنچے اور تحفۂ عقیدت پیش کر کے اقوا کی تصحیح کر گئے

دہلی پہنچنے کی بذریعہ تار اطلاع دیدی گئی تھی۔ استقبال [illegible] جوش و خروش سے ہو

اُس کا اندازہ محض اِس سے ہو سکتا ہے کہ پلیٹ فارم پر پھولوں کی پتیاں پرتہ جمی ہوئی تھی اور ڈاک گاڑی کو چار و ناچار دو گھنٹے اپنے مقررہ وقت سے زیادہ ٹھہرنا پڑا

۱۹ دسمبر ۱۹۱۹ء پنجشنبہ

جالندھر کے اسٹیشن پر بھی احباب مشتاقِ زیارت تھے۔ امرتسر میں جس شان سے جلوس نکلا وہ اپنی آپ مثال ہے۔ اسٹیشن سے کانگریس پنڈال میں پہنچے اتفاق سے اُس وقت جنرل ڈائر پر اظہارِ نفرت کا رزولیوشن پیش تھا۔ حاضرین کے اصرار سے برادرانِ موصوف پریسیڈنٹ کی میز پر کھڑے کئے گئے اس کے بعد مسلم لیگ کے پنڈال میں تشریف لے گئے اور نعرہائے اللہ اکبر نے قیامت برپا کر دینے والے شور کے ساتھ استقبال کیا۔

۲۱ دسمبر ۱۹۱۹ء

شنبہ خلافت کانفرنس میں شوکت علی صاحب نے صدارت کی۔ اس جلسے میں "مالکِ حقیقی احکامِ قرآنی ہندو و ہندوؤں کی زبان سے پہنچا رہا تھا"

۱ جنوری ۱۹۲۰ء پنجشنبہ

اہالیانِ لاہور امرتسر سے آنے والی ہر ٹرین پر منتظرِ ورود تھے مگر مسٹر گھاٹے سے یہ معلوم کر کے کہ اُن کا قصد یہاں آنے کا نہیں ہے فوراً پانچ موٹر امرتسر بھیجی گئیں اور دعوت قبول کرنے کے لیے اصرار کیا۔ جناب مولانا عبدالباری صاحب ساتھ تھے۔ شالا مار باغ میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ جلوس قابلِ دید تھا۔ قومیت قدم قدم پر قربان ہو رہی تھی۔ انار کلی کا راستہ چھ گھنٹے میں طے کیا۔ اسی شب کو دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔

۲ جنوری ۱۹۲۰ء جمعہ

سہارنپور کے اسٹیشن پر جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کا تار ملا جا اہالیان دہلی کی طرف سے دیا گیا تھا کہ "دہلی ابھی اپنے حسبِ شان استقبال کے لیے تیار نہیں ہے۔ آٹھ یا نو تاریخ کو قدم رنجہ فرمائیے" یہ تار پا کر رامپور کا ارادہ کیا۔

بقیہ

۳ جنوری ۱۹۲۰ء شنبہ — غازی آباد پر خیر مقدم نہایت تپاک سے کیا گیا اور حاضرین با صرار تمام جلوس کے ساتھ شہر میں لے گئے جہاں انھوں نے مختصر تقریر بھی کی -

رامپور کے اسٹیشن پر نہایت شاندار استقبال کیا گیا اور جلوس نکالا گیا - اسٹیشن سے "سرکار" (ہز ہائی نس نواب صاحب) کی خدمت میں پہنچے

۴ و ۵ و ۶ و ۷ جنوری ۱۹۲۰ء یکشنبہ تا چہارشنبہ — رام پور میں قیام رہا - اس عرصے میں جناب شوکت علی صاحب اور جناب محمد علی صاحب کے یہاں بزم میلاد شریف منعقد کی گئی جس میں بیرونجات کے احباب مدعو کئے گئے تھے -

۸ جنوری ۱۹۲۰ء پنجشنبہ — سہ پہر کو - ہز ہائی نس سے رخصت ہو کر سرکاری موٹر میں مراد آباد پہنچے - شاندار جلوس نکالا گیا - ہندو بھائیوں نے پارٹی دی - مسجد میں وعظ ہوا - رات کی گاڑی سے دہلی کے لیے روانہ ہو گئے

۹ جنوری ۱۹۲۰ء — علی الصباح ہاپڑ کے اسٹیشن پر گولوں کی آواز اور باجے کے شور نے بیدار کیا چلئے حاضر تھی - اسٹیشن پر خاصہ مجمع تھا -

غازی آباد پر برادران والا قدر ریل سے اتر کر بذریعہ موٹر دہلی تشریف لے گئے ۱۱ بجے کے قریب چاندنی چوک میں گھنٹہ گھر کے پاس "آزادی کا جہاز" آغوش پھیلائے کھڑا تھا - سڑک پر دورویہ دکانوں - چھتوں اور بجلی کے ستونوں پر آدمی ہی آدمی نظر آتا تھا سب سے پہلے ڈاکٹر انصاری صاحب نے جناب حاذق الملک حافظ حکیم محمد اجمل خاں صاحب کی شرکت سے معذور تھے خط سنا کر خیر مقدم کیا - پھر جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے اہالیان شہر کی طرف سے ایڈریس پیش کیا - اور اشرفیوں کے ہار پہنائے گئے - برادران

ذی شان نے دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے ہوئے ایڈریس کا جواب دیا۔ جامع مسجد سے بعد نماز جمعہ جلوس نکلا۔ دہلی دلہن بنی ہوئی تھی۔ جلوس چاوڑی۔ قاضی کا حوض۔ لال کنواں اور فتحپوری ہوتا ہوا مٹیا محل تک آیا۔ شام ہوگئی تھی۔ لہذا اسٹیشن چھوڑ کر بذریعہ موٹر جناب ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر تشریف لائے اور بعد عشاء تمام شہر میں روشنی کی سیر کی۔

سنہ ۱۹۲۰ء

۱۰ جنوری شنبہ — حمام تشریف لے گئے۔ خوشنویسوں کا ایڈریس لیا۔ حضرت محبوب الٰہی صاحب کے مزار مبارک پر فاتحہ کے لیے گئے۔ شام کو حاجی عبدالغفار صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ اس کے بعد لاہور روانہ ہوئے۔

سنہ ۱۹۲۰ء

۱۱ جنوری یکشنبہ — لاہور پھر آغوش پھیلائے منتظر تھا۔ خلافت ڈیپوٹیشن کانفرنس کا افتتاح کیا۔

۱۲ جنوری دوشنبہ — لاہور میں حضور والسرائے بہادر کا تار پہنچا کہ "خلافت ڈیپوٹیشن کے ایڈریس کی نقل پہلے سے آنی چاہیئے۔ اغلب یہ ہے کہ ۱۹ تاریخ کو حضور وائسرائے بہادر وفد کو شرف باریابی بخشینگے۔" اس لیئے فوراً دہلی کو معاودت کی۔

سنہ ۱۹۲۰ء

۱۳ جنوری سہ شنبہ — دہلی آکر ایڈریس لکھا۔

۱۴ جنوری چہارشنبہ — ایڈریس کا مسودہ جب طیار ہوگیا تو بذریعہ موٹر میرٹھ تشریف لے گئے جہاں عظیم الشان جلوس نکالا گیا۔

۱۵ جنوری پنجشنبہ — میرٹھ سے بذریعہ موٹر دہلی واپس آئے۔

۱۶ جنوری جمعہ — دہلی میں قیام اور ڈیپوٹیشن کے متعلق تجاویز و مشورہ۔ شام کو جناب مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی تقریر ہوئی۔ بعد مغرب معلوم ہوا کہ ڈیپوٹیشن ۱۹ تاریخ کو پیش ہوگا۔

۱۷ جنوری شنبہ — جناب حاذق الملک بہادر کے یہاں سہ پہر کو اور عالی جناب ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر شام کو ایڈریس کے متعلق بحث و مباحثہ ہوا۔

۱۸ جنوری (شنبہ) — دن دوپہر کو حاجی میاں جان صاحب کے یہاں علی برادران کی دعوت ہوئی۔ شام کو "یادگار شہیداں" کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

۱۹ جنوری (یکشنبہ) — ڈیپوٹیشن والسرائے بہادر کے حضور میں پیش ہوا۔

۲۰ جنوری (دوشنبہ) — حسب الطلب ہز ہائینس جناب نواب صاحب بہادر رامپور تشریف لے گئے اور رات کی گاڑی سے کانپور کو روانہ ہوگئے۔

۲۱ جنوری (چہارشنبہ) — راہ میں لکھنؤ اسٹیشن پر خیر مقدم کیا گیا۔ برادران موصوف فرنگی محل تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپس آکر کانپور پہنچے جہاں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ جلوس نکالا گیا۔ رات کو براہ لکھنؤ رامپور واپس گئے۔

۲۲ جنوری (پنجشنبہ) — شب کو حسب الطلب فخرِ قوم مہاتما گاندھی۔ لاہور تشریف لے گئے۔

۲۳ جنوری (جمعہ) — لاہور سے میرٹھ تشریف لائے۔

۲۴ جنوری (شنبہ) — میرٹھ سے بذریعہ موٹر ہاپڑ پہنچے۔ ایک گھنٹے کے بعد موٹر میں خورجہ تشریف لے گئے خورجہ سے ٹرین میں علیگڈھ پہنچے۔ جلوس نہایت شاندار نکالا گیا۔

۲۵ جنوری (یکشنبہ) — علیگڈھ میں جلسۂ ٹرسٹیان میں شرکت کی۔ کرکٹ کلب کی دعوت میں شریک ہوئے۔ جامع مسجد میں جہاں تقریباً بیس ہزار کا مجمع تھا اور پھر مندر میں تقریریں کیں۔

۲۶ جنوری (دوشنبہ) — موٹر میں۔ ایک گھنٹے کے لئے خورجہ جاکر پھر علیگڈھ واپس آئے۔ مسلم یونیورسٹی کی میٹنگ میں شرکت کی پھر "امّ الاحرار" کے ساتھ زنانہ خلافت ڈیپوٹیشن کے جلسے میں رونق افروز ہوئے۔ شام کو جناب عامر مصطفےٰ خاں صاحب کے یہاں دعوت تھی جس میں جناب موصوف کے سب ملازمین اور کارندوں نے خلافت ڈیپوٹیشن کے لیے چندہ جمع کرکے پیش کیا۔

۲۷ جنوری (سہ شنبہ) — صبح چار بجے ڈاک گاڑی سے لکھنؤ کے لیے علیگڈھ کو خیرباد کہا۔ اٹاوہ اور کانپور کے اسٹیشن پر احباب نے گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔

لکھنؤ میں استقبال جس طرح ہوا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ جلوس جوش و خروش کے ساتھ براہِ امین آباد جناب مولانا عبد الباری صاحب کے دولت کدہ تک گیا۔ جہاں برادران ذی شان فروکش ہوئے

گذارش

نقیب کو آج سال بھر ہوتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُس نے اپنے مقاصد میں کس قدر کامیابی کے ساتھ ترقی کی ہے اور تفنن کا اصلی مفہوم کس خوبی کے ساتھ سمجھا ہے رہنمایانِ قوم اور مشہور و معروف ادیبوں سے داد حاصل کی جا چکی ہے اور فہرست خریداران اُن کے نام نامی سے مزین ہے۔ ملک کے تقریباً تمام رسائل و اخبارات اپنی اپنی تنقیدوں میں اظہار پسندیدگی کر چکے ہیں۔ اشتہار کے طور پر ان اسناد جلیل القدر کو پیش کرنے کے بجائے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ وہی چیز پیش کی جائے جس کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے چنانچہ گذارش یہ ہے کہ آپ کوئی سا ایک نمبر یا ایک مکمل جلد منگا کر ملاحظہ فرمائیں اور رائے قائم کریں کہ نقیب ادب اردو میں اپنے رنگ کا بہترین رسالہ ہے اور اس کی تعلیم زندہ دلی پیدا کرنے کے ساتھ ملک و قوم کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے یا نہیں!

نقیب کے پرچے اور جلدیں جو دفتر میں موجود ہیں اُن کی فہرست آپ کے انتخاب کے لیے پیش کی جاتی ہے

نقیب جلد دوم مجلد از اگست ۱۹۱۹ء تا جنوری ۱۹۲۰ء

- قسم اول کاغذ ولایتی اٹھارہ جلدیں موجود ہیں فی جلد ۳ مع محصولڈاک
- قسم دوم باستثنائے نومبر کے سب پرچے معمولی سفید کاغذ پر ہیں ۲۵ جلدیں فی جلد ...
- قسم مشترک چار پرچے قسم اول باقی قسم دوم ۶ جلدیں موجود ہیں فی جلد ۲ مع محصول

جلد دوم کے متفرق پرچے موجود ہیں قسم اول فی پرچہ ۵ قسم دوم فی پرچہ ۴

- اگست قسم دوم ۱۱ — نومبر قسم اول ۴۴
- اکتوبر قسم دوم ۴۴ — دسمبر قسم اول ۰۰ ا قسم دوم ۴۲

جلد اول کے حسب ذیل پرچے موجود ہیں قیمت بحساب ۴ فی پرچہ۔ مارچ۔ مئی۔ جون۔

جو پرچے مطلوب ہوں فوراً منگا لیجیے ورنہ خوف ہے کہ شاید نہ بچ سکے۔ جلد دوم کے مضامین کی فہرست دوسری طرف ملاحظہ ہو۔